

اشفاق احمد

سہ در سہ



زولی کوفن سے ایک ہڈھا سوس اور اُس کی جوان لڑکی گاڑی میں سوار ہوئے اور میرے سامنے کی سیٹ پر اگر بیٹھ گئے۔ ہڈھے نے پرائیگرم کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ لڑکی نے گرنے فلینل بیٹی کوٹ اور سیاہ رنگ کا سوٹر پہن رکھا تھا اور اُس کے ہونٹ بند تھے۔ وہ سیٹ پر بہت اگے ہو کر بیٹھی تھی اور اُس کے گھٹنے میرے گھٹنوں کے درمیان آگئے تھے۔ اگر میں اپنی رانیں بند کر لیتا، تو اُس کے گھٹنے اُن کے درمیان آجاتے اور اس کو اپنے باپ کے سامنے اور موٹی استانی کے زور و شرمندہ ہونا پڑتا۔ اس لڑکی کے کالے سوٹر کے نیچے اس کا سینہ بے تار ہوتا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا چیتے جیسا پیٹ یہ غمازی کر رہا تھا کہ شادی کے آٹھ دس ماہ بعد ہی اس کو طلاق بھی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اس پر گہرے غم کا اطمینان تھا اور وہ آنکھیں بند کیے اپنے بازو سینے پر باندھے بیٹھی تھی۔ ہڈھا سوس اُدگھڑا ہوا تھا اور اس کی موٹی ناک پر شربانوں اور ویدوں کے الیکٹرون اور پروٹون کا خاکہ بنا ہوا تھا۔ گاڑی تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی اور دائیں بائیں گھاس کے میدان سا آتھ بھاگے جا رہے تھے۔ دُور پہاڑوں پر سُرخ چھتوں والے کڑی کے جھونپڑے دکھائی دے رہے تھے اور جگمگے آسمان پر اندھیرا الینڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اندر کی روشنی حاصل کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور کرنٹ حاصل کرنے کے لیے لڑکی کے زانو سے اپنا گودا لگا دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کالے سوٹر کا دامن ذرا نیچے کھینچا اور اپنی کمر کو ذرا سا ہلکا کر ڈائیشین اُن کر دیا۔ اندھا ہر چکا چوندا ہو گئی اور رنگ برنگے

استہار جلتے بجھنے لگے۔

بابا سوس کوئی کتب فروش دکھائی دیتا تھا جبرن سے نئی کتابیں خرید کر اپنے شہر لے جاتا تھا اور جس نے کمیشن میں کافی فراہم بچا لیے تھے۔ اس کے چہرے پر کتب فروشوں کی سی سیکنڈ ہینڈ ذہانت تھی اور اس کے جسم سے لائبریری کی مخصوص خوشبو آتی تھی۔ اس کی لڑکی کی بینیاں بڑی سٹول اور اس کے کندھے کافی کٹا رہے تھے۔ اگر میں اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیتا تو بھی اس کے کندھے اسی طرح دکھائی دیتے رہتے اور اس کی ٹھوڑی میرے اُچھے ہوئے بالوں کے باوجود صاف نظر آتی۔ لڑکی کا زانو، نیل فون کے کھسے پر لگی جینی کی گھٹی ایسا تھا۔ سفید اور چمکا اور ملائم اور اُس کے اندر سے رُک رُک کر آواز آ رہی تھی:

"WHEN YOU HEAR THE TONE THE TIME WILL BE
SIXTEEN HOURS FORTY ONE MINUTES AND THIRTY
SECONDS."

میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا سا مسکراتی بیٹھ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اس کے زانو کاٹ اُٹ میرے گٹے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے فوراً جیب سے سیزن ٹکٹ نکالا اور گلابی رنگ کی پرچی پر لگا ہوں جا کر آنکھیں پر دن گننے لگا۔

مجھے فرانس سے چلے آٹھواں دن تھا اور میں نے یہ سارا وقت جینیوالیے یہودہ شہر میں ضائع کر دیا تھا۔ جب میں نے ٹکٹ واپس جیب میں ڈالا تو لڑکی میرے اس پیٹڈ وچن کو دیکھ کر ذرا اور شدت سے مسکرائی اور اپنی انگلی کا سات بنا کر رخسار پر کھلی کرنے لگی۔ اس کا قد کاٹھا اور حرکتیں لڑکوں جیسی تھیں، لیکن اس کا جسم گوبار کے باہر اُس کریم کھانے والی لڑکیوں جیسا تھا اس کی آنکھیں سیاہ، ماتھا فراخ اور ناک ستواں تھا اور کولے بہت چوڑے تھے۔ وہ جہزہ سسلی میں بسے ہوئے عربوں کی نسل سے معلوم ہوتی تھی جنہوں نے وقت گزرنے پر پتہ ہر لے لیا تھا اور گلے میں چاندی کے خلائوں کے بجائے سنہری صلیبیں لٹکائی تھیں۔ میں اس کی طنز پر مسکراہٹ کی تاب نہ لاسکا اور اپنی سیٹ سے اُٹھ کر باہر گیلری میں آ گیا۔ دو کھڑکیاں لکڑی بچھول جانے کی وجہ سے جام ہوئی تھیں اور گھلتی نہیں تھیں۔ میں تیسری کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور سرسبز گھاس کے میدان دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ گاڑی کو برکیں گنے لگیں اور تھوڑی دیر میں گاڑی ایک نہایت ہی

مشکل نام کے اسٹیشن پر رُک گئی۔ نہ کوئی پلیٹ فارم نہ اسٹیشن کی آن بان نہ پورٹرنز باؤ۔ ایک چھوٹا سا لکڑی کا کابین، ایک خوبصورت سا اسٹیشن ماسٹر، چند سواریاں اور گھاس کا میلوں دُور بھینلا ہوا میدان۔ میں نے بلاوجہ ایک سگریٹ نکالی اور سڈکا کر کش لگانے لگا۔ ایک سواری میرے قریب سے گزری اور ہمارا خانہ چھوڑ کر گیلری میں آگے چلی گئی، پھر ایک لڑکا اندھا یا اور ہمارے والے خانے میں چلا گیا۔ کھڑکی کے فریم پر ایک رنگ آؤڈ تیج باہر نکل آیا تھا، میں نے اپنے ناخن سے اس کو گھمایا، تو وہ گھومنے لگا۔ میں نے اس کو اس کی جگہ بجانا چاہا، تو وہ ٹاسٹ نہ ہوا۔ اس کا سوراخ کھو چلا ہو گیا تھا اور اب وہ رنگ کے ہمارے اس میں پھنسا ہوا تھا۔

گاڑی پھر چلنے لگی۔ میں نے تیج کو پکڑ کر زور سے کھینچا، تو وہ اپنے سوراخ سے باہر آ گیا۔ اس پر تھنی رنگ کا رنگ چڑھا تھا اور کسی کسی بل پر نارنجی رنگ کا تازہ رنگ بھی چھٹنے لگا تھا۔ میں نے سوئزر لینڈ کے سوڈیٹر کے طور پر وہ تیج اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اگر کسی خوبصورت لڑکی کا وجود آپ کے ذہن پر سوار نہ ہو تو سوئزر لینڈ واقعی بہت خوبصورت جگہ ہے۔ باہر کچھ کچھ شنگلی بڑھنے لگی تھی اور دُور دُور تک جیزس اب صاف بھی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ میں نے کھڑکی سے چہرہ گما کر پہلو اندک طرف بدل لیا۔ وہی لڑکی مجھ سے کوئی ایک فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی اور اسی طرح مسکراتی تھی۔

"پارلے دو فرانے" اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"دوی" میں نے فخر سے جواب دیا۔

"دائل پائی ایت دو؟" اُس نے پوچھا۔

"پاکستان" میں نے فخر سے جواب دیا۔

"پاکستان!" وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے ایک منجھے ہوئے گائیڈ کی طرح پاکستان کے بارے میں تمام کوائف بہم کر دیے اور اس کی طرح مسکرانے لگا، پھر میں نے اس کو سگریٹ پیش کیا جسے اس نے کمال محبت اور چاہت کے ساتھ دکر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ پہلے بہت سگریٹ پیا کرتی تھی، لیکن جب سے اس کی طلاق ہوئی ہے اس نے سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے۔

نہیں نے کہا: ”وہ کون احمق تھا جس نے تمہیں طلاق دے دی؟“
 ”تھا ایک“ اُس نے مشرقی لڑکیوں کی طرح سر جھکا کر کہا۔ ”تار کے ٹکے میں ملازم ہے،
 فٹ بال بہت اچھا کھیلتا ہے اور ماؤتھ آرگن بجاتا ہے۔“
 ”کوئی اور لڑکی؟“ میں نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“

”فٹ بال؟“

”شاید نہیں۔“

”ماؤتھ آرگن؟“

”پتہ نہیں۔ بس ایسے ہی ہم میں طلاق ہو گئی۔ اس بات کو تو اب چھ مہینے سے بھی زیادہ
 کا عرصہ گزر گیا ہے۔“
 ”تمہیں یاد آتا ہے؟“
 ”کبھی کبھی۔“

”اس کے ساتھ گزارے ہوئے کون سے لمحے سب سے زیادہ یاد آتے ہیں؟“

”جب میں اس کو ٹب میں بٹھا کر نکالیا کرتی تھی۔“

”اس طرح سے تو تمہارے سارے کپڑے بھیگ جاتے ہوں گے؟“

”لڑائیں اسے کپڑے پہن کر تھوڑی منہ لیا کرتی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا اور میں نے سر
 نیچے جھکا لیا۔“

”تمہارے ماں باپ ہیں؟ اُس نے پوچھا۔“

”دونوں ہیں۔“

”ان دونوں میں سے تم کس سے زیادہ پیار کرتے ہو؟“

”میں نے کہا: ”پیار تو مجھے اپنے باپ سے زیادہ ہے، لیکن ہمارے ملک میں ماں سے
 محبت کرنے والے کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے میں اپنی ماں سے محبت کرتا ہوں۔“
 ”وہ کیوں؟“ اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ ہماری ماؤں کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے۔“

”تم لوگ جنت میں جانے کے اتنے ہی شوقین ہو؟“ اُس نے پوچھا۔

”ہر کوئی ہے۔“ میں نے ایک شریف بچے کی طرح کہا۔ ”تم جنت نہیں جانا چاہتی ہو؟“

”نہیں۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور ذرا دھکی سی ہو گئی۔“

”یہ تمہارے والد ہیں؟“ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“

”کیا کرتے ہیں؟“

”لینز برگ میں فوک لوڈ میزیم کے نگران ہیں۔ ہم لینز برگ میں رہتے ہیں۔ دریا ئے اُکے کنارے
 تم نے یہ شہر دیکھا ہے؟“

”میں نے کہا: ”دیکھا تو نہیں، لیکن اس کے بارے میں پڑھا ضرور ہے۔“

”بھلا کیوں مشہور ہے یہ شہر؟“

”اس لیے کہ سوئزر لینڈ کا ایک شہر ہے اور سوئزر لینڈ دنیا کا سب سے خوبصورت
 ملک ہے۔“

”جھوٹے۔“ اس نے منہ کر کہا۔ ”پکڑی گئی ناچوری۔ لینز برگ میں بٹن فوڈ تیار ہوتا ہے۔“

”اچار، مڑتے، سوپ، گوشت... تمہارے ملک میں سوپ کے لفافے آتے ہیں؟“

”کیوں نہیں؟“ میں نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ ”ہم سب وہی سوپ پیتے ہیں۔“

”اتنے میں خانوں کی اور گلیری کی تھیں جل گئیں اور ہمارے ہیولے واضح ہو گئے۔ اس
 نے آہستہ سے کہا:“

”ادھر کونے میں آجاؤ دروازے کے پاس۔“

”جب ہم کونے میں دروازے کے پاس پہنچے، تو ٹائیلٹ کا دروازہ کھلا تھا اور اندر واش
 بیسن کے اوپر آئینہ جھکا رہا تھا۔“

”میں نے کہا: ”دیکھو آئینے میں تمہاری صورت کیسی خوبصورت نظر آ رہی ہے۔“

”میں ویسے خوبصورت نہیں ہوں۔“ اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

”دیے بھی ہو۔ ویسے کیوں نہیں ہو...“ میں نے شرمندگی کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ”ویسے تو تم بہت ہی خوبصورت ہو، لیکن میرا مطلب تھا... سست آویز... گویا تم...“ پھر میں رُک گیا اور اُس کی کمر پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر بولا۔ ”یہ پلاسٹک کا بگل ہے؟“

”ہاں!“ اُس نے ہولے سے کہا۔

”اور یہ الاسٹک ہے؟“

”ہاں الاسٹک ہی ہوتا ہے! تمہارے ٹمک میں الاسٹک نہیں ہوتا؟“

میں نے کہا: ”وہاں عورتیں اپنے ہاتھ سے سی کر پہنتی ہیں۔ الاسٹک کے بجائے ڈیرائی پہنتی ہیں!“

اسے ان دوریوں سے ذرا گھن سی آئی اور اس نے ناخوشی کے انداز میں سر کو دو مرتبہ جھٹکا۔ میں نے اس کے دونوں رخسار اپنے ہاتھوں میں دبا لیے۔ اُس نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے دانت صاف کیے تھے اور اُس کے مُنہ سے دُر بان کی خوشبو آ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے اس کی جلد بڑی ملائم اور خوشبو کے بغیر تھی۔ میں نے روم آنے سے پہلے داتا صاحب کے ایکسٹرن کو چُومنا تھا۔ وہ بھی ایسا ہی ملائم اور خوشبو کے بغیر تھا۔ اس نے میرے کوٹ کے بٹن کھول کر اپنے بازو اندر ڈال دیے اور رونے لگی۔ داتا دربار بڑی عمر کا ایک آدمی اسی طرح رو رہا تھا۔ نہ اس کی آواز اتنی تھی نہ اس کا بدن ہلتا تھا، پھر بھی وہ رو رہا تھا۔ میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا اور آہستہ سے کہا: ”دیکھو!“

اور جب کے پیچھے سے ممتاز مفتی کی کڑکدار آواز آئی: ”دیکھو شاہ جی دیکھو!“

میں نے کہا: ”ہاں جی دیکھ رہا ہوں“

”یہ کوئی ہے اور یہ کوئی کے پہاڑ ہیں“

میں خاموش رہا۔

عمر نے میرے کندھے پر بوٹی مار کر کہا: ”سراؤ بڑا بٹھا کر پہاڑوں کا نظارہ کر۔ کائنات کی وادی شروع ہو گئی ہے“

میں نے اسی طرح سر جھکانے کہا: ”اچھا—جی!“

مسمو نے کہا: ”یہ سال یہاں بھی اپنے لاہور کو ساتھ اٹھائے پھرتا ہے، اونے کیا سوچ رہا ہے؟“

میں نے کہا: ”لاہور نہیں یار، میں سوسائٹیز لینڈ کو یاد کر رہا ہوں“

”لعنت سوسائٹیز لینڈ پر“ عمر جل کر بولا۔ ”اُن پہاڑوں میں اور اُن سڑکوں پر ایسا خوف ملتا ہے؟ ایسی دہشت ملتی ہے؟“

”میں نے کہا خوف تو نہیں ملتا، لیکن خوفناک لڑکیاں ضرور مل جاتی ہیں“

”آپ کو ملی تھی شاہ جی؟“ عتا نے پوچھا۔

”مفتی زور سے ہنسا اور اپنے ہاتھ پر بے تالی تالی بجا کر کہنے لگا

کئے گئے، مدینے گئے، کر بلا گئے!

جیسے گئے تھے ویسے ہی چل پھر کے آ گئے

میں نے کہا: ”یار وہیں ایسا گیا گزرا بھی نہیں، اگر مجھے سوسائٹیز لینڈ میں گاڑی میں سفر کرنے کا چانس ملتا، تو ضرور کوئی نہ کوئی لڑکی مجھ کو ملتی“

”تو پھر آپ نے گاڑی کو پسند کیوں نہ فرمایا؟“ عظمیٰ نے پوچھا۔

”اس کی ایک وجہ تو یہ ہے عظمیٰ کہ میرے پاس کرایہ کم تھا اور مجھے بیچ ہانگنا کرنی پڑتی تھی اور دوسرے یہ کہ اس زمانے میں یورپ کی لڑکیاں اس قدر ایڈوانس نہیں تھیں“

اس پر پانچوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جب کا ڈرائیور شیر باز بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔

عمر نے کہا: ”دیکھو، یہ سڑک شوگر لائن کو جاتی ہے۔ بہت ہی خوبصورت علاقہ ہے۔ سرسبز گھاس کے تختے، چیر کے خوشبودار درخت اور کچی مٹی کا پہاڑ، پھول ہی پھول۔ پھول ہی پھول۔ پھول ہی پھول۔ واپسی پر تمہیں دکھائیں گے“

”واپسی پر تو انہیں جب نظر آئے گا جب یہ اپنے لاہور کا ساتھ چھوڑیں گے“ عتا نے کہا۔ ”شاہ جی لاہور کو چھوڑ دو۔ گنہار کا نظارہ کرو۔ دیکھو دیا کی تندی“

”ادھر اس سڑک پر صیب ہمارا ہی کام ہے جیپ چلانا۔ کوئی دوسرا ٹکس ایک منٹ کو نہیں چلا سکتا۔ بالکل ڈیوٹر ہے۔“

”نہیں نے کہا: ”شیر باز، تم آگے نظر رکھو، میری طرف مڑ کر بات نہ کرو۔“ کوئی بات نہیں صیب، ہم کو پرکھیں گے۔“

بالاکوٹ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شاہ اسماعیل شہید کا مزار جسے ہم شام کے وقت دیکھنے گئے تھے اور پتھروں پر چلتے چلتے میرے بوٹ کی ایڑی ٹوٹ گئی تھی۔ مٹی کوٹ کا نالہ کافی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جا بجا چھوٹے بڑے پتھر پڑے تھے اور قد آدم چٹانیں ادھر ادھر ایستادہ تھیں۔ اسی مقام پر سید احمد شہید لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ کیا خبر وہ پہاڑ کی اس جانب سے اترے ہوں یا شاید اُس پگڈنڈی پر سے اترے ہوں۔ ممکن ہے سکتوں نے اس ٹیلے کے عقب سے حملہ کیا ہو اور ان کی دوسری ٹکڑی سامنے سے آگئی ہو۔ کچھ دیر لڑائی ترازو کے تول تھی، پھر کانٹا بدلنے لگا۔ امیر المؤمنین سید احمد شہید خود ایک مورچے پر لڑ رہے تھے۔ اب یہ جنگ کا میدان نہیں رہا تھا، بلکہ مختلف ٹولوں میں بٹ کر چھوٹی چھوٹی رزم گاہیں بن گیا تھا۔ رحیم بخش بناری حضور کے جانثاروں میں سے تھا۔ اس کا بیان ہے کہ ہمارے آگے سو سو آدمی قدم پر سکھوں اور غازیوں کا جھوم تھا اور انٹر لوگ کہہ رہے تھے کہ حضرت امیر المؤمنین اس جھوم کے اندر ہیں۔ پھر برقیوں نے یعنی میں نے، اندھ بخش باغی نے اور رسول خاں جلالہ والا نے صلاح کی کہ آؤ ہم بھی وہاں چلیں جہاں حضرت امیر المؤمنین ہیں اس وقت گولیوں کا مینہ برسنا تھا اور کارٹروں کے کاغذ ساری فضا میں تیر رہے تھے۔ اس کے باوجود ہم ادھر کو بھاگے، لیکن اس عرصے میں لڑائی شکست ہو گئی۔ اس آخری مرحلے میں میاں مکھیر رحیم بخش بناری سے ذرا آگے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ حضرت امیر المؤمنین سکتوں کو مارتے ہوئے ہم لوگوں سے آگے بڑھ گئے۔ ہمارے دہانے طرف نالہ تھا۔ چھ آدمی ہمارے اس نالے سے ہو کر حضرت امیر المؤمنین کے پاس چلے گئے۔ اس عرصے میں حضرت علیہ الرحمۃ کی طرف سے زخمی ہو کر نامر خان بٹ گرام کے آئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ حضور اُس جھوم میں تشریف رکھتے ہیں۔

جیپ جبرید کی طرف جا رہی تھی اور راستے میں جگہ جگہ گوبر، گوبرانیاں، ان کے بچے اور بیڑوں

کے کھلے ملتے تھے۔ شیر باز کہہ رہا تھا:

”یاراجی بہت عزیز لوگ ہیں اس علاقے کے۔ خدا کی شان ہے۔ اُس کے آگے بولا نہیں جاتا۔ وہ دیکھتا ہے ہم اپنا فرض کس طرح سے پورا کرتے ہیں۔“

مسود کہہ رہا تھا: ”واہ واخان بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے بھی بہت سے فرض ہیں۔ ہم پر بھی بڑے کڑے حکم ہیں۔“

دریائے کُمار دیوانوں کی طرح پتھروں اور چٹانوں سے سرسبز رہا تھا۔ ہم بلند ہو رہے تھے۔ دریا کی مزارف نیچے ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا: ”یاد رہے علاقہ ازل ہی سے اسی طرح کا ہو گا یا مختلف ہو گا؟“

عمر نے کہا: ”تو بھی بڑا گھٹا آدمی ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ روز ازل سے یہ پہاڑ اسی طرح کھڑے ہیں۔ نالے اسی طرح بہہ رہے ہیں۔ برف لیے ہی گرتی ہے گلیشیر اسی طرح راستے روکتے ہیں۔ تو سمجھتا ہے یہ علاقہ تیرے پٹھانوں نے بنایا ہے؟“

میں نے کہا: ”یار میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا، میں نے اس کا اعلان کر دیا۔“

”مفتی نے کہا: ”بالکل ٹھیک کیا ہے۔ اس وقت ہم آزاد ہیں۔ یہ پندرہ دن بالکل ہمارے ہیں۔ اس میں ہر طرح کا اظہار اور ہر طرح کے اعلان کی اجازت ہے۔“

”لیکن احمقانہ خیالات کے اظہار کی اجازت نہیں۔ پہاڑوں کو دیکھو ہائے ہائے وہ دُور کچن چٹائی کف پوش چوٹیاں ہیں۔“

مجھے جب بھی عمر کی طرف سے جھڑکی ملتی ہے تو مسخو بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ مسکرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا: ”لیڈر کے حکم کے بغیر تو کسی بات کا برملا اظہار نہیں کر سکتا۔ دل میں البتہ سوچ سکتا ہے۔“

”دل میں سوچنے لگا، تو یہ پھر گیا۔“ مفتی نے کہا۔ ”یہ پہاڑوں میں بھی اپنی دنیا ساتھ لے آتا ہے۔“

”بس اسی لیے ہم اس کو سفر پر لانا نہیں چاہتے تھے۔ یہ سالا بھونڈ ہے پروانہ نہیں ہے۔ ادیب نہیں ہے سکرپٹ رائٹر ہے۔“

عقاد جو ہم سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور فزانتھ شخص ہے، اپنے وجود میں دیوانگی کی ایک جھمٹ بھی رکھتا ہے۔ اس کا پیشہ الیکٹرکس ہے اس کی تعلیم مغربی ہے۔ اس کا دماغ تجربہ پسند ہے، لیکن اس کے دل پر اچھی تک اس کے اُن پڑھ بولے دادے کا قبضہ ہے۔ کبھی کبھی ان کا ہاتھ اس کے دل پر سے چھوٹ جاتا ہے۔ کبھی کبھی پھر اس کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنی چھڑی سے ماتھا اٹھا کر کہا:

”یارو، شاہ صاحب نے ایک معمول سی بات پوچھی کہ علاقے روزِ ازل سے اسی طرح کے ہیں یا بدلتے رہتے ہیں۔ تم لوگ ان کے پیچھے ہی پڑ گئے۔“

اعظمیٰ نے کہا: ”شاہ شمس، لڑاؤ شاہ جی کو مولوں سے۔“

عقاد بولا: ”ایک مرتبہ بنی اسرائیل کے زمانے میں وقت کے بادشاہ سے حضرت خواجہ خضر کی ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے فرمایا: ”یا حضرت جو کچھ عجائبات آپ نے اپنی عمر میں دیکھے ہوں، میرے روبرو بیان کرو۔“

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: ”میں نے بہت کچھ عجائبات دیکھے ہیں، مگر اس وقت جو کچھ حاضر ہے اُس کا بیان کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں ایک شہر میں وارد ہوا جہاں خلقِ عظیم تھی اور عماراتِ بلند سے آبادی تھی۔ پس میں نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ یہ تیرا کس زمانے میں ہوئی۔ اس نے کہا یہ شہر قدیم ہے اور مجھے نہ میرے باپ کو نہ میرے دادا کو اس کے آغاز اور اس کی بنا کا حال معلوم ہے۔ شروع سے ایسا ہی آباد اور قائم و دائم ہے۔ پس پانچ سو برس بعد میرا پھر گزر اس شہر سے ہوا، تو وہ شہر ویران نظر آیا۔ یہاں تک کہ ایک اثر بھی آثارِ عمارت میں سے باقی نہ تھا۔ وہاں دیرانے میں ایک مرد گھاس کھود رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ کس شہر کا ہے؟ ہوا۔ اُس نے کہا۔ میں نے یہ شہر ہمیشہ ہی خراب دیکھا ہے۔ میں نے کہا۔ یہ کس شہر کا ہے؟ ہوا۔ اُس نے کہا۔ یہاں کی آبادی کا حال نہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ نہ میرے باپ نے یا میرے دادا نے یا اُس کے دادا نے اس کا تذکرہ کیا۔ پس میرا گزر پانچ سو برس کے بعد دوبارہ ہوا تو دیکھنے میں آیا کہ وہ سرزمین ساری عالم آب ہو گئی تھی اور مابقی گہرا میں جاں ڈال کر مچھلیاں بکڑتے تھے۔ اُن سے دریافت کیا کہ کب یہ زمین دریا برد ہو گئی؟ انہوں نے جواب دیا! فوس

تم بہت ہی بے خبر ہو جو ایسے کلام کرتے ہو۔ یہ سرزمین ہمیشہ سے عالم آب ہی رہی ہے۔ کبھی یہاں کی خشتی کا حال اپنے باپ دادا سے نہیں سنا۔ پانچ سو سال بعد پھر میرا دھر سے گز رہا تو دریا خشک ہو کر زمین برآمد ہوئی۔ کاشت کار اس میں کھیتی باڑی کر رہے تھے اور عورتیں گھاس کے پوٹے باندھ رہی تھیں۔ میں نے دریافت کیا کہ کب سے یہ زمین پانی سے نکلی ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمیشہ سے ہی زمین رہی ہے۔ پس پوچھا یہاں کوئی دریا نہ تھا۔ انہوں نے کہا ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہ اپنے باپ دادا اور بزرگوں سے سنا۔ الغرض اس کے بعد بھی جب پانچ سو سال بعد میرا جانا ہوا، تو ایک عظیم الشان شہر وہاں نظر آیا۔ بڑے بڑے مکان، عمدہ سراہیں، تاجروں کے قلعے اور خوش پوشا لوگ۔ پس وہاں کے لوگوں سے میں نے اس شہر کے آغاز و بنیاد کا حال دریافت کیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ بجائی یہ شہر تو ایسا ہی آباد تھا۔ ہمیں اس کے بنا کی تاریخ معلوم نہیں۔“

عقاد کی بات سن کر تھوڑی دیر جیپ میں خاموشی رہی، پھر عمر گھنٹے لگا: ”یہ سب داستانیں ہیں۔ میں خواجہ خضر وغیرہ کو نہیں مانتا۔“

مضقی نے کہا: ”نہ مانو جن جی، بات پر غور کرو۔ بات ماننے والی ہے۔“

اعظمیٰ نے کہا: ”یا مضقی، اب تو پنڈی سے باہر کے لوگوں کو بھی علم ہو گیا ہے کہ تو نہایت ضعیف الاعتقاد ادیب ہے۔“

مضقی نے سنس کر کہا: ”میں ادیب بالکل نہیں، صرف ضعیف الاعتقاد شخص ہوں۔“

”اور وہ جو تیرا والد فریڈ تھا جس کی تو عوامی اولاد ہے وہ؟“ عمر نے پوچھا۔

”وہ؟“ مضقی نے سرکھج کر کہا۔ اس سے تو میں نے علم حاصل کیا ہے۔ دراصل میں ایک

HIGHLY EDUCATED SUPERSTITIOUS MAN ہوں۔“

مسعود نے قہقہہ مار کر کہا: ”لوپٹ لو کیا پٹتے ہو؟“

شیرباز نے کہا: ”یاراجی! اس علاقے کے لوگ بڑے ہی غریب ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔“

سلنے ایک بچہ اور اُس کی ماں جارہے تھے۔ بچے کی گود میں ایک چٹلی مرغی تھی اور عورت کے سر پر میلے چکر جڑوان میں لپٹا ہوا قرآن تھا۔ جب ہم اُن کے قریب سے گزرے تو شیرباز نے

سٹیننگ کے دایاں ہاتھ چھو کر اپنی انگلیوں کو چڑھا اور باری باری دونوں انگوٹوں سے لگایا۔
نہیں نے سگریٹ کا ٹوٹا لڑکے کے پاؤں کے پاس پھینک دیا۔

شیراز نے کہا: "اس بچے کی ساری دولت یہ مرعی ہے۔ یاراجی بہت غریب لوگ
ہیں اس علاقے کے۔"

عمر نے کہا: "اس سے مرعی فریڈیس، نارائن جیل کرو سوٹ کریں گے۔"

مسعود نے کہا: "نہیں یار! اس کی بات معلوم ہوتی ہے۔"

لیڈر بولا: "اسی لیے تو غریب رہے ہیں کہ اس کی کچھ مالی مدد ہو جائے گی۔"

شیراز نے کہا: "یاراجی پوچھ لیتے ہیں ناں۔ اودہ الاکا لڑکا سم گیا اور اس کی ماں نے
قرآن شریف سر سے اتار کر اپنے سینے کے ساتھ چٹالیا۔" اوئے مرعی بیچے گا؟ لڑکے نے
نفی میں سر ہلایا تو عماد نے پوچھا:

"کیوں نہیں بیچتا؟"

لڑکے نے خوفزدہ ہو کر کہا: "جی یہ میری مرعی ہے۔ میں اس کو انڈوں پر بٹھاؤں گا۔"

"تو اب اس کو کدرا اٹھائے پھر تا ہے؟" شیراز نے دریافت کیا۔

"جی یہ بیمار ہے اس کو دم کروا کے لا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا، مفتی نے کہا، پھر اپنی جیب سے تبا کو والا پان نکالا، ساتھ ہی ایک روپیہ

بھی۔ روپیہ لڑکے کو دے کر مفتی نے پان منہ میں رکھ لیا اور ڈرائیور سے غصہ غنوں آواز میں کہا:
"چلو جی۔"

اعظمی نے سر ہلا کر کہا: "یار مفتی بڑا نیک آدمی ہے۔ روپیہ روپیہ خیرات کرتا ہے

کم نہیں۔"

مفتی کے منہ میں پان تھا اور پیٹ سے اس کے کئے پھول گئے تھے، نہیں تو وہ کوئی

جواب ضرور دیتا۔

جرید میں ہم ٹوڑی دیر کے لیے رُکے۔ شیراز نے کہا: "میاں اخروٹ کی لکڑی سینر

کرنے کا کارخانہ ہے اور بہت اعلیٰ قسم کا ذہن پڑتا ہے۔" آپ کو دکھلائوں؟

ہم نے کہا: "چائے کہاں سے نہیں؟"

"چائے ادھر نہیں جی، شیراز بولا: "چائے کاغان میں جیل کر نہیں گے۔ ادھر میرے

گرائیں کا ایک ہوٹل ہے۔ بہت فس کلاس چائے بناتا ہے۔"

ہم اس کی فرمائش پر فرنیچر کا کارخانہ دیکھنے چلے۔ ایک اُدچی پہاڑی پٹین کی چھت
والے بڑے بڑے ہیگرڈوں میں لکڑی کا کام ہو رہا تھا۔ کچھ لیتے سوکھ رہے تھے۔ کچھ کو آگ
کے قریب رکھا ہوا تھا۔ ایک بڑھئی پختے زندر ہاتھ اور آٹھ آدمی چورس اور ستھری سے
اخروٹ کی لکڑی پر پھول پتیاں کھود رہے تھے۔ شوروم میں تیار مال پڑا تھا۔ پلنگ کے چرکٹے
کی قیمت تین سو روپے تھی۔ اس کی پشت کے تختے پر انگلو کی ہیل کھدی ہوئی تھی اور درمیان
میں ایک چھوٹا سا خوبصورت دائرہ تھا۔ دونوں پٹیوں پر نازک سی ہیل کھدی تھی اور چولیس بڑی
صفائی کے ساتھ بٹائی ہوئی تھیں۔

عمر نے شوروم انچارج سے پوچھا: "ڈبل بیڈ نہیں بناتے؟"

عماد نے اپنی سوئی عمر کے گلے میں ڈال کر اسے ہلکا سا جھٹکا دیا اور کہا: "اوئے شرم کر!

اس عمر میں ڈبل بیڈ"

مفتی نے کہا: "اس عمر میں تو ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔"

شوروم انچارج ہماری کھلی باتوں کو سن کر کچھ محبوب سا ہو گیا اور کھسیانی منہی ہنسنے

لگا۔

مسعود نے کہا: "یار، یہ ڈرائی فردٹ ٹرے بڑی سستی ہے۔ بڑی چودہ روپے کی اور

چھوٹی چھ روپے کی۔"

"ایک ایک سب کے لیے لو، مفتی نے مشورہ دیا، تو شیراز نے کہا: "واپسی پر

لینا یاراجی اس وقت کہاں اٹھاتے پھر دگے؟"

ڈرائنگ ٹیبل سب کو ہند آیا۔ چھ درازیں، ملائم سطح، آئینے کے لیے ہل دار فریم قیمت

نکل پانچ سو روپے۔ اس میں آئینہ نہیں لگا تھا، لیکن ہم میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی محبوبہ کا چہرہ

اس میں صاف نظر آیا۔ کبھی وہ محبوبہ بیوی بن جاتی، کبھی پھر محبوبہ کا روپ دھارتی۔ اس کے

کندھوں پر ہمارے ہاتھوں کا دباؤ تھا۔ آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔ کپٹیوں پر غرر سیدگی کے آثار تھے۔ جیب میں پھل خواہ کے بچے ہوئے کچھ نوٹ تھے۔ دل میں ریناؤرمنٹ کا کپڑا چل رہا تھا۔ مجبور کے بال بے تھے اور چہرے پر کریم مل رہی تھی۔ غر کے آثار اس کی آنکھوں کے نیچے نمایاں ہو رہے تھے، لیکن اس کی مسکراہٹ بڑی فریشتی تھی۔ ہم وہاں سے کچھ خریدے بغیر باہر نکل آئے۔ پہاڑی سے اترتے ہوئے غر نے شور و دم انچارج سے پھر پوچھا کہ اگر ڈبل بیڈ کا آرڈر دیا جائے، تو کیا بنا سکر گے؟

انچارج نے کہا: "ہا تو دیں گے، لیکن آپ کو لے جانے میں بڑی وقت ہوگی جیب پر اتنا بڑا چوکھٹا جانیں سکے گا۔"

"جائے گا کیسے نہیں یا راء شیراز نے کہا: "ہم کھول کر لے جائیں گے۔"

جرید کے بعد بھاگل آیا یا اس سے پہلے، مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں۔ میری آنکھوں میں ابھی تک آئینے کے اندر دکھی ہوئی صورت گنوم رہی تھی۔ دائیں طرف اُدبچے اُدبچے پہاڑ تھے۔ بائیں جانب پلکتے ہوئے نشیب اور گہری کھدیں۔ میری نگاہیں سامنے دو بالشت چوڑے راستے پر تھیں، لیکن گوشہ چشم سے مجھے ارد گرد کے نظارے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ترائی میں ایک بھولا سا بچہ بکریوں کی رکھائی کر رہا تھا۔ وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر دُھوپ کی ایک رُو پہلی کرن ناچ رہی تھی۔ میں جس کا دل جرید سے چلتے وقت پانی سے بھرے ہوئے اسفنج کی طرح بے قابو ہو گیا تھا، اس لڑکے کو دیکھ کر اور بھی آرزو ہو گیا۔ وہ بڑا مضوم ادب بھولا بھالا تھا اور اس کو اپنی یا اپنے والدین کی یا میرے غم کی کوئی خبر نہ تھی۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ بکریاں اس کے ارد گرد چر رہی تھیں اور اسے کسی بات کا بھی علم نہ تھا۔

اُچھے اُچھے تنکھے تنکھے کالے شاہ پہاڑ
سوگ ج ڈبئی ہو کے بھردی کین بار اُجھاڑ

چپ چان دی گھوکر اندر
ٹانویں ٹانویں جھگٹے
ورلے ورلے گھر

ٹیڈھی راہ تے ہیٹھاں تکرماں رب دی جائے ڈر
پتھر اُتے تیروں ننگا اکا باکا کا کا
بکریاں دارا کا
بلے خبر انجان
ایسی گل نہ سمجھے

ایناں دی نہ جانے
رات نوں سوون لگی
توں جدوں دو سپتہ لاہویں
کیہڑے پا سے رکھیں
کیہڑے پا سے سونویں

غر نے نعرہ مار کر کہا: "شاہ جی سرگئے او"
میں نے اہستہ سے کہا: "نہیں جی جاگ رہا ہوں"
مسعود نے کہا: "پھر واپس لاہور پہنچ گئے ہو؟"
میں نے کہا: "نہیں یا راتما رے ساتھ ہوں۔ وادی میں"
"تو پھر اس وقت کہاں تھے؟" اعظمی نے پوچھا۔
میں نے کہا: "بکریاں چرا رہا تھا اُس بچے کے ساتھ"
"ہیں؟ بچہ؟" اعظمی نے تڑپ کر پوچھا۔ "کون بچہ؟"
"سور کا بچہ" غر نے قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا: "نہیں یا راء وہ بیٹھا ہے"

سب نے ہلٹ کر دیکھا۔ بھولا بچہ ابھی تک پتھر پر بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر ابھی تک وہی رُو پہلی کرن ناچ رہی تھی۔

گوچروں کے قافلے میدانوں سے واپس پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں میں کبھی گرمی نہیں دیکھی۔ یہ حدت اور دُھوپ اور اس سے نا آشنا ہیں پہاڑوں

پر دُور دُور اپنی بیڑکریاں چراتے ہیں۔ اسی گھدبانی کے سمارے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب اُونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہلی برف باری ہوتی ہے تو یہ اپنے ریور ہاب ک نیچے اترنے لگتے ہیں۔ سردی ان کے پیچھے پیچھے دے پاؤں سینڈلی کی طرح لپکتی آتی ہے اور یہ آگے آگے نچاویں اور نیوانوں پر اُترتے جلتے ہیں۔ نوبر و سبریک پاپیادہ چلتے یہ مانسہرہ، نوشہرہ، بالاکوٹ اور حویلیاں ہم پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ گوجر راولپنڈی تک بھی آتے ہیں، لیکن اس سے آگے نہیں۔ یہاں پہنچتے پہنچتے مارچ کا مہینہ آجاتا ہے، پھر گرمیوں کا تپا ہوا سُرخ بھاگھ اپنے روند پر بھکتا ہے۔ گوجر اپنا مال مویشی جح کر کے اُوپر چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پیچھے پیچھے گرمی۔ آگے آگے گوجروں کے قافلے اور ریور گرمی اور ان کے درمیان آٹھ دس میل کا فاصلہ رہتا ہے۔ کاناں پہنچنے پر گرمی کا بگھیلا تنک ہار کر چٹانوں کے اندر سو جاتا ہے اور یہ گھاس بوٹی کی تلاش میں آگے نکل جاتے ہیں۔

ان کی ساری دولت ان کے گلے میں۔ ان کا سارا حُسن ان کی عورتیں ہیں۔ ان کی ساری کاہلی ان کے مرد ہیں اور ان کی ساری جوکسی ان کے کتے ہیں۔ یہ لوگ پتھر اور وحات کے زمانے سے ذرا بعد کے ہیں اور کاشت کاری اور کھیتی باڑی کے عہد سے پہلے کے ہیں۔ جہاں خود دُور سبزہ ہوتا ہے پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں گھاس کے میدان ہوتے ہیں دُور سے ڈال دیتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ دُنیا کے اور کسی ملک میں اس قدر قدیم اطوار کی اور کوئی قوم آباد نہیں۔ اتھرو پولوجی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے ان میں گرمی دُپھی ہے، لیکن ایک ادیب کی حیثیت سے مجھے ایسے معاشرتی گروہ اچھے نہیں لگتے۔ کمائیاں بکھنے والوں، داستانیں سُنانے والوں اور غم سازوں نے خانہ بدوشوں کی زندگیوں پر ایسی ایسی کمائیاں وضع کی ہیں کہ مجھے زہر لگتی ہیں۔ ایک خانہ بدوش و شیزہ اور ایک شہری بابو کے درمیان جب محبت کا ڈول ڈالا جاتا ہے، تو مجھے ابکاٹی آنے لگتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان کبھی بھی

COMMUNICATION

نہیں ہو سکتی اور جہاں کمیونی کیشن نہ ہو، وہاں محبت کس طرح ہو سکتی ہے؟ بھڑکریاں چرانے والی یا خستہ فانی لڑکی یا اُونٹ چرانے والی بلوچی دوشیزہ سے تھوڑی جھنڈ ڈاٹوٹیک جیلانے والا اُو اکائی پر ہائی فائی میوزک سنسنے والا کس طرح سے محبت کر سکتا ہے یا اس کے خُش سے کس طرح

متاثر ہو سکتا ہے؟ چونکہ جوان ٹیلی ویژن کے ٹریویرا اشتہاروں کا میرو ہوا وہ ہو ہوا ہارنے والی اُن پڑھ چڑھائی سے کیسے متکلم ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ وہ کس زبان میں گفتگو کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ کس طرح ڈوٹ گا سکتا ہے؟

"پہاڑی کو سے شاہ جی، مسود نے جیب کا پردہ اُٹھا کر باہر دیکھتے ہوئے کہا: "ڈوٹ گارہے ہیں۔"

مُنتی نے کہا: "یہ ڈوٹ نہیں چن جی، یہ ان کا سوان ساگ ہے۔ اس سے آگے نہیں ملیں گے۔"

عماد نے کہا: "تو توں کی زندگی بھی عجیب ہے۔ اس پر کینیڈا کے زولو جیل سنٹر میں بڑی ریسرچ ہوئی ہے اور ماہرین نے اس سلسلے میں تین تھیوریاں قائم کی ہیں: عمر نے جرح کر کہا: "لعنت لعنت!"

مسود بولا: "تو علم بس کریں اوتے یار!" لیکن مُنتی نے کہا: "یار اس کو بات کرنے دو، کالا علم تو آیا نہیں، شاید کالے کو سے کا علم ہی نصیب ہو جائے۔" اس پر سب نے احتجاج کیا اور عدا کو اپنے علم کے انہار کا موقع نہ مل سکا۔

اب کاناں کی بستی قریب آ رہی تھی اور پہاڑ کے دامن میں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر گھڑوں اور جھوپڑوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔ شیر باز نے جیب روک کر کہا:

"یاراجی وہ پل دیکھو۔ اُدھر دریا کے اُدپر، ہم نے تریال سے گزریں نکال کر اُدھر اُدھر دیکھا، لیکن کوئی پل نظر نہ آیا۔ اس نے اپنی سیٹ سے اُٹھ کر تریال کی ایک ہانڈ اُٹھا دی اور کہا:

"وہ جی وہ... وہ دیکھو اُدھر پہاڑ کے پاس ایک آدمی پل پر سے گزرنے لگا ہے۔" ہم نے دیکھا، دریا کے اُدپر ٹیل کار سے تنہا ہوا اُداس پر ایک پھر کی دار پڑھی چلتی تھی اس آدمی کے ساتھ ایک لڑکا تھا جس نے ایک پولی اُٹھا رکھی تھی۔ آدمی کی گود میں سفید رنگ کا ایک بیلا تھا۔ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے سے گلے ملے۔ پھر وہ آدمی لیلالے کر پیڑھی پر بیٹھ گیا۔

بیٹے نے پوچھی اُس کی گود میں دے دی اور بچہ کی دار پڑھی کف اڑاتے، شور مچاتے، دریا کو عبور کرنے لگی۔ ادھی راہ تک پڑھی اپنے زور میں پھسل گئی، لیکن دریا کے عین بیچ LOOP پر اکر رک گئی۔ اُس آدمی نے ایک ہاتھ لیلے پر رکھا اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر اوپر اسٹیل کے رستے کے پاس لٹکتی ہوئی ایک رسی پکڑ لی۔ وہ آہستہ آہستہ اس رسی کو کھینچتا تھا اور اس کی پڑھی ایک ایک فٹ دو دو فٹ ہو کر اگے کو بڑھتی تھی۔

شیر باز نے کہا: "یاراجی! یہاں کے لوگ بڑے غریب ہیں۔ اللہ کی شان ہے ان کے لیے کوئی ٹپل بھی نہیں بناتا۔ بس جو چیز انگریز بنا کر چھوڑ گیا تھا وہی باقی ہے۔" مسود نے کہا: "انگریز بڑا حرامی تھا خان! تم انگریز کو نہیں جانتے؟" "کیوں نہیں جانتا جی، جانتا ہوں، شیر باز نے یقین کے ساتھ کہا: "میں نے خود انگریزوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ بڑا بد بخت حرامی تھا۔"

پھر ہم نے جیب کے اندر گردنیں کر لیں اور شیر باز بسم اللہ پڑھ کر موڑ چلانے لگا۔ میں نے کہا: "ہم نارن کس وقت پہنچ جائیں گے؟" "یہی جی کوئی انشاء اللہ جمعہ کی نماز تک پہنچ جائیں گے، خدا کے فضل کے ساتھ۔" "ادبو! آج تو جمعہ ہے مسود! عمار نے گن گنا کر کہا۔" "بسم اللہ، مسود سر مل کر بولا: "جمعہ پڑھیں گے انشاء اللہ، نارن کی مسجد میں پڑھیں گے۔"

"شباباش جی یار! خدا خوش رکھے۔ شیر باز نے خوش ہو کر کہا: "جمعہ ضرور پڑھنا جی۔ ادھر کے لوگ بہت راضی ہوں گے سمجھیں گے آپ ان کے بھائی ہیں، ان کے عزیز بنتے دار ہیں۔ کسی کا دل رکھنا بڑا نیکی کا کام ہے جی۔"

مفتی نے کہا: "یارا میں نے کبھی جمعہ نہیں پڑھا۔ میں تو آپ سے معافی چاہوں گا۔"

"ناں جی ناں، شیر باز نے کہا: "ایسا نہ کرنا۔ خدا کا آپ پر بڑا فضل ہے۔ وہ لوگ بہت خوش ہوں گے کہ شہر سے ہمارے بھائی آئے ہیں۔ ہمارے پنجاب کے بھائی۔"

میں نے کہا: "بھائی تو ہم ان کے ہیں شیر باز نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

وہ جی فرق پڑتا ہے ناں، شیر باز نے آہستہ سے کہا: "بھائی کی شکل بھی بھائی سے ملتی ہو اس کی عادت ملتی ہو بات چیت ملتی ہو پھر ہی بھائی ہو سکتا ہے۔ ادھر بہت ٹوسٹ لوگ آتا ہے یار۔ دریا میں ٹوسٹ پکڑتا ہے، گھڑ سواری کرتا ہے، بڑا خوبصورت رنگ دار پوشاک پہنتا ہے، پراس کی شکل نارن کے لوگوں سے نہیں ملتی۔ سلا مالیک بولتا ہے، پراس کا ڈیزائن دوسرا ہوتا ہے اس لیے ادھر کے لوگ اس کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے۔"

"تو بچہ کس کا بھائی سمجھتے ہیں؟" عمار نے پوچھا۔

"وہ یاراجی، شیر باز نے رکتے ہوئے کہا: "اس کو دوسرے ٹوسٹ کا بھائی سمجھتے ہیں۔ جو ذلیف سے آتا ہے۔ ایک بیسیوں سے آتا ہے، آپ جمعہ پڑھنے ضرور جانا۔ ان لوگوں کو تیشن ہو جائے گا کہ پنجاب کے بھائیوں کی یہ عادت ہمارے جیسی ہے۔"

"پنجاب کے بارے میں تمہارے خیالات کچھ اچھے نہیں شیر باز، اعظمی نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"ناں جی ناں۔ خدا کی قسم۔ ہم سرحد کے لوگ تو پنجاب سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ بڑا خوشی کرتے ہیں پنجاب پر۔ لاہور نے بڑا زبردست مقابلہ کیا ہندو کا... وہ کیا بولتا ہے جی اس توپ کو..."

"رانی، مجھے فوراً یاد آگیا۔"

"ہاں جی! رانی رانی۔ بڑا زبردست چان ماری کیا رانی نے۔ ہم ادھر قصبہ خوانی میں روز شام کو رانی کی بات کیا کرتے تھے۔"

مسود نے منہ پتکا کر کے کہا:

"خان یہ رانی کو چلاتا رہا ہے۔"

"خا، یار! زندہ داجی، جیب کو ایک دم بریک لگی۔" آپ ملری کا آدمی ہے؟"

"نہیں بھائی ہم میں ملری کا کوئی آدمی نہیں۔ ہم سب ریڈیو کے آدمی ہیں، اعظمی نے منہ پتکا کر کے کہا۔" رانی ایک کینروئل آرٹسٹ تھی، اس کا ذکر ہو رہا ہے۔"

اس پر سب ہنسنے لگے، شیر باز شرمندہ سا ہو گیا، تو عمار نے سنجیدگی سے کہا: "یار اپنی

انسٹی ٹیوشن کو اس طرح بدنام نہیں کرتے :

ذرا سی دیر کو جیب میں خاموشی رہی اور پھر ہم بنیامی کا داغ لے کر کاغان کے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ اس گاؤں میں کچھ کچے پکے چھوٹے چھوٹے گھروں سے ہیں جو چٹانوں کی اوٹ سے نظر نہیں آتے۔ کچھ کوٹھیاں ہیں جو اپنی لمر یا چھتوں اور رنگین دیواروں کی وجہ سے صاف نظر آتی ہیں۔ یہ جہ دونوں اور سیدوں کی کوٹھیاں ہیں جو اس علاقے کے، ان پہاڑوں کے اور ان مرغزاروں کے مالک ہیں۔ کاغان میں داخل ہونے والی سڑک کے نالے کے پل پر سیدوں کا نشی بیٹھا تھا جو ایک روپیہ فی سہارہ اور دو روپے فی گائے کے حساب سے گوبروں سے چرائی کی اجرت لے رہا تھا۔ جو ریوڑ چرائی کے لیے کاغان کی وادی میں داخل ہوتے ہیں انہیں یہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں سے سیدوں کے لیے آمدنی کا ایک ہی ذریعہ باقی رہ گیا ہے، اسی وجہ سے وہ کاغان چھوڑ کر کوچہ لاہور اور اسلام آباد میں جا کر آباد ہو گئے ہیں اور انہوں نے ڈیفنس، سوسائٹی، گلبرگ اور رونا میں اپنی کوٹھیاں بنائی ہیں۔

شیراز نے کہا :

”اب چلے ہو جی۔ چاہے بج پر بیٹھ کر ہو، چاہے وہ سارے اخروٹ کے نیچے

ٹھنڈی گھاس پر۔ یہ میرے گرائیں کی دکان ہے“

ہم سب نے اخروٹ کے درخت تلے بیٹھ کر چائے پینے کا فیصلہ کیا۔ درخت کے پتے دھوپ کی روشنی میں چمک رہے تھے اور اس کی ڈالیوں میں کچے کچے اخروٹ لگے تھے۔ نیچے گھرے سبز رنگ کی گھاس تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دریا کے شور کی وجہ سے ہمیں ذرا اونچا بولنا پڑا تھا اور ڈھلان کی وجہ سے ٹانگیں پھیلا کر اور پاؤں جاکر بیٹھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ عمر بہت اُداس تھا اور اپنی چھڑی کی مٹھ پر ٹھوڑی لگا کر پہاڑوں کی چوٹیاں دیکھ رہا تھا۔ ہم سب کو اس کی اُداسی کی وجہ معلوم تھی اور ہم سب خاموش تھے۔ گھاس واتے کو چودہ پندرہ سال ہو چکے ہیں، لیکن اس کی اُداسی کا عالم اب بھی وہی ہے۔ پہاڑوں میں کھوئی ہوئی مہنتیں اور بھولی ہوئی یادیں پھوٹ آتی ہیں، جس طرح بارش کے دنوں میں باہر بوندیں پڑتی ہیں، تو انسان کے اندر بھی بارش ہونے لگتی ہے۔ اوپر سے تو ٹھیک رہتا ہے، لیکن اندر سے

بالکل بھیگ جاتا ہے۔ اس قدر شور و کرار سے بیٹھنے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ یہی کیفیت پہاڑوں میں جا کر ہوتی ہے۔ کیسا بھی اچھا سا ٹھنڈیوں نہ ہو انسان تنہا رہ جاتا ہے اور اُداسی کی دُھند اسے چاروں طرف سے لپیٹ لیتی ہے۔ اندر آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگتا ہے اور باہر کیسی بھی دھوپ کیوں نہ کھلی ہو، کیسی بھی ٹھنڈی ہو، کیوں نہ چل رہی ہو، اندر پاب بوندیں گرنے لگتی ہیں اور شدید بارش ہو جاتی ہے اور اندر سے جھٹکا ہوا انسان باہر کے آدمیوں کے کام کا نہیں رہتا۔ ان کا ساتھی نہیں رہتا۔ یہی حالت عمر کی تھی !

اخروٹ کے تناور درخت تلے، ٹھنڈی ہوا میں ہم نے گرم چائے پی اور کسی نے کسی سے بات نہ کی کھلے ہوئے مناظر میں ہم کچھ برف کے تاش بن کر گھل گئے تھے اور اس ٹھنڈی ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے جس میں جیلر کی خوشبو، گھاس کی مٹک اور دریا کی باس شامل تھی شیراز اپنی سیٹی رنگ کی چادر سے چپیاں جھاڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہونٹل کا ایک لڑکا تھا جو چائے کے برتن لینے آیا تھا۔ شیراز کے آواز دینے سے پہلے ہی ہم اپنی جگہ سے اُٹھے اور جیب کی طرف چل دیے۔ یہاں سے نارن کوئی بارہ میل کے فاصلے پر تھا اور راستے میں ہمیں ایک بہت بڑے گیشیر پر سے گزرنا تھا۔ جیب میں بیٹھے ہی ہم پر سے اُداسی کے بادل چھٹ گئے اور پٹرول کی گواہی دینے والی گندہ میں پھر اس دُنیا میں واپس لے آئی۔ پہاڑ کا ایک تیکھا موڑ کاٹنے کے بعد مسود نے ہم سب کی توجہ ٹھین کی چھتوں والی ایک بستی کی طرف کرائی اور بولا :

”یہ کوئی فیکٹری معلوم ہوتی ہے“

”فیکٹری یہاں کہاں؟“ عواد نے کہا : ”یہاں تو بس یا گھر یا خور و سبز ہے یا پتھر“

فیکٹری کہاں کیا کام؟

”فیکٹری ہے“ عمر نے کہا۔

”بالکل فیکٹری ہے“ منشی نے اعتماد کے ساتھ کہا : ”کلوچ انڈسٹری سے کوئی بڑی چیز“

”میں نے بھی اپنے علم کے زور پر کہا :

”فیکٹری ہی معلوم ہوتی ہے“

اس وقت شیر باز اپنے خیالوں میں گم جیپ چلا رہا تھا۔ اُس نے ہماری بحث میں حصہ نہیں لیا۔ شاید اس نے ہماری باتیں سنی نہیں، ورنہ وہ ضرور دخل دیتا۔ جب ہم اس علاقے کے قریب سے گزرے، تو وہ ایک اچھا سا گاؤں نکلا اور اُس کے درمیان سڑک کے گھر تھے۔ عمو نے سر اٹھا کر کہا:

”اے گدھو! یہ فیکٹری ہے؟“

ہم سب اپنی اپنی جگہ کھینے ہو گئے۔ اعظمی نے جیپ کا پردہ دھرا سا اُپر اٹھا کر کہا:

”فیکٹری ہی ہے۔ فیکٹری نہیں تو اور کیا ہے؟“

”یہ گاؤں ہے گدھے!“ عمو نے جمل کر کہا۔

”وہی تو میں کہہ رہا ہوں!“ اعظمی نے کہا۔ ”بچے بنانے کی فیکٹری ہے۔“

ہماری ہنسی مسود اور شوق کے قہقہے میں دب کر رہ گئی۔

عمو نے کہا:

”یار منتی! یہ بچے بنانے کی نئی ترکیب پر تو میں حیران رہ گیا۔ خدا کی قسم مجھے نہیں علم تھا کہ مچھیاں اس طرح سے بچے پیدا کرتی ہیں۔“

”لو بھائی صاحب ابھی تک وہیں گھوم رہے ہیں۔“ عمو نے زور کا مقدمہ لگایا۔ پہلے ہم مشاد جی سے تنگ تھے کہ وہ اپنا لامبورس ساتھ اٹھانے پھرتے ہیں۔ اب یہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔“

کاغان سے پہلے راستے میں (مجھے جبکہ کا نام یاد نہیں!) ہم نے گورنمنٹ میچری دیکھی تھی۔ یہاں سیمنٹ کے چتے ہوئے چوہوں میں ٹراؤٹ مچھلی کی پونج تیار کی جا رہی تھی۔ ایک تالاب میں لاروے تھے۔ دوسرے میں ایک ایک آدھا آدھا چھوٹی مچھلی اس سے اگلے میں اچھی بھڑکی مچھیاں، دو تالابوں میں سیاہ اور دین بڑا ٹراؤٹ کے زور اور مادہ پھیں۔ صحت مند جوان، مست پھیں، جوانی میں اندھے نروے مچھے۔ ہم سب نے زندگی میں پہلی مرتبہ ٹراؤٹ مچھلی کی شکل دیکھی۔ مسعود اس سے پہلے یہ مچھلی کھا چکا تھا۔ لیکن اسے اس کی شبہا بہت کا علم نہ تھا۔ میچری کا نگران ایک بڑی عمر کا چچا تھا جس

کے ہاتھ بڑے بڑے، چہرہ کرخت اور ڈاڑھی کڑ بڑی تھی اُس کی آنکھوں میں محبت اور اس کے ہاتھ ملانے کے انداز میں شفقت تھی۔

عمو نے کہا:

”خان صاحب! یہ مچھیاں یہیں بچے دیتی ہیں؟“

”بچے نہیں جی! اندھے دیتی ہیں۔“ خان نے جواب دیا۔

”میرا مطلب ہے اندھے یہیں دیتی ہیں تالابوں میں؟“

”دیتی نہیں جی!“ خان بولا۔ ”ان سے اندھے دلاتے ہیں، پھر ان سے بچے نکالتے ہیں، پھر ان کو تالابوں میں منتقل کرتے ہیں۔ بڑا مشکل کام ہے صیب! لیکن خدا کا فضل ساتھ ہو تو ہر کام ہو جاتا ہے۔“

ہم میں سے کوئی بھی اس کی بات نہ سمجھا، اس نے ہمارے سوالیہ چہرے دیکھے تو ہاتھ کے اشارے سے بولا:

”اندھا ذی صیب! کو اڑیں۔ آپ کو ٹراؤٹ کے اندھے دکھائیں۔“

ہم اس کے ساتھ اندر کو ٹھہری میں چلے گئے۔ اس نے ایک ماہر ٹورسٹ گائیڈ کی طرح کنا شروع کیا:

”یہ تو آپ کو معلوم ہے صیب کہ مچھلی اور مچھلا دوسرے جانوروں کی طرح کبھی کرا س نہیں کرتے۔“

”بالکل ٹھیک!“ منتی نے اثبات میں سر ہلایا، تو ہم سب اس کے پیچھے پر گئے گذار پہلے ہیں تو سمجھ لینے دے۔“

خان نے کہا:

”دریا میں جب مچھلی اندھے دیتی ہے تو اپنی پوری مٹی اور جوانی پر اُگر دیتی ہے۔ اندھے دینے سے پہلے اس کو بڑے بڑے سخت منداؤں کے زچاروں طرف سے گھیرے رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جکر کاٹتے رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ بس نہ مچھے، مچھلی سے ایک ایک گز ایک ایک فٹ کے پاس گھومتے رہتے ہیں۔“

"وہی نہ عا د نے پوچھا۔

"نہجی" بولتے رہتے ہیں۔ کوئی اس مچھلی کے گرد گھومتا رہے، کوئی دوسری مچھلی کے گرد جا کر گھومنے لگے۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے صیب کہ مچھلی پتھروں کے اندر، یہ جو چھوٹے چھوٹے پتھر ہوتے ہیں ناں کنکریوں جیسے، ان میں اپنی پوچھل مارا کر ایک ٹوٹا سا بنا لیتی ہے اور اس میں انڈے دیتی ہے۔ کوئی آٹھ دس ہزار کے قریب۔

"کیا؟ کتنے؟" عمر نے چیخ کر کہا۔

"یہی صیب کوئی دس ہزار کے قریب اور پھر اُدھر سے بھاگ جاتی ہے۔ اپنے منہ سے تیرتی ہے۔ کوئی اوپر نکل گئی۔ کوئی دو میل نیچے چلی گئی۔ انڈے دے کر چلی گئی؟" عظمیٰ نے کہا۔

"اں جی!"

"اور پھر نہیں آتی؟"

"نہجی" پھر اس کو اکر کیا لینا ہے؟ بس اپنا کام کیا اور ختم؟

"پھر ان میں سے بچے کتنے دن بعد نکلتے ہیں؟" مسعود نے پوچھا۔

"ابھی ٹھہرو صیب! ابھی بچے کدھر سے نکلیں گے؟ ابھی تو غالی ہوئی انڈے میں۔ ان سے بچے کس طرح سے نکل سکتے ہیں؟" خان نے قدرے خفگی کے ساتھ کہا: "ابھی تو مچھلا آئے گا؟"

"اچھا! ابھی موصوف کو تشریف لانا ہے۔" عظمیٰ نے کہا۔ "لیکن اب کیا فائدہ؟"

وقت پر قطرہ بہت ہے ابر خوش ہنگام کا

جل گیا جب کھیت تب برسا تو پھر کس کام کا

"نہجی" ابھی تو اس کو برسنا ہے۔" خان نے کہا۔ "جب مچھلی انڈے دے کر چلی گئی

ناں صیب، تو مست مچھلا ادھر آیا، ان انڈوں کے ساتھ اپنا بدن ملایا۔ اس کے بعد، بس

الٹہ کی حکمت ہے صیب! اس نے اپنا خاص مادہ ان انڈوں پر پھیلایا دیا۔

"ہیں؟" عمر نے چیخ کر کہا۔

"ہاں صیب! بس وہ مادہ سارے انڈوں پر پھیل گیا اور مچھلا چلا گیا۔ اس کے بعد

جی: خان بولا۔ "دیکھا کاتیر پانی اس مادے کو انڈوں پر سے دھو دیتا ہے۔ زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا

مادہ۔ بس پانچ سات منٹ میں انڈے دھل جاتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" عا د نے پوچھا۔

"بڑا زہریلا مادہ ہوتا ہے صیب! تیزابی۔ پانچ منٹ سے پہلے پہلے انڈوں کی

باریک جھلی میں اتر جاتا ہے۔ زیادہ دیر پڑا رہے، تو سارے کے سارے انڈے ٹر

جائیں، تباہ ہو جائیں۔"

"مچھلی مچھلی کی ملاقات نہیں ہوتی خان؟" عمر نے پوچھا۔

"ناں جی! اس کو کیا پتہ کون سی مچھلی کے انڈے ہیں اور مچھلی کو کیا پتہ کہ کون مچھلا انڈوں پر اپنا

مادہ ڈال گیا۔ یہ دیکھتے یہ ہمارا ٹرے ہے۔ اس میں ہم انڈے لیتے ہیں:

لکڑی کا کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا، ایک فٹ چوڑا اور تین انچ لمبا ڈبّا تھا۔ اس کے چاروں طرف

مچھر جانی لگی تھی۔ ڈھکنے کے فریم میں بھی لگی جانی تھی، صرف پینڈا لکڑی کا تھا۔ ایسے دو تین ٹرے

دیوار کے ساتھ لٹک رہے تھے اور ان سے مچھلی کی بسانڈا آ رہی تھی۔

خان نے کہا:

"ہم انڈوں پر آئی ہوئی مچھلی تالاب سے پکڑتے ہیں اور اس کے پیٹ پر سیدھے ہاتھ

کی دو انگلیوں کا دباؤ ڈال کر سارے انڈے اس ٹرے میں دلو لیتے ہیں۔"

"ٹھہرو، ٹھہرو۔ ایک منٹ، ایک منٹ۔ عمر نے بے چین ہو کر کہا۔ "آپ مچھلی تالاب

سے باہر نکال لیتے ہیں کھلی ہوا میں؟"

"ہاں جی بالکل کھلی ہوا میں، لیکن ہم تالاب کے کنارے مچھر کریل کرتے ہیں، اتنی جلدی

مچھلی مرقی نہیں صیب۔ پھر صیب یہ ٹرے سارا انڈوں سے بھر جاتا ہے۔"

"تیزی سے گرتے ہیں انڈے؟" مسعود نے پوچھا۔

"بالکل فز کلاس۔ بڑی تیزی کے ساتھ۔" خان نے جواب دیا۔

"جب یہ ٹرے انڈوں سے بھر جاتا ہے، تو پھر ہم ایک مچھلا تالاب سے نکالتے ہیں اور

اس کی پوچھ ان انڈوں پر کر کے اس کے سر سے پوچھل کی طرف دو انگلیوں کا دباؤ اسی طرح ڈال کر نیچے تک جاتے ہیں۔

اس نے بتایا کہ ہم پچھلے کا سراپنی ٹھوڑی اور منہ کی ہڈی کے درمیان دبالتے ہیں۔ ہائیں ہاتھ سے اس کا بدن کھٹکتے ہیں اور سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں کا دباؤ اس کے پھلتے پیٹ پر ڈالتے ہوئے نیچے کی طرف جاتے ہیں۔ مطلوبہ مادے کی ایک پچکاری جلتی ہے اور رڑے میں رکھے ہوئے سارے انڈے تھڑ جاتے ہیں۔

جب خان یہ بات بتا رہا تھا، تو اس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور وہ ہنگامی کا ایک بوڑھا وائیلنٹ لگ رہا تھا جو اپنی جوانی کے زمانے میں بڑے بڑے اوپلین وائیلن کھاتا رہا جو۔ ہم سب خاموشی سے اس کے چہرے کے طرف دیکھ رہے تھے۔ کوٹھڑی میں سناٹا تھا اور وہ ابھی تک اپنے خیالی پچھلے کو اسی طرح گلے لگائے کھڑا تھا، حالانکہ سارے انڈے کبھی کے تھڑ چکے تھے۔

”پھر صیب ہم پچھلے کو واپس چونچتے میں چھوڑ کر پانچ سات منٹ تک اس مادے کو انڈوں پر رہنے دیتے ہیں۔ اس کے فوراً بعد یہ رڑے گیارہ نمبر چونچتے میں ڈال دیتے ہیں جہاں دریا کا ٹھنڈا پانی ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل رہا ہے۔ پانی جالی یس سے گزر کر سارا مادہ دھو دیتا ہے اور انڈے نیچے پیدا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

اعظمی نے کہا:

”سمجھ گئے مسو دیہ ہے اصل ٹیکڑی بچے پیدا کرنے کی۔

عمر نے چڑ کر کہا:

”یار تم بیچ میں بکواس نہ کیا کرو... اچھا خان صاحب پھر“

”پھر کیا جی۔ پھر جب ان سے لار واخل آتا ہے تو اس کو نمبر ایک چونچتے میں سے نکال

کر نمبر دو میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر آگے۔ پھر آگے۔ بس اس طرح سے کام چلتا رہتا ہے۔ انڈے کی حکمت ہے صیب۔

شیر باز نے جیب روک کر کہا:

”کلمہ پڑھو یا راتم گلیشٹر پر سے گزرنے لگے ہیں۔“

ہم سب اپنے اپنے خیال سے چونکے۔ میں نے جیب سے اترنے کی کوشش کی، لیکن اس خیال سے چپکا ہینا ربا کس جتنی بزدل کہیں گے۔ اپنی بزدلی کو چھپانے کے لیے انسان کو بڑے رنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ ان سب میں سے بڑا اور آخری رنگ وہ ہے جب آدمی خوف کے مارے مستقل طور پر بہادر بن جاتا ہے اور بہادری کے کارنامے سرانجام دے کر اس جہان سے چلا جاتا ہے۔

مختنڈی ہوا کا ایک طوفان سا اٹھا۔ ہمارے کپڑے اڑنے لگے۔ جیب گلیشٹر پر سے غاؤں غاؤں کرتی گزری تھی۔ میں نے پڑھا تھا کہ گلیشٹر جہاں سے سیاہ رنگ کا ہوا اس پر نہیں جانا چاہیے۔ جیب جہاں چل رہی تھی وہ برف بالکل سفید تھی۔ میرے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ کر عماد نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور کہا:

”شاہ جی! یہ گلیشٹر نہیں، یہ تو پہاڑوں کے درمیان جی ہوئی برف کے تودے ہیں جو پھسل کر سڑک پر آگئے ہیں۔“

میں نے لگا میں اوپر اٹھا کر دیکھا، اونچے پہاڑ کی کول کوئی رالوں کے درمیان سفید برف جی ہوئی تھی اور دودھ دودھ رنگ کے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ میں نے کہا:

”مفتی جی! یہ پہاڑ کس قدر فوجی ہے؟“

”نہ نہ نہ“ عماد نے تڑپ کر کہا۔ ”گلیشٹر اور گلیشٹر کا علاقہ فریڈ نہیں ہوتا، بڑا سخت

اور ریل ہوتا ہے۔ برف جب بھی پہاڑوں پر پڑتی ہے گچھل جاتی ہے یا کم ہو جاتی ہے لیکن گلیشٹر کبھی ختم نہیں ہوتے۔ تمہیں پتہ نہیں کہ ایک گلیشٹر دن میں چھ انچ سے لے کر ایک فٹ تک پھلتا ہے۔“

عماد نے کہا:

”مفتی جی! میں بھی گلیشیا لوجی کے بارے میں کوئی زیادہ علم نہیں رکھتا۔ میرا مطالعہ جی عام ڈائجسٹوں تک محدود ہے، لیکن یہ ہے حقیقت اور سائنسک بات کہ جب تک برف کے

دوسری اور بعض تو دسے نہیں، برف کی تحلیل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور جب یہ دو بل جائیں، تو ان میں ابدیت آجاتی ہے۔ پاکستان کا سیاچن گلیشئر کوئی چھ میل لمبا ہے اور یوں سمجھ لیجیے کہ مشرقی قراقرم سے لے کر وسطی قراقرم تک چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ہس پار اور بانو کے گلیشئرز ہیں۔
”مضیٰ نے کہا:

”اور یہ کب سے ہیں؟“

”ان کی عمر کا تعین نہیں کیا جاسکتا، عمار نے کہا۔“ جب سے قراقرم کا یہ سلسلہ موجود ہے۔ ہزاروں، لاکھوں بلکہ اس سے بھی زیادہ سال گزر چکے ہوں گے زراور مادہ برف ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے لیٹے ہیں اور ہزاروں آدمی یہاں سے زراوان حاصل کر چکے ہیں۔“

عمار نے کہا:

”یار مثنیٰ! میں نہیں کہتا تھا، پہاڑ عظیم ہوتے ہیں، عاشق ہوتے ہیں، محبت ہوتے ہیں، محبوب ہوتے ہیں، تم لوگ میری بات نہیں مانتے تھے۔“

”یاد تیری بات تو ہم کبھی چودہ برس سے مان رہے ہیں۔“ عمار نے ہنس کر کہا۔

شیر باز ہماری اس گفتگو سے بالکل کٹ کر اب جیب چلا رہا تھا اور اس کی نگاہیں سامنے سڑک پر تھیں۔ ایک مرتبہ اس نے کچھ بتانے کی کوشش بھی کی، لیکن ہم نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ وہ چار سڑک کا رہنے والا تھا اور ہم کو سیاسی گفتگو میں الجھنا چاہتا تھا۔ لیکن اب ہم اس کی گرفت اور سطح سے بہت دُور نکل گئے تھے۔ اس کے ساتھ جو محبت اور لگائیت سفر کے شروع میں پیدا ہوئی تھی وہ اب کم ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ ہماری منزل قریب آ رہی تھی اور منزل قریب آ جانے پر مسافر ایک دوسرے سے اور سارا بن سے دُور ہونے لگتے ہیں۔ منزل بھی کیا محبوب ہے کہ جب قریب آجاتی ہے تو محبت کرنے والے ایک دوسرے کے رقیب بن جاتے ہیں۔

میں نے رقیبوں کو محبت کی آگ میں جلتے اور جسم ہوتے دیکھا ہے۔ پھر ان کی راکھ کو کئی کئی دن اور کئی کئی مہینے دیرانوں میں اڑتے دیکھا ہے۔ ان لوگوں سے بھی ملا ہوں جو محبت کی آگ میں ٹنگے رہتے ہیں اور جن پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راکھ کی ہلکی سی تہ چڑھ جاتی ہے، پھر اور وقت گزرنے پر دُور پار سے ہوا کا کوئی جھونکا گزرتا ہے، تو ان کی یہ راکھ جھڑ جاتی ہے اور ان کا رے پھر دہکنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی میری زندگی سے گزرے ہیں جو چُپ چاپ محبت کے سمندر میں اتر گئے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ لوگ بھی ہیں جو کاروبار کرتے ہیں، دفاتروں میں بیٹھے ہیں، دربار دکتے ہیں، ڈیم بناتے ہیں، ٹینک چلاتے ہیں اور محبت کی ایک بند ڈیا بہر وقت اپنے سینے کے اندر محفوظ رکھتے ہیں۔ مسافر سناج، کوہ پیا، دشت نور و آب کسی کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ قاہرہ کے ایئر پورٹ پر جہان لین اینا بریف کیس گود میں ڈال کر بیٹھا تھا، سیاسیات کا ایک نمبر پروفیسر تھا جو ٹوکیو یونیورسٹی میں لیکچر دینے جا رہا تھا۔ اس کے عمر رسیدہ دل پر اس پھر سے بدن کی لڑکی کا بوجھ تھا جو حال ہی میں تھیسس اس کی نگرانی میں مکمل کر کے فارغ ہوئی تھی اور جس کا منگیا تیرا سے ہر روز یونیورسٹی سے لینے آتا تھا اور وہ سکڑ پر اس کے پیچھے اس کے شلے سے گال لگا کر بیٹھتی تھی۔ ان دونوں کے روانہ ہونے سے پہلے پروفیسر ہمیشہ اپنے کمرے کی کھڑکی پر پردہ کھینچ دیا کرتا تھا۔

دراصل محبت کے لیے ایک خاص فضا، ایک خاص علاقہ، ایک مخصوص ECOLOGY کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے دو دلوں کی یاد، دو دلوں کے ملنے کی احتیاج نہیں ہوتی، ایک خاص پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ دراصل پس منظر بھی مناسب لفظ نہیں۔ یہ تو آدمی کی سوچ محدود کر دیتا ہے۔ اس کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے جس کا ابھی ہم نام تجویز نہیں کیا جاسکا۔ الفاظ بھی کیا بڑھئی کے اوزار ہیں کہ خیال کو چھیل چھال کر کاٹ کر زندہ سالکا دیتے ہیں۔ اور اس کا تہ گٹھا دیتے ہیں ہم بھی کیا لوگ ہیں کہ ان دونوں کے سہارے تصور کی فصیلوں پر لیٹا کر کرتے ہیں اور اپنے جانے تلے نفع کر لیتے ہیں۔

آپ نے سبزی منڈی دیکھی ہوگی جہاں سبزی کی خرید و فروخت کا کاروبار ہوتا ہے۔
 باہر سے رہنے والے اور گڈیں اور ٹرک بھر بھر کر سبزی آتی ہے۔ مکملے صحن میں انبار لگ جاتے
 ہیں۔ تاجر، اڑھتی، کسان، زمیندار، گجرٹے ان انباروں کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ سب پر
 تک یہ انبار نہیں رہتے۔ سارے صحن میں گوجی کے بڑے بڑے پتے، موٹے موٹے ڈنٹھل پڑے
 ساگ اور پیاز کے چمکے پھیل جاتے ہیں۔ گند بھی ہوتا ہے۔ بوجھی، لیکن تازگی بھی ہوتی ہے اور
 کلوروفیل کی خوشبو بھی، پھر میاں چنڈر گائیں، گا بھن کبریاں اور ارحیل مرغیاں آجاتی ہیں پتے
 سٹھے لگتے ہیں۔ ڈنٹھل ختم ہونے لگتے ہیں۔ بیج چمکے جاتے ہیں۔ کچھ پیٹ بھرنے کی، کچھ شکر
 کرنے کی، کچھ آبکاری کرنے کی کیفیت ہوتی ہے، لیکن باسی اور تازہ سبزی کے خوشبو ضرور باقی
 رہتی ہے۔ یہی حال میلا منڈی کا ہے۔ یہاں بھی باسی، تازہ، سڑی ہوئی اور پڑا مردہ محبت کی بو
 باقی رہتی ہے۔ ان کوٹھوں پر چونکہ محبت کا کاروبار ہوتا ہے، اس لیے یہاں آنے والا شخص
 محبت کی لود میں ڈوبا ہوتا ہے۔ وہ چاہے اپنی بند ڈبیا اپنے ساتھ لائے یا اس جگہ کا ڈنٹھل
 اٹھا کر منہ میں ڈال لے، اُسے ڈبیا کھوٹی ہوتی ہے اور ڈنٹھل کا نمکین پانی نچکھتا ہوتا ہے۔ ان
 گندے گندے کرول میں، موٹے موٹے گندوں، میسے کھیلے قالینوں اور دیواروں پر لگے پیسے
 پیسے آئینوں پر محبت کی تہیں جمی ہوتی ہیں۔ محبت کا جھول ہوتا ہے، محبت کی باس ہوتی ہے۔
 یہاں کی عبادت میں لاکھ لاکھ کوشش کے باوجود اور کوئی خیال ذہن میں نہیں آتا، کوئی اور بنگوان
 اس مندر میں نہیں اُترتا۔

جب میں ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام کے سلسلے میں پہلی بار یہاں گیا، تو تنگ و
 تاریک چوبارے کی کھڑکی سے ذرا پرے بہت کر قالین کے ایک کونے پر بیٹھ گیا بڑی بی
 آئیں اور اپنے مخصوص انداز میں بولیں:

”ہائے شاہ جی آپ اوجھڑیں گریں پر“

میں نے مہاتما بدھ کی طرح ہلکا سا ہاتھ اٹھا کر کہا:

”جی نہیں، میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں“

پھر میں نے اپنے آنے کی غرض بیان کی اور ہم پروگرام کے بارے میں باتیں کرنے

لگے۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے بھرے بھرے بدن کی ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں
 کوکا کولا کی آدھی پی ہوئی بوتل تھی۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھی۔ ایک تکیہ اٹھایا اور میرے پاس
 آکر بولی:

”یہ لے لیں“

میں نے چپ چاپ وہ تکیہ لے کر اپنے زانو تلوں دبایا اور میری آنکھوں کے سامنے
 وہ تمام لڑکیاں گھوم گئیں جنہوں نے میری زندگی میں اپنے اپنے مقام پر مجھے تکیے دیے تھے عزت
 کی محبت کا سب سے بڑا منظر مر کوٹنگیہ دیا ہے۔ وہ کیسے بھی آرام سے کیوں نہ بیٹھا ہو، عزت
 اُسے سہارا ضرور دے گی، چاہے وہ سہارا کتنا ہی وقتی کیوں نہ ہو، چاہے وہ عورت کیسی بھی کاروباری
 کیوں نہ ہو۔ چاہے وہ قیام کتنا ہی متحرکیوں نہ ہو۔ طوائف ہو یا ایڑی پھس تکیہ ضرور پیش کرے گی۔
 میں اتنی دیر وہاں رہا میرے ذہن میں محبتوں کی یادیں ابھرتی رہیں۔ اپنی محبتیں، دوستوں کی محبتیں،
 قسے کہانیوں کی محبتیں اور میرے ذہن کی سبزی منڈی میں دھڑ دھڑک ڈنٹھل ہی ڈنٹھل پھیل گئے۔

جب میں اس چوبارے سے اُتر کر ایک دوسرے گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچا، تو اچانک
 میری نظریں چھت پر مرکوز ہو گئیں۔ بدبو دار ڈیوڑھی کی دھوئیں ہوئی چھت سے پڑندوں کے پڑوں
 کا ایک دبیز گڑا چٹا ہوا تھا۔ اس گندے میں جا بجا اڑے ترچھے گول گول سوراخ تھے جو کافی گہرے
 دکھائی دیتے تھے۔ میں نے اس سے پہلے ایسی کوئی چھت نہ دیکھی تھی جو بال و پر کے قالین سے
 مزین کی گئی ہو۔ اس قالین سے کچھ بال اور کچھ نرم نرم روئیں چھوٹ کر زمین پر بھی گری ہوئی تھیں۔
 میں نے زمین سے کچھ بال اٹھائے یہ جھک کر کپڑے کے پوٹے کے بال تھے اور ان کی چمک
 مدہم پڑ گئی تھی۔ ان کے ساتھ گوند کی ایک مڑی بھی تھی اور اس میں سے سیج کباب کی دھلی ہوئی
 سبکی کی مدہم سی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر ایک مرتبہ پھر چھت کو غور سے دیکھا اور ایک
 موٹا سا آدمی سانگلی پیٹ کے ساتھ لٹکائے میٹر جیوں سے اُترا، مجھے دیکھتے ہی اس نے گزرا پر
 اٹھا کر دعائیں دینا شروع کر دیں:

”دولا بادشاہ، سائیں بادشاہ، چنگ بھاگ سادے۔ بھلے لوک، کر م ناز“

میں نے ایک مستعد طالب علم کی طرح حیرانی سے پوچھا:

”یہ چھت پر کیا ہے؟“

”یہ گھونسلے ہیں بادشاہ... ابا بیوں کے گھونسلے“

”ابا بیوں کے گھونسلے! یہاں؟“

”جی بادشاہ! یہ قسمت والا گھر ہے۔ دو سال سے ابا بیل ادھر رہتے ہیں۔ بڑے اندرے بچے دیتے ہیں۔ بڑے سُریلے لوگ ہیں۔“

”میں نے کہا:“

”اب بھی رہتے ہیں؟“

”کیوں نہیں جی! اللہ فضل کرے!“ اس نے سادگی سینے سے دبا کر کہا۔ ”اب بھی رہتے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے انشاء اللہ“

”میں نے ان کے گھونسلے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ بڑے عجیب ہیں، کیسے بناتے ہیں؟“

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا:

”بادشاہ! یہ جنوروں، پرندوں کے پر جمع کرتے ہیں، پھر کسری سُریلے مکان کی چھت میں اپنے لمبا ب سے ان پروں کو چھپتے ہیں، چاروں طرف سے اور ایک کونے میں سوراخ چھوڑتے ہیں داخل ہونے کے لیے اور پھر اس کے اندر رہتے ہیں۔ پروں کی تھیل کے اندر یہیں اندرے بچے دیتے ہیں۔“

”میں نے کہا:“

”کمال کارگر لوگ ہیں۔“

”کارگر! میرے بادشاہ!“... اس نے محبت کے ساتھ کہا: ”بڑے سُریلے، بڑے کن رس جانور ہیں۔ بڑے گنی۔ اللہ نے ان کو بڑے مراتب دیے ہیں۔ جہاں پورے سُرگتے ہوں وہاں اپنے گھونسلے بناتے ہیں، جہاں بے سُرے لوگ رہتے ہوں وہاں سے ڈیرہ اٹھا لیتے ہیں۔“

”میں نے کہا:“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

وہ میرے قریب آکر زاردارانہ لہجے میں بولا:

”ابا بیل کو میرے بچے میرے سوتے ہوئے حضرت داؤد کی دُعا ہے۔ وہ سُر میں اڑتے ہیں، سُر میں تیرتے ہیں اور جہاں سُر ہوں وہاں گھر بناتے ہیں۔ اس گھر پر خدا کی بڑی رحمتیں ہیں۔ دونوں بیبیاں ایسے سُر میں گاتی ہیں کہ گنگنوروشنی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، جل جھجھ جل جھجھ نہیں کر سکتے... ایسے ہی گھر میں ابا بیوں کے گھونسلے ہوتے ہیں۔“

”تو یہاں کسی اور گھر میں ان کے گھونسلے نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہیں“ اس نے ایمان داری سے کہا... ”بی بی ممت از کے گھر میں ہیں اور کہیں نہیں۔“

”اور کہیں کیوں نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اور کہیں سُر جو میرے بادشاہ، تو ابا بیل گھر بنائیں۔ ٹکا دھم ٹکا دھم والے کوٹھوں پر۔ ابا بیوں کا کیا کام؟“

پھر مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے خود ہی کہنا شروع کیا:

”آج سے دو سال پہلے بی بی بختا ور کی دیوڑھی میں بڑے گھونسلے تھے ابا بیوں کے۔ شام کو ان کی والیسی پر ایک ٹنگمہ ہوتا تھا۔ بی بی نے دو نچے روشندان کھولائے تھے دیواروں میں ان کے آنے جانے کے لیے۔ بڑے خوش تھے میرے بادشاہ جانور اس گھر میں!“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”تینوں بیبیاں ٹٹے ٹٹے سُر میں تھیں میرے بادشاہ۔ دو کو ذات پاک نے وہ گلے دیے تھے کہ بڑے بڑے چچی راگ ان کے گلے سے نکل کر ان کے پاؤں پڑ جاتے تھے اور میری کو میرے مولا کی ذات نے پیر دیے تھے کہ ٹھیکے پر برکت ہوتی تھی۔ دھمک نہیں ہوتی تھی اور اس کے پروں کے نیچے کافر شس ابا بیوں کے گھونسلے کی چھت تھی۔ وہ ایسے سُر اور بیٹ کو چھوڑ کر کہاں جاسکتے تھے۔“

”لیکن آپ ہی تو کہتے ہیں کہ وہ اب گھونسلے نہیں رہے۔“ میں نے کہا۔

”بڑی نے ملتان کے ایک رئیس سے نکاح کر لیا۔ درمیانی نے نیلا ستوتجی کھا کر خودکشی کر لی اور تیسری فلموں میں چلی گئی۔ اب ہوٹل کے سیٹ پر ویسپ بن کر ناچتی ہے۔ میرے بادشاہ! اب ابابیل اس گھر میں کیسے رہ سکتے ہیں!“

نہیں نے منہس کر کہا:

”تو یہ ابابیل آپ کی راجدھانی میں ہی گھونسلے بناتے ہیں اور کہیں نہیں۔“

”ناں ناناں...“ اس نے گزوالے ہاتھ سے کان کو چھوا اور ادب کے ساتھ بولا:

”مسجدوں میں بھی گھونسلے بناتے ہیں میرے بادشاہ! لیکن ان مسجدوں میں جہاں کوئی شرملا موذن ہو۔ میرے مولا حضرت بلال ثعبی، جہاں مین کنستہ کھڑکتے ہوں وہاں نہیں بناتے۔“

دراصل تعلق خاطر کے لیے ایک خاص قسم کے ماحول، ایک خاص قسم کی فضا اور خاص نوعیت کے پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن سارے الفاظ پھر میری سوچ کو محدود دیکھے دیتے ہیں۔ محبت کے لیے کچھ ایسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اس کے لیے شاید بھی کوئی لفظ بنا نہیں۔ پہاڑوں پر بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ ان کی ٹھنڈک، ان کے سبزے، ان کی غنچت، ان کی دُھند اور بارشوں کی وجہ سے تمہیں ہوتا یا شاید انہی کی وجہ سے ہوتا ہو یہاں اگر بھی انسان محبت میں شرابور ہو جاتا ہے۔ بلا وجہ۔ بغیر کسی ارادے یا مقصد کے۔ بنا دیکھے سجالے۔ بڑیکسی پلان کے۔

شیر باز نے کہا:

”صیب! جب ہم یہ میوزم میں گئے تو آپ کو نارن کا یوتھ ہاسٹل نظر آئے گا۔ بڑے جتنی لوگ ٹھہرتے ہیں یہاں اگر۔“

”جتنی کون؟“ مسوونے پوچھا۔

”یہ جی اپنے جتنی نہیں ہوتے۔ انگریز لوگ۔ اپنا بستر مستر کر پابند کھڑک لاتے ہیں۔ بڑے خدائی خوش ہوتے ہیں۔“

”لیکن کرتے کیا ہیں خان؟“... عطا نے پوچھا۔

”خدا خبر کیا کرتے ہیں یا راجی۔ چرس سرس پیتے ہیں۔ بتا ٹکا کرتے ہیں... پیدل چلتے ہیں۔“

”بدعاشی نہیں کرتے؟“ عمر نے پوچھا۔

”پتہ نہیں جی کرتے ہوں گے۔ بدعاشی کرنے کو کون سا زیادہ ٹیم چاہیے۔ وہ دیکھو جی وہ: شیر باز نے کہا۔...“ وہ مین کی چھت نظر آرہی ہے ناں۔ وہی یوتھ ہاسٹل ہے۔“

جم سب نے گردنیں موڑ کر دیکھا۔ اونچی پہاڑی کی گود میں پتھر کی دیواروں اور ٹین کی چھت والا یوتھ ہاسٹل بادل کے ایک ٹکڑے تلے شرمندہ سا کھڑا تھا۔

”آپ ادھر ٹھہریں گے صیب یا ڈاک بنگلے میں؟“

”ڈاک بنگلے!“ ہم چھٹیوں نے ایک ساتھ کہا۔

”کون سے بنگلے میں صیب؟“

”فارسٹ ریٹ ہاؤس“ عطا نے جواب دیا۔ ہم نے اس کا بندوبست پنڈی جی سے کر لیا تھا۔ ادھر تاروے دیا تھا۔“

”تار گھر تو خراب ہے جی...“ شیر باز نے کہا۔... ”ابھی ادھر تار نہیں آتا، چپٹی مٹی آتا ہے۔“

”بس تو چپٹی پہنچ گئی ہوگی“ عطا نے اطمینان کے ساتھ کہا، کیونکہ یہ سارا انتظام اس کا تھا اور محکمہ جنگلات کے ایک بڑے افسر نے جو عطا کا دوست تھا اسے یقین دلادیا تھا کہ ہمارے جانے تک سارے انتظامات مکمل ہوں گے اور چوکیدار کمرے کھول کر ہمارا منتظر ہوگا۔... میں نے انتظار کرنے والوں کو دیکھا۔ انتظار کرتے کرتے سو جانے والوں کو بھی اور مر جانے والوں کو بھی۔ میں نے مضطرب نگاہوں اور بے چین بدنوں کو دیکھا ہے۔ آہٹ پر لگے ہوئے کانوں کے زخموں کو دیکھا ہے۔ انتظار میں کانپتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا ہے۔ منتظر آدمی کے دو وجود ہوتے ہیں۔ ایک وہ جگہ مقررہ پر انتظار کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو جگہ خالی سے جدا ہو کر پذیرائی کے لیے بہت دُور چل جاتا ہے۔ جب انتظار کی گھڑیاں دنوں مہینوں اور سالوں پر پھیل جاتی ہیں، تو کبھی کبھی دُور سرا وجود واپس نہیں آتا اور انتظار کرنے والے کا وجود

ہم سب نے رستوران کے دروازے کی طرف گردنیں موڑیں اور منظور نے خوش اخلاقی سے جواب دیا:

”جی سر! کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی!“

جب زندہ آدمی کا اندر جاتا ہے، تو وہ بڑا خوش اخلاق اور شائستہ ہو جاتا ہے اور شمع زندگی کے پروانے اس سے نور حاصل کرنے کے لیے دُور دُور سے اڑ کر آنے لگتے ہیں۔

جب ہم نارن کے فارسٹ ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تو وہاں کوئی بھی ہمارا منتظر نہ تھا۔ چونکہ ارکو ڈھونڈنا تو بہت چلا کہ وہ جیو پڑھنے گیا ہے۔ ہم نے اپنا سامان اتار کر برآمدے میں رکھا اور اخروٹ کے بیگے ہوئے دھنوں کا نظارہ کرنے لگے۔ مسعود، عمر اور عماد مجھ پر بڑھنے چلے گئے اور مضیٰ، اعظمیٰ اور نیس سامان کی رکھوالی پر بیٹھ گئے۔ گلیشیر کے ٹھنڈے پانی کی ایک کول اس ریسٹ ہاؤس کے گرد جھومر ڈال کر سامنے ترائی کی طرف مہر رہی تھی۔ برآمدے کے کمرے پر سفید چینٹ ابھی اچھی طرح سوکھا نہ تھا۔ فرش سلاٹھا اور ہم اپنے اپنے بستروں پر بیٹھے تھے۔

نارن پتھروں کا قصبہ ہے۔ سڑکوں پر پتھر، گلیوں میں پتھر، کھیتوں کی مینڈھوں پر پتھر، قبروں کے تعویذوں پر پتھر، کولوں کے کنارے پر پتھر، چھوٹے، بڑے، گول، چپٹے۔ پتھری پتھر۔ آپ راستوں پر اچھی طرح سے چل نہیں سکتے۔ کسی جگہ بیٹھ نہیں سکتے۔ قدم جاکر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ کسی سے بہت بھری گفتگو نہیں کر سکتے۔ شمر نہیں کر سکتے۔ لگنا نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ پتھر نہیں سکتے۔

میں سڑک کے بچوں بیچ چھڑی کا سہارے کر کھڑا تھا اور میرا دایاں پاؤں ایک پتھر کے سر پر تھا۔ اس پتھر کی منڈ سیاہ اور چمکدار تھی اور دُھوپ کی تمازت سے اس پر سینہ سا آیا ہوا تھا۔ شدت جذبات سے اس پتھر کی ٹہنیں پھیل گئی تھیں اور اس پر عجب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میں نے گھبرا کر اپنا پاؤں اس پر سے اٹھایا اور ناف کے آگے چھڑی لٹا کر اس کے سامنے خمیدہ ہو گیا۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔ پتھر میں حیات یا روح

اس خالی ڈبے کی طرح رہ جاتا ہے جسے لوگ ٹولے بھرت سمجھ کر سینت کے رکھ لیتے ہیں اور کبھی اپنے درمیان سے جھڈا نہیں کرتے۔ یہ خالی ڈبہ کئی بار بھرتا ہے۔ قسم قسم کی چیزیں اپنے اندر سمیٹتا ہے، لیکن اس میں ”وہ“ لوٹ کر نہیں آتا جو پذیرائی کے لیے آگے نکل گیا تھا۔ ایسے لوگ بڑے مطمئن اور پُورے طور پر شانت ہو جاتے ہیں۔ ان مطمئن پُرسکون اور شانت لوگوں کی پرسینیلیٹی میں بڑا چارم ہوتا ہے اور انہیں اپنی باقی ماندہ زندگی اسی چارم کے سہارے گزارنی پڑتی ہے۔ یہی چارم آپ کو صوفیا کی شخصیتوں میں نظر آئے گا۔ یہی چارم عمر قیدیوں کے چہروں پر دکھائی دے گا۔ اور اسی چارم کی جھلک آپ کو عمر رسیدہ پروفیسروں کی آنکھوں میں نظر آئے گی۔

میں ایسے ہی ایک پرنس چارنگ کو جانتا ہوں جسے بارہ برس تک اپنی محبوبہ کے خط کا انتظار رہا۔ اس کی تحریر کی ایک جھلک دیکھنے کی آرزو ہی۔ اس کے ہینڈ رائٹنگ کے خم و بیج کو ایک بار بھر سے دیکھ لینے کی تمنا رہی۔

ہم ایک چلنے خانے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بیرے نے زرد پتی کے پانچ پاؤں والا لافہ لاکر ہماری میز پر رکھ دیا۔ ایک پان میں نے نکالا، دوسرا منیر نے۔ پھر دو ہاتھ بیک وقت اس لافہ کی طرف بڑھے۔ ایک منظور کا اور دوسرا اُس چارنگ پرسینیلیٹی کا جس سے ہم اپنی اپنی جگہ بہت متاثر تھے۔ انہوں نے مسکرا کر کہا:

”لیجیے لیجیے اور پھر اپنا ہاتھ چپے کھینچ لیا۔

منظور نے اپنا پان نکالا اور آہستہ آہستہ پڑیا کھولنے لگا۔ پرنس چارنگ نے پاؤں والا لافہ اٹھایا۔ اُسے غور سے دیکھا اور پھر لافہ میز پر رکھ دیا۔ یہ لافہ نہ بی اے ہاؤس ٹیسٹ کے اس پرچے کا آدھا ورق تھا جو اُن کی محبوبہ نے دیا تھا اور جس کے ایک کونے پر شمرخ پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ اس تحریر کی تلاش میں ان کا ایٹرل وجود اتنی دُور نکل گیا تھا کہ اس کے واپس لوٹنے کی ساری آمیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بڑی شائستگی سے مسکرا کر کہا:

”آج کی بارش تو کچھ لمبی ہی ہو گئی۔“

تو نہیں ہے، لیکن تمام مخلوق خواہ بولنے والی ہوں یا خاموش۔ اپنے خالق کے بارے میں ضرور فیصیح زبان سے کہے گی کہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاد کے دو پہلو ہیں۔ ایک رُخ اپنے خالق کی طرف جس میں وہ اللہ سے واقف، اللہ کے صلح اور اُس کے عبادت گزار ہیں اور دوسرا رُخ مخلوق کی طرف۔ اس میں وہ نہ کچھ جانتے ہیں، نہ سننے ہیں نہ بولتے ہیں، مگر لوگ چونکہ جہاد کے ایک ہی رُخ سے واقف ہیں۔ اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بے حس پتھروں پر چل رہے ہیں اور بے جان زمین پر آ جا رہے ہیں، اگر انہیں دوسرے رُخ کا علم ہوتا تو ناممکن تھا کہ کوئی شخص کبھی بھی خدا کی نافرمانی کرتا یا اس کی حکم عدولی کرتا۔

مجھے نیک سے یاد نہیں، کوئی بزرگ متھے جنہیں فتح نصیب ہو چکی تھی اور وہ حضرت احمدیہ کے مزار کے قریب زیتون کے درخت تلے بیٹھے تھے۔ اچانک دیکھتے کیا ہیں کہ سارے پتھر کیا چھوٹے کیا بڑے اور سارے درخت اور ان کی ٹہنیاں اپنی زبان میں خُدا کے بزرگ و بزرگ تکیب پر بھڑ رہی ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ اس صبح کے سننے سے قریب تھا کہ میں ذکر بجاؤں اور پھر کبھی ادھر کا قصد نہ کروں کہ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے قریبی پتھر کی طرف غور سے کان لگائے، تو مجھے چند مختلف آوازیں سنائی دیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ پتھر تو ایک مگر آوازیں کئی، یہ کیا معاملہ ہے؟ پھر میں نے آنکھیں کھول کر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پتھر کئی پتھروں سے ترکیب پا کر ایک ہو گیا تھا اور ہر پتھر سے خُدا اُجداد آواز آرہی تھی۔ یہی لوگ کہتے ہیں کہ حیوانات کی دنیا میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ جب ایک بیل کسی دوسرے بیل سے ملتا ہے، تو دن بھر اُسے جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کا ذکر اپنے منے والے سے کرتا ہے کہ میں نے آج فلاں فلاں گھاس کھائی اور فلاں فلاں جگہ پانی پیا۔ فلاں فلاں جانور سے ملا اور فلاں فلاں خیال مجھے آیا۔ اسی طرح دوسرا بیل بھی اس کو جواب دیتا ہے اور دونوں اسی طرح باتیں کرتے رہتے ہیں جیسے ہماری گفتگو میں الفاظ اور مزج اور معانی ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی گفتگو میں حرف مندوف ہوتے ہیں یا ٹیوں سمیے ان کے حروف کو ہم سے مخفی کر دیا گیا ہے جیسے ایک کلر بلائنڈ کے لیے رنگ مندوف کر دیتے ہیں اور وہ ہر اُس شخص سے جھگڑتا رہتا ہے جس کو رنگ نظر آتے ہیں۔ ہم کو تو الفاظ نے اس قدر مجبور اور ایسا بھل کر دیا ہے کہ جب تک کسی اجنبی کی زبان

نہ آتی ہو، ہم اُس کی خاموشی کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتے۔

سورج کی چمک ایک دم غائب ہو گئی اور سارے ماران کو بادلوں نے گیر لیا۔ ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں۔ ہم پتھروں والی پگنڈی سے بھاگ کر پھر برآمدے میں آ بیٹھے۔ سامنے دو کوبستانی عورتیں تیز تیز قدم اٹھاتیں اپنی منزل کی طرف جا رہی تھیں۔ اعظمی نے چہرہ کی مٹھی پر سے ٹھوٹری اٹھانے بغیر کہا:

”دیکھ! دیکھ منشی۔ سالیوں نے عمر بھر ناران سے بڑا کوئی اور قصبہ نہ دیکھا ہوگا، لیکن دیکھ چل کس طرح رہی ہیں، کولے مٹکا مٹکا کر اور کھگھگھکا کر۔“

میں نے بھی ان عورتوں کو لپچائی ہوئی نظر سے دیکھا، تو منشی نے کہا:

”یارو! تم تو بے حد نالائق آدمی ہو۔ اس میں شہری یا پینڈو ہونے کی کوئی بات نہیں نفیس یا سیکس کا کوئی جھگڑا نہیں۔ یہ تو قدرت کے کھیل ہیں۔ عورت اپنی چھوٹی ٹانگوں کی وجہ سے چھوٹے قدم اٹھانے پر مجبور ہے۔ عورت کی ران کی ہڈی ایک بڑے اور کھلے پیلیس کے ساتھ جڑی ہوتی ہے اور اندر کی طرف مڑی ہوتی ہیں۔ ہڈی کے اس جوڑ کی وجہ سے اس کو ہر ٹولہ ہر قدم پر باری باری گھٹانا پڑتا ہے تاکہ آسانی سے چل سکے۔ اگر عورت تو احسنوں کی طرح سیدھی طرح سے چلنے کی کوشش کرے تو اس کے گھٹنے آپس میں ہر قدم پر ٹکرائے لگیں اور وہ ہر مرتبہ مرنے کے بل گر جائے۔“

ہم دونوں کو یہ بات سن کر بہت صدمہ ہوا اور افسوس ہوا کہ وہ ہیں دکنی کے لیے اس طرح سے نہیں چل رہی تھیں، پھر دُنیا نے ادب کے وہ سارے ٹکڑے اور سارے شعرا اپنی آب کھونے لگے جن میں کولے مٹکا مٹکا عورتوں کا چمکے دار ذکر کیا گیا تھا۔

غرض، مادا اور مسعود پھر پڑھ کر آ گئے۔ ان کے ساتھ ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار بھی تھا جسے انہوں نے مسجد سے اپنے ساتھ لیا تھا۔ چوکیدار بڑا سخت دل اصول پرست اور نمازی قسم بہ انسان تھا۔ سارے راستے عماد اس کی متنبی کرتا آیا تھا کہ میں ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کی اجازت دے دے۔ لیکن وہ کاغذ کے بغیر اور صاحب کی تحریری اجازت بنا کر کونہ لے کر رضامند نہ ہوتا تھا۔ ہم نے اپنا اپنا سامان کندھوں پر لا دیا اور چوکیدار سے مصافحہ کرنے کے بعد کسی اور

مسکن کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ مسکن دائمی ہوتے ہیں کچھ عارضی۔ کچھ لوگ دائم ایک در پر چھڑک کر طرح پرٹے رہتے ہیں کچھ لوگ بھری بس کے پیچھے اخبار کے ٹکڑے کی طرح بھاگتے ہیں۔ اور تھک کر کنارے سے لگ جاتے ہیں، پھر جب دیکھتا ہے تو اور سمت کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ دائمی لوگوں کے بدن بجاری، آنکھیں بڑی، کندھے چوڑے اور کولے وزنی ہوتے ہیں۔

ان کے معدے عام طور پر غراب اور ان کے بدن ریاچ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ عام طور پر ٹھنڈے، حاسد، جھوٹے، متکبر اور خود غرض ہوتے ہیں۔ عارضی لوگ چھریے بدن کے ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے سُتے ہوئے، پیٹ تنگ، سینے کٹادہ اور ماتھے زرخ ہوتے ہیں۔ یہ جگر اور گردے کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ بھی عام طور پر خود غرض، متکبر، جھوٹے،

حاسد اور ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ دائمی لوگوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ عمر بھر عارضی لوگوں کا روپ دھارنے کے پروگرام بناتے رہتے ہیں اور عارضی لوگوں کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دائمی لوگوں کی طرح زندگی گزارنے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ عارضی لڑکیاں میک اپ زیادہ پسند کرتی ہیں اور دائمی لڑکیاں زیور اور کپڑوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان سیز فائر کے باوجود جنگ ہمیشہ جاری رہتی ہے اور وہ اپنی اپنی حدیں پاٹ کر ایک دوسری پر شدید حملے کر جاتی ہیں۔ اس میں عام طور پر بیشتر نقصان مردوں کا ہوتا ہے۔ عین اس طرح جس طرح نظریات کی جنگ میں ہمیشہ آدمی مارے جاتے ہیں — نظریات نہیں۔

جم اپنی اپنی پٹنوں پر اپنا اپنا بوجھ لادے ایک عارضی مسکن کی تلاش میں نار ان کے بازار سے گزر رہے تھے۔ اور دکاندار، قلی، کسان، موچی، ترکمان، مولوی اور چرواہے ہیں اپنی اپنی نگاہوں کے ترازو میں تول رہے تھے۔ بازار میں ایک طرف آٹے دال، کھل، بنوئے، گھڑی ساز، غلیٹ بٹ، چلی کباب، چائے اور گھڑی سازی دکانیں تھیں اور دوسری جانب چلی کباب، صابن، خشک میوے، گھڑی ساز، بساطی، جیپ ٹائر، جیپ بیٹری، جیپ تریال ٹائی اور گھڑی سازی دکانیں تھیں۔ ان دکانوں کے باہر کچھ لڑکے سبز اخروٹ اور ملوکی بیج بے تھے اور ہر چار دکانوں کے بعد سڑک کے کنارے ایک موچی بیٹھا تھا۔ دیواروں پر مرزا پیوں کے

خلاف نعرے لگتے تھے اور دیواروں کے اندر پتھروں کی دراڑوں میں ہر طرح کے کیڑے مکوڑوں کے عارضی مسکن تھے۔ کچھ مکوڑے انڈے دے کر فارغ ہو چکی تھیں، کچھ حاملہ تھیں اور باقیوں کے یہاں ابھی نسل کشی کا سلسلہ جاری تھا۔

مفتی نے چلا کر کہا:

”اویں حرام زادو! آہستہ چلو، پتہ نہیں تمہارے ساتھ ستر سال کا ایک بوڑھا چل رہا ہے۔“

ہم سب نے پلٹ کر دیکھا۔ ہمارا ستر سالہ بوڑھا ایک نوجوان گجری اور اُس کے کم عمر بھائی کے ساتھ کھڑا تھا اور انہیں جیب سے کچھ نکال کر دے رہا تھا۔ مفتی یہیں روکنا نہیں چاہتا تھا، بلکہ میں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔

عمر نے کہا:

”دیکھا دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ اس کجنت کو ساتھ لے کر نہ چلو۔ یہ ہم سب کو دکھا دکھا کر اور ترسا ترسا کر مارے گا۔“

”اسی کی تو ساری برکت ہے عمر! مسعود نے اپنی مخصوص مہکلاہٹ میں جواب دیا اور پھر سر ہلا کر خوش دلی سے مسکرائے لگا۔

مسعود بڑا کمینڈ اور چھوٹے لیول کا دنیا دار انسان ہے لیکن وہ اپنے دوستوں کی خوبیوں اور ان کی صلاحیتوں کی دل کھول کر داد دینے کا عادی ہے۔ سامنے ہو تو شاید شرما جائے، لیکن پیٹھ پیچھے اس کو اپنے دوستوں کی ثنا کرنے میں بڑا لطف آتا ہے اور وہ بڑی ایمانداری اور خلوص نیت کے ساتھ اس لطف کے چمکے لیتا رہتا ہے۔ پچھلے سال کے مقابلے میں اب عداوت بھی مسعود کی اس خصلت کا رنگ چڑھنے لگا ہے اور وہ بھی اس لطف میں گھٹنے گھٹنے ڈوب چکا ہے۔ ایک میں اور عمر اس دائرے کا برہ گئے ہیں۔ عمر چونکہ سادہ لوح اور عاشق مزاج انسان ہے، اس لیے وہ اس دائرے میں گود بچا نہ کر آتا ہے، لیکن میں کبھی اس کھیل میں شریک نہیں ہوا۔ مجھے شروع ہی سے غیبت اور منافقت پسند ہے اور میری آنانے آج تک کبھی یہ برداشت نہیں کیا کہ میرے ہوتے ہوئے کسی اور کی تعریف ہو کسی اور کی بات ہو اور اس

گفتگو میں میرے ہی دوست شرمیک ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اخلاقی طور پر یہ ایک بُری اور قبیح عادت ہے، لیکن یہ عادت میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے، میں اس مسئلے کی طرح جو میرے دائیں گال پر ہے اور جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

خان بابا سے ہم نے دو کوٹھڑیاں کر لئے پر لیں۔ آٹھ روپے پوئیسہ کے حساب سے۔ ہر کوٹھڑی میں تین چار پائیاں تھیں۔ مفتی مسعود اور میں ایک کوٹھڑی میں۔ غلٹی، غر اور عا دودری کوٹھڑی میں۔ درمیان میں لکڑی کی دیوار تھی۔ لکڑی سوکھ جانے سے جوڑوں میں بڑی بڑی دراڑیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ باسانی بات کر سکتے تھے اور ایک دوسرے کو کپڑے بدلتے ہوئے بھی دیکھ سکتے تھے۔ دراصل اس دیکھنے کا احساس ہمیں عمارتوں نے دلایا جو ہر مرتبہ پانچ ماہ بدلتے ہوئے آواز لگایا کرتا تھا کہ ادھر نہ دیکھنا، میں پتلون آتا رہا ہوں۔ اس کے جواب میں مفتی ہمیشہ عینک لگا کر کہا کرتا تھا:

”بدل بدل، ہم نہیں دیکھ رہے۔“

جب ہم ان کوٹھڑیوں میں اپنا اپنا سامان قریب سے فرش پر لگا کر چار پائوں پر لیٹ گئے، تو پہاڑوں کی چوٹیوں سے شام اُترنے لگی۔ میں نے تنگ دازے سے باہر جھانک کر دیکھا اور ریڈیو یا ناؤنسر کی طرح اعلان کیا:

”آئی شام آئی شام آئی شام۔“

مسعود نے سر ہلا کر کہا:

”واہ!“

میں نے کہا:

”یہ میرا فقرہ نہیں مسعود! یہ اُردو کے ایک بہت بڑے افسانہ نگار رفیق حسین کا فقرہ ہے۔“

”رفیق حسین!“ مفتی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”رفیق حسین کون؟“

میں نے کہا:

”میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“ ساقی میں اس کے افسانے چھپتے تھے۔

بعد میں ایک کتاب آئینہ حیرت کے نام سے شائع بھی ہوئی۔ میرے پاس تھی، پتہ نہیں کون لے گیا، لیکن اس سے بڑا افسانہ نگار اردو کو اب تک کوئی نہیں ملا۔

میرے اس دعوے کو مسعود اور مفتی دونوں نے باطل جانا اور رفیق حسین سے لائقیت کا انکار کر کے خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد مسعود بولا:

”پتہ نہیں کیا افسانہ نگار ہوگا، لیکن یہ فقرہ غضب کا ہے: آئی شام، آئی شام آئی شام“

باہر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی اور شام سیاہ رنگ کے گھبرے کی طرح خاموشی سے قدم اُٹھاتی ہماری چوکھٹ کے باہر آکر بیٹھ گئی۔ پہاڑوں کی شام محبت کرنے والی عورت کی طرح ہوتی ہے۔ خاموش، اُداس، UNDEMANDING شفیق اور کرناک۔ اس کے وجود سے ویسی ہی خوشبو آتی ہے جیسے فرقت زدہ عورت کی لوٹی سے آیا کرتی ہے۔ اُلوں کی خوشبو، جسم کی خوشبو، رنگ کی خوشبو، آنسوؤں کی خوشبو۔ جس طرح گرمیوں کی شاہیں سردیوں کی شاموں سے مختلف ہوتی ہیں اسی طرح پہاڑ کی شامیں میدانی شاموں سے مختلف ہوتی ہیں، پھر پہاڑ کی اپنی شام ہوتی ہے۔ کسی میں دختوں کی بوباس شامل ہوتی ہے، کسی میں ندی نالوں کی، کسی میں پتھروں کی اور کسی میں رات کے جوہروں کی، خوشبو کے بارے میں اب تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ فلاں خوشبو خوشگوار کیوں ہوتی ہے اور فلاں ناگوار کس لیے۔ کہتے ہیں کچھ خوشبو میں شروع سے خوشگوار ہوتی ہیں اور کچھ ناگوار، اگر ایک دن دودھ پیتے بچے کی ماں کے پستان پر ہینگ لگا دی جائے، تو بچہ دودھ پینا چھوڑ دیتا ہے اور رونے لگتا ہے، لیکن اگر اسی پستان کو دودھ سے بھریا دیا جائے، تو وہی بچہ ہبک کر اُس کی طرف لپکے گا اور اُس سے چمٹ جائے گا۔ میرا خیال ہے بعض خوشبوؤں کے ایٹم ہوا اور ملائم ہوتے ہیں اور وہ ہماری توجہ شام کو مطلق عطا کرتے ہیں لیکن جن خوشبوؤں کے ایٹم نوکیلے ہوتے ہیں وہ ہمیں ناگوار گزرتی ہیں اور پریشان کرتی ہیں۔

نارن کی اس شام میں رات کے بہت سے ہمارا اور ملائم ایٹم شامل تھے اور ہم سب

”جی“

پھر انہوں نے انکھیں بند کر لیں اور انہیں اندر کی شام کے حوالے کر کے باہر کی شام میں چلا آیا۔

شام رات میں تبدیل ہو رہی تھی اور نارائن کے پہاڑ اندھیروں میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ لیڈر اپنی کٹ تبدیل کر کے ہمارے دروازے پر آگیا اور سوئی بھا کر ہمیں جگنے لگا۔ وہ ہمیں کمانا کھلانے لے جا رہا تھا اور ہم تھکاوٹ کی وجہ سے ایک قدم چلنے کو تیار نہ تھے۔ اس نے پیچ کر کہا:

”اُدھر وہ دونوں مردوں کی طرح لیٹے ہوئے ہیں۔ اُدھر تم تینوں نملائے وُملائے کھنٹانے پڑے ہو۔ اگر اسی طرح پہاڑ پر آنا تھا، تو مجھے پہلے بتا دیا جوتا۔“

”اس کو مارو! اُدھر عمارتوں نے نعرہ لگایا۔“

مارو۔

”پھر اُدھر کی عوام تو مر چکی ہے، مشرقی پاکستان کی“ اعظمی نے کہا۔ ”اب تمہاری باری ہے۔“

”یار عمر! مُفتی نے کبل کندھوں پر کھینچ کر کہا۔“ یہ کیسے بے حیا لوگ ہیں تمہارے پیرو ایک تم ان کی خدمت کرتے ہو۔ انہیں ہر سال سیر پر لے نکلتے ہو۔ دوسرے یہ تمہارا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسی لیڈی سے تو ڈوب مزہا بہتر ہے۔“

”یہ ہمارا لیڈر نہیں مُفتی جی!“ عمارتوں نے اپنی کوٹھڑی سے چلا کر کہا۔۔۔“ یہ ہپیوں کا

لیڈر ہے۔“

اس پر دونوں کوٹھڑیوں نے مل کر زور کا ایک نعرہ مارا اور مسعود اور اعظمی اپنی اپنی سٹولیں کھڑکی کی دیوار پر سجانے لگے۔ ہونٹ کا مالک خان بابا جاک کر آیا۔ اس کے ساتھ اس کا گونگا ملازم بھی۔ دونوں کے ہاتھ میں چیرٹھ کی جلی ہوئی کٹڑیاں تھیں جو وہ جلدی میں چولہے سے کھینچ لائے تھے۔

ہر ایک خوشگوار کیفیت طاری تھی مُفتی اپنی چارپائی پر نیم دراز پاؤں لگا رہا تھا۔ مسعود اپنے ہاتھوں کی کنگھی بنا کر سر ہانے کی جگر رکھے سیدھا شہر لیٹا تھا اور اس کی دونوں کھنیاں چھت کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے ابھی اپنے بوٹ اتار رکھے تھے اور بستر میں اُلٹی پلٹی مارے اپنے پاؤں دبا رہا تھا۔ ایسی ہی ایک شام کو میرے سب سے بڑے بھائی آفتاب فوت ہوئے تھے۔ وہ فوت تو رات کے وقت ہوئے تھے، لیکن ہم سب کو پتہ چل گیا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں رہیں گے۔ ان کا قد لمبا، بدن اکرا، بال سیاہ اور آنکھیں چمک دار تھیں۔ وہ البرٹ وکٹر کے گرو نمبر ۲ میں لیٹے تھے اور ان کی سانس سے پھلوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایسی خوشبو جو نہایت ہی ہموار اور ملائم اینٹوں کا مجھو تھی جس کی خوشگواہی میں موت کا پیغام تھا، آخری سلام تھا۔ ان کے کمرے کی بجی بھی تدم تھی اور ان کی آنکھوں کا نور بھی تدم ہوتا جا رہا تھا۔ میں ان کے سامنے اپنی آستینیں چڑھانے کو کرسی پر بیٹھا تھا اور میرا آستین چڑھانے کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ وہ میرا زور پر بندھی ہوئی چھوٹی سی بجی دیکھ لیں جہاں سٹوئی لگا کر آج صبح میرا ایک بوتل خون لیا گیا تھا۔ یہ خون میں نے بھائی جان کے لیے دیا تھا اور بوتل ابھی ہسپتال کی فریج میں بڑی تھی۔ خون دینے کے بعد میں ریڈیو سٹیشن پر ہر ایک کو اور گھر پہنچنے پر قدسیر اور نوکی کو بتا آیا تھا کہ میں نے بھائی جان کے لیے خون دیا ہے اور اس سے مجھے بڑی روحانی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ میرے ماں باپ میرے سکڑا رہے تھے، لیکن میرے بہن بھائی کچھ لائق سے تھے۔ اُنہوں نے ابھی قدسیر کے ساتھ بولنا شروع نہیں کیا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کا خاوندان کے بھائی جان کے لیے خون دے۔

بھائی جان تکیے سے سر لگائے کھڑکی کی طرف تکیے جا رہے تھے اور ان کی سانس سے پھلوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا، تو انہوں نے پوچھا:

”وہاں کون ہے، کھڑکی میں؟“

میں نے کہا:

”کوئی نہیں بھائی جان! شام اُتر رہی ہے۔“

”شام!“ انہوں نے مسکرا کر حیرت سے پوچھا۔ ”آنی جلدی؟“

مُنعتی نے تالی بجا کر کہا:

”لے یار عمر! تیرا مشعل بردار جلوس نکھنے کا انتظام ہو گیا۔“

پھر ہم سب اتنے زور سے ”لوڈی بچہ ہائے ہائے! لوڈی بچہ ہائے ہائے“ کے نعرے لگانے لگے کہ ساری وادی میں ایک کمرام ساٹھ گیا اور خان بابا اور اس کا گونگلا زم جلتی ہوئی لکڑیاں گججا کر واپس باورچی خانے میں چلے گئے۔ لیڈر دنیا بھر کی خلیط گالیاں دیتا ہوا جائے واردات سے غائب ہو گیا اور ہم اپنی اپنی چار پائیوں پر پھر خاموشی سے لیٹ گئے۔ گوجروں کے قافلے اپنا اپنا مال لے کر ہماری کوٹھڑیوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کچھ بوشیوں کے قدموں کی چاپ تھی۔ کچھ ان کے گلے میں بندھی ہوئی گنٹنیوں کی آواز کبھی کبھی اس قافلے میں ٹرانسٹر کے بول سنائی دے جاتے یا پھر پس منظر میں دریا کے گہراں کی تیز موسیقی تھی۔

عماد نے اپنی کوٹھڑی سے آواز دے کر کہا:

”مسعود!“

اور مسعود نے اپنی چار پائی سے جواب دے کر کہا:

”ہاں!“

پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر تک سب چُپ رہے، پھر مُنعتی بولا:

”لکھ لعنت ہو تم دونوں پر۔ ایک نے کہا مسعود۔ دوسرے نے کہا ہاں اور بات کوئی

ہوئی نہیں۔“

عماد نے کہا:

”مُنعتی جی میں نے اس کا جواب سنا ہی نہیں اس لیے خاموش ہو گیا۔“

مسعود نے کہا:

”اس نے ہنگامے کا جواب نہیں دیا اس لیے میں بولا نہیں۔“

اس پر ایک لمبی بحث چلی نکلی۔ اعظمی کہہ رہا تھا میں نے مسعود کا ہاں نہیں سنا۔ میں اور مُنعتی کہہ رہے تھے۔ مسعود نے ہاں کہا ہے۔ دونوں طرف سے تاویل دی جانے لگیں، لیکن کسی پائی

نے دوسری پائی کی بات نہ مانی اور جگڑا طول کینچ گیا، عین اسی طرح جیسے عید کے چاند چھکڑا اٹھا کرتا ہے۔ پشاور میں ایک دن پہلے عید ہو جاتی ہے۔ لاہور میں ایک دن بعد بحث مباحثہ کے درمیان کافی بد مزگی ہوئی۔ میں نے بیچ بچا ذکر کرنے کی کوشش کی، تو ہر ایک نے میری نیت پر شبہ کیا اور میرے کمرشل بی بیوئیر کو دل کھول کر گالیاں دیں۔ پھر ہم سب کے دل میں ایک دوسرے کے بارے میں جو جو شکوک و شبہات تھے وہ آہستہ آہستہ ابھرنے لگے۔ ہم سب نے اپنے اپنے شکوک کا دل کھول کر اظہار نہیں کیا، بس اشارے سے کرتے رہے اور دوسرے ان اشاروں کو اچھی طرح سے سمجھتے رہے۔ صرف مُنعتی نے اعظمی کو کھری کھری سنائیں اور اس کا بولنا بند کر دیا۔ یہ کھری کھری باتیں پچھلے تین چار سال کی غلط فہمیوں پر محیط تھیں اور مُنعتی انہیں چوگا کھلا کر اندر ہی اندر پاتا رہا تھا۔ اس وقت اعظمی نہ جگا سکتا تھا نہ کان بند کر سکتا تھا نہ کوئی اس کی مدد کر سکتا تھا۔

جب سب نے حسبِ توفیق اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تو دونوں کوٹھڑیوں میں خاموشی پھیل گئی۔ کوئی بیس منٹ تک سارے مجرمین اپنی اپنی چار پائیوں پر چُپ چاپ لیٹے رہے، پھر اعظمی جیسی آواز میں پکارا:

”مُنعتی جی!“

جی جن جی! مُنعتی جی نے پان ٹھوک کر کہا۔

”آج کھانے کو ٹھیکٹی!“

”آج غم کھاؤ!“ مسعود نے ہولے سے کہا۔

”شاہ جی سے چیز مانگوں ہیوال کا؟“ عماد بولا۔

”چیز میرے پاس ہے“ میں نے ایمانداری سے کہا۔ ”لیکن اتنا نہیں کہ ہم سب کا

پیٹ بھر سکے۔“

”خان سے دال ڈول لے لیتے ہیں“ مسعود نے رائے دی۔

”اس کے پاس کیا ہوگا اس وقت؟“ عماد بولا۔

”ضرور ہوگا“ اعظمی نے کہا۔ ”وہ جو جلتی لکڑیاں اٹھا کر لائے تھے، تو چرلے ہی سے

تولا لئے تھے۔

”جھولے پر چائے ہوگی۔“ میں نے دردناک آواز میں کہا۔

”اُونے بد ذاتو! مَرے کیوں جاتے ہو؟“ مُنفتی نے نیا پان کلتے میں دباتے ہوئے کہا۔
”ابھی لیڈر آجائے گا اور اس کی گود میں سامانِ خور و نوش ہوگا۔“

”لَعنت تیری سائیکا کوچی پر“ مسعود نے زور کا قہقہہ لگایا اور پھر تم سب گیدڑوں کی طرح

بولے:

”لَعنت لَعنت لَعنت“

جب گیدڑ بولنے بند ہوئے اور کوٹھڑی کے سارے چلتی ہوئی کوہل کے پانی کی آواز سنائی دینے لگی، تو عمامہ نے کہا:

”یا مسعود عشا پڑھ لیں“

مسعود اس کی بات کا جواب دیتے بغیر ٹوپسی مار کر چار پائی سے اُٹھا اور آستین چڑھانے

لگا۔

مُنفتی نے کہا:

”یار کتنی رکعتیں ہوتی ہیں اس نماز میں؟“

”بس مُنفتی جی! کیا نماز کیا رکعتیں“ مسعود نے اہستہ سے کہا۔۔۔ ”میتھا پھوڑی کرنا

ہے۔“

پھر وہ کوٹھڑی سے باہر نکلا اور آسمان کی طرف دیکھ کر سبّاری کے انداز میں بولا: ”وہی

وہی وہی۔ باہر تو بڑی سردی ہے۔“

اس کی آواز سن کر عمامہ بھی باہر نکل آیا اور دونوں کوہل کے کنارے بیٹھ کر برف کے پانی سے وضو کرنے لگے۔

مُنفتی نے اپنا مخزج صیح کر کے کہا:

”شاہ جی! سو گئے؟“

میں نے کہا:

”میں جی، جاگ رہا ہوں۔“

کہنے لگا:

”یہ نمازی لوگ بھی خوب ہوتے ہیں۔ میں ان کی دل سے عزت کرتا ہوں، لیکن ان کے ساتھ چل نہیں سکتا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے زندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”یہ نہ پوچھو پشہ جی!“ اس نے باوازی بلند کہا۔ ”میں نے زندگی میں جس آدمی کی بھی عزت کی ہے، اُس کے ساتھ کبھی نہیں چلا۔ میری عقیدت منور اس کے جلو میں رہی ہے لیکن میں کبھی اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔“

میں نے کہا:

”مُنفتی جی! یہ عزت بھی خوب چیز ہے۔“

کہنے لگا:

”اللہ اسے خوش رکھے، اس نے زندگی کے ہر مشکل مقام میں میرا بڑا ساتھ دیا ہے۔ میں نے جس سے بھی تعلقات منقطع کرنے چاہے، فوراً اُس کی عزت کرنا شروع کر دی۔ چند دنوں کے اندر، فریقین کی طبیعتوں پر بوجھ پڑے بغیر تعلق ٹوٹ گیا۔“

”اور وہ جو دھرم پورے کی اُستانی تھی... کیا نام تھا اُس کا؟“

”عالم بی بی۔ مُنفتی جی نے بولے سے کہا۔“

”اس سے تعلقات منقطع کرنے کا بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا تم نے؟“

”ناں نال نال! مُنفتی کہنی کے بل ہو کر بیٹھ گیا۔“ اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔ اس میں اُس جی کا کمال تھا جس نے یہ تعلقات ختم کر دئیے۔ دُور بیٹھے بیٹھے۔ یہاں سے پانچ ہزار میل دُور۔“

میں نے کہا:

”تم قدرت اللہ شہاب کی بات کر رہے ہو؟“

”بالکل۔“ مُنفتی نے عقیدت سے کہا۔ ”میں اس کی بات کرتا ہوں اور جی بجا کر کرتا ہوں۔“

”لیکن تم لوگوں کی نظروں میں اُسے کتنا ذلیل کرتے ہو، میں نے دیکھی ہو کر کہا۔
”ہوا کرے، میں کوئی کم ہوتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے لوگ مجھے ایک چھوٹے درجے کا خوشامی
نٹ پونجیا۔ مطلب پرست۔ افسر باز اور سائیکوفسٹ نہیں سمجھتے؟“

میں نے کہا:

”سمجھتے ہیں۔“

”پھر شاہ جی! مہنتی نے ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”لکڑی کے ساتھ جب لوہا لگتا ہے، تو ساری
لکڑیوں کو تیرنے نہیں دیتا۔ میں تو اس کو ذلیل کر دوں گا۔ اس نے میرے ساتھ کون سی بھلائی
کی ہے؟“

میں نے کہا:

”بھائی یہ محبت اور محبوب کی باتیں ہیں اور میری سمجھ سے باہر ہیں۔
”شاہ جی! وہ دوسری بات کرو!“ اعلیٰ نے اپنی کوٹھڑی سے ہانک لگائی۔ ”دھر پور
کی عالم بی بی والی۔“

”ہت تیری سوز زادے۔۔۔ مہنتی نے ہنس کر کہا۔ ”تو نے ادھر کان لگا رکھے
تھے۔“

”میرے کان تو ہر وقت آپ کی خدمت میں سوا دھان رہتے ہیں مہنتی جی!“ اعلیٰ نے
ہنس کر کہا۔ ”لیکن قہقہہ کب کا ہے؟“

”بتا بھئی!“ مہنتی نے مجھے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

”یہ پچھلے سال کا ہے اعلیٰ۔ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”یعنی جب مہنتی آرتھر سال کا تھا؟“ اعلیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہکو اس کرتا ہے۔ مہنتی نے ہنس کر کہا۔ ”اس وقت میری عمر پورے اڑسٹھ کی نہیں ہوئی

تھی۔ تین مہینے باقی تھے ابھی۔“

”ارے شاہ! اعلیٰ نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”میں بتایا ہی نہیں۔“

میں نے کہا:

”میں نے کون سا کھڑا پایا ہے اس تفتے سے جو تمہیں بتاتا۔ عجب مصیبت کے دن تھے۔
مہنتی منبعلے سے نہیں نہجتا تھا۔ ایک اکیلی میری جان، پھر اس بُڑھے کے تھامنے۔ میرے
تو بال سفید ہو گئے۔ خدا بھلا کرے احمد بشیر کا اور بانو قدسیہ کا جنہیں میں نے اپنے ساتھ شامل
کر کے کچھ بوجھ ملکا کیا؛ ورنہ یہ اب تک قتل کر چکا ہوتا۔“

”ہت تیرے کی شاہ۔“ اعلیٰ زور سے ہنسا اور اس کی ہنسی مہنتی کی ہنسی میں دب کر
رہ گئی۔

عالم بی بی پچاس پچاس برس کی خاتون تھی۔ چھٹی رنگ۔ چمکدار آنکھیں۔ فوجان چھب۔ کسی
ہوئی جلد، محبت بھرا دل، خوش گفتار، نہایت سیانی، نہایت متکا، نہایت بھولی۔ میں نے
آج تک کسی عورت کو اس کی طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دل چاہتا تھا وہ روتی رہے اور
آدمی بیٹھا اُسے دیکھتا رہے۔ اس کے سینے میں محبت کرنے والا دل اور اس کے دماغ میں
مرد کو قتل کرنے کے ڈیزائن بھرے تھے۔

”لوگ تو! کھاؤ، عمر ایک آدمی کے سر پر روٹیاں اور شوربے کی ڈیگی رکھو کر لے آیا۔
”اگیا اگیا اگیا۔۔۔ لیڈر اگیا۔ مہنتی نے زور کا نعرہ لگایا اور ٹمٹمے پڑنے لگی۔ اس کی نقل
آٹاری۔ پھر عمر بھاری کوٹھڑی کے اندر پڑے ہوئے میز کو اپنے رُوال سحاف کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ
اس نے کھانے کا سامان میز پر چننا اور بڑبڑانے لگا۔ دراصل وہ ہمیں گندی گالیاں دے رہا تھا اور
قسیمیں کھا رہا تھا کہ اگلے سال وہ ہمارا لیڈر نہیں بنے گا اور مہنتی آہستہ آہستہ لگنا کہہ رہا تھا:
”تو لیڈر بنے ہی بنے جیسے تجھے اس سے اچھے عوام اور کہاں ملیں گے۔ مہنتی کی یہ بات سن کر
وہ اور چپکٹا اور گالیوں کی بوچھاڑ تیز تر کر دیا۔“

اعلیٰ اپنی اون ٹوپی کا زون تک کینچ کر بیماری کوٹھڑی میں آگیا۔ اس نے آتے ہی بتایا کہ نازیوں
کی نماز بھی ختم ہونے والی ہے اور انہوں نے کھانے کی خبر رکوع میں جاتے ہوئے سن
لی ہے۔

مہنتی نے کہا:

”وہ آجائیں، تو کھانا شروع کریں گے، جب تک ہم ہاتھ دھو لیں۔ پھر وہ ہاتھ دھونے

باہر کھل پر چلا گیا، لیکن پانی میں ہاتھ ڈالے بغیر واپس آگیا، کیونکہ باہر سردی کافی تھی اور برف کا پانی اس لائق نہیں تھا کہ اس میں ہاتھ ڈالے جائیں۔

کھانا کھاتے ہوئے ہم سب خاموش تھے اور کھا پھکنے کے بعد نیند لانے لگے تھے۔ کسی نے کسی سے بات نہ کی، جن کو ہاتھ دھو لے تھے وہ صحن دانی لے کر کمرل پر چلے گئے جنہیں پونچنے تھے وہ بستر کے ساتھ پونچ کر لیٹ گئے۔ دونوں کو ٹھٹھوں میں چار پانیوں پر سگریٹوں کے جگنچھکنے لگے جتنی سو گیا۔ اُدھر سے بھی عمارت کے خزانوں کی آواز آنے لگی۔ مسود نے سگریٹ کا آفری ڈھاکو نے میں پھینکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا:

”اشفاق اب تیری عمر کتنی ہے؟“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، تو وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔

جب میں روم میں تھا، تو میری عمر ستائیس برس کی تھی۔ اُس وقت بھی میں ایک ایسی ہی کوٹھڑی میں رہتا تھا، لیکن وہ کوٹھڑی زمین پر نہیں تھی، بلکہ ایک اونچے مینشن کی چھٹی منزل پر تھی اور مجھے ایک سوسائٹیز چال طے کر کے اس میں پہنچنا پڑتا تھا۔ ایک کونے میں میرا بستر تھا۔ پانسی کی طرف چلی سٹینڈ تھا۔ کھڑکی کے پاس لکھنے کی میز تھی۔ اس کے ساتھ کپڑوں کی الماری اور الماری کے ساتھ ایک وارڈروپ جس پر میں نے سٹوولیمپ رکھا ہوا تھا اور جہاں میں صبح سویرے اُٹھ کر کافی بنایا کرتا تھا۔ ہر روز رات کو سونے سے پہلے مجھے اپنے گھر کے سارے لوگ باری باری سے یاد آتے تھے۔ ہر چہرے کے واضح نمایاں ہو جاتے تھے۔ ہر آنکھ میں شفقت کی فراوانی ہو جاتی تھی۔ ہر آواز میں محبت کا لہجہ بڑھ جاتا تھا۔ ہنس کا دباؤ گہرا ہو جاتا تھا اور ہر دباؤ کے ساتھ تنہائی کی مدت اور طویل ہو جاتی تھی۔ کچھ تنہائیاں اداس عمر کی ہوتی ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے لیے جتنی کا کام دیتی ہیں۔ کچھ اور ابرق تنہائی کی شیر گرم جدت سے کہنے لگتا ہے۔ ذرات گرم ہو کر ایک دوسرے کو پکڑنے لگتے ہیں اور کوہ ابرق بچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ نہ لگتا ہے نہ ڈوبتا ہے مسلسل جھکولے کھانے کے لیے ایک وجود بن جاتا ہے۔

میں آنکھوں پر جماعت کا غالب علم تھا اور ہمارے گاؤں میں میری بڑی آپا کی سیلی باجی سلنے آئیں۔ کیسی کالی میں پڑھتی تھیں اور ریاضی کی طالبہ تھیں۔ ان کے کالوں میں سر نے کی نازک اور مترنش

منشیں آویزاں تھیں۔ وہ جب بات کرتی تھیں تو یوں لگتا تھا جیسے منہس رہی ہوں، جب مطالعہ کرتی تھیں تو ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کسی کو یاد کر رہی ہوں۔ دونوں سیلیاں شام کے وقت جب کھیتوں میں سیر کرنے جاتی تھیں، تو سارے راستے فصیلت کے باب بن جاتے تھے مجھے سیدھے کھڑے ہونا، بالوں میں گنگھی کرنا، کنسیاں صاف کرنا اور انک میں انگلی نہ ڈالنا باجی سلمیٰ نے سکھایا تھا۔ وہ جتنے دن ہمارے گھر میں رہیں انہیں اپنے دوستوں کے ساتھ کھدو کھونڈی کھیلنے نہیں گیا۔ ماں کے ساتھ کبھی اونچی آواز میں نہیں بولا۔ آبا جی کے ہوت اُتروانے اور اُن کے سلیم پلانا کبھی نہیں بھولا۔ دراصل میں جو کام بھی کرتا تھا وہ باجی سلمیٰ کے نام معنون کر کے کرتا تھا۔ میری زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیاں، جو کچھ بھی تھا باجی سلمیٰ کے لیے تھا اور مجھے یقین تھا کہ ایک دن مجھے مرنا ہے اور لوٹ کر باجی کی خدمت میں پہنچنا ہے۔ گرمیوں کی جس صبح انہیں ہمارے گاؤں سے چلنا تھا وہ صبح بڑی گرم اور جال سوز تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ ہوا بند تھی۔ درخت خاموش تھے اور کھیت مہس کی وجہ سے ہانپ رہے تھے۔ گھر کے سب لوگ سلمیٰ باجی کو چھوڑنے سٹیشن پر گئے تھے اور گھر میں صرف میں اور اناں صوباں رہ گئے۔ ہر ایک میری اس بیوگی پر کہ میں باجی کو الوداع کہنے نہیں جا رہا، نالاں تھا۔ خاص طور پر میرے بڑے بھائی جو باجی کے ساتھ گھنٹوں علمی مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔

جب مجھے اپنے گھر کے اندر ریل کی سیٹی سنائی دی تو میرا اندر بالکل خالی ہو گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے وجود کے آریا رکھ رہا ہوں۔ میں آہستہ آہستہ کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھاؤا چیت پر آگیا۔ کچھوروں کے جھنڈ سے پرے پُرانی حویلیوں کے اُس پار ریلوے لائن تھی جو چیت سے صاف نظر آتی تھی، لیکن اس کا فاصلہ انچوں تک نہ تھا تھا۔ میں اپنے کوٹھے کے موکھے دار پر دسے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اینٹوں سے گھر کی خوشبو آ رہی تھی اور موسم میں رات کی باسی گرمی کا خمیر تھا، پھر ایک اور سیٹی سنائی دی اور اس کے ساتھ انہن کی جھک جھک جھک جھک کی آواز آنے لگی۔ حویلیوں کے کھنڈرات سے دراپلے سیاہ دھوئیں کا بادل اُٹھا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ سموڑی دیر بعد پھر انہن نے سیٹی بجائی اور سنہ پھولیا سی گاڑی کچھوروں کے جھنڈ سے باہر نکل آئی جھنڈ کے پیچھے آدھی گاڑی کو تو میں نے نہ دیکھا، لیکن اس کے بعد مجھ میں طاقت نہ رہی۔ میں

بہی ہوئی کچی چھت پر لیٹ گیا اور میری اڑیاں تیزی سے کھل کی چھت پر چلنے لگیں۔ اگر میں بڑی عمر کا آدمی ہوتا اور میری شہرہ لوں میں بچک نہ ہوتی تو میں یقیناً مر جاتا۔ میرے دماغ کی کوئی رنگ پھٹ جاتی اور میرے ناک منہ سے سیاہی نکل خون تیزی سے بہہ کر بائیں گال پر اترتا اور پھر زمین پر گر کر منجمد ہو جاتا۔ لیکن یہ کیفیت وقتی تھی۔ میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تک اسی طرح چھت پر بیڑا ہوتا اور لوٹیاں لگاتا رہا اور گاڑی اپنی منزل کی طرف چلتی رہی۔ یہ بے چینی یہ تڑپ یہ ذبح ہونے کی کیفیت بڑی تکلیف دہ تھی۔ لیکن اس تمنائی اور اداسی کے پانگ بھی نہ تھی جو سلمیٰ باجی کے چلے جانے کے بعد میرے وجود کے اندر آئی تھی میری حالت اس نا اڑی نے نواز دی تھی جو بانسری کے سولہاں میں چھوٹیں مار مار کر اپنے آپ کو بانسری سے زیادہ خال اور روزن دار کر چکا ہو۔ مجھے اپنے ارد گرد ہر شخص کی ذات ایک روح دکھائی دیتی تھی اور میں زندہ ہونے کے باوجود رُوحوں کے دریاں زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں ایک جو تک بن کر اپنے وجود کے ساتھ چٹا ہوا ستا اور میرے وجود کا خون ختم نہیں ہوتا تھا۔

جوانی کا دور بڑا رنگین اور پُر فریب ہوتا ہے۔ اس میں ضروری نہیں کہ آدمی محبت کرے اور اس شمر کی لذت سے آشنائی حاصل کرے۔ یہ وقت بجائے خود بڑا کیف پرور اور سُورہ انگیز ہوتا ہے، اس میں آدمی اور نہیں تو محبت کرنے والوں کے قریب ضرور رہتا ہے۔ مرتا نہیں تو کم از کم ان لوگوں کو ضرور دیکھتا رہتا ہے جن کے بدن موت کا فرش تھا اپنی نازک انگلی سے چھوتا اور انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ اس دور کا خالی ہاتھ انسان، محبت کرنے والوں کی تمنائی اور اداسی کی ٹھنڈک سے اپنے وجود میں ایک متقلب لکپی محسوس کیے جاتا ہے اور یہ لکپی چُپ چاپ اس لرزاہٹ کے ساتھ بل جاتی ہے جب وہ جسم مادر میں تھا اور اسے محفوظ و پُر سکون ہونے کے باوجود تمنائی کا شعور تھا، لیکن یادداشت بہت کمزور تھی۔

قیام رُوما کے دوران میرے پاس ایک نوجوان آیا۔ یہ پاکستان کے کسی بڑے محکمے میں اچھا افسر تھا اور ٹینک کے لیے الینڈ بھیجا گیا تھا، بالینڈ میں یو این او کے اس مخصوص کورس کے لیے دینا کے اور ملکوں سے بھی سرکاری ملازم آئے ہوئے تھے۔ ان میں تائیوان کی ایک

لڑکی وکٹوریہ بھی تھی جو چینی نژاد کرپین خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور انگریزی بڑی روانی کے ساتھ بولتی تھی۔ یہ پاکستانی نوجوان میرے پاس میرے کمرے میں کوئی ہفتہ بھر رہا اور ہر وقت وکٹوریہ کی باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنا کورس دو ہفتے پہلے ختم کر کے آگیا تھا اور وکٹوریہ کو ابھی ایک ہفتہ عواڑہ اور وہاں صرف کرنا تھا۔ جب وہ وکٹوریہ کے حسن و جمال اس کی مسکراہٹ اس کے تخر علی اور اس کی شفقت کا ذکر کرتا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی اداسی پھیل جاتی اور وہ روم میں ہوتے ہوئے ڈین ہاگ کی پڑیچ گلیوں میں اتر جاتا اور اس کا بایاں ہاتھ خود کلامی کرنے والے انسان کی طرح کھٹنے اور بند ہونے لگتا۔ ہم جب بھی باہر گھومنے کے لیے جاتے وہ کسی نہ کسی جگہ سے روم کا ایک دیکو کارڈ ضرور خریدتا۔ مجھ سے الگ ہو کر اس پر پتہ لکھتا۔ پیغام والی جگہ پر ایک دو سطر لکھتا اور کسی قریبی ڈاک خانے میں وہ کارڈ پوسٹ کر کے مجھے اعتماد دیں لینے کی عرض سے مسکراتا اور کہتا:

"وکٹوریہ کو لکھا ہے تمہارا بھی سلام بھیجا ہے۔"

میں نے اتنے بڑے شہر ایسے پُر رونق شہر، محبتوں اور نواہوں کے معمورہ اور کیپٹل آف داؤلڈ میں ایسا تنہا اور اداس آدمی کوئی نہیں دیکھا۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ باتیں کیا کرتا اور اندر سے غائب رہتا۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ روم کے گلی کوچوں میں گھوما کرتا اور غیر حاضر رہتا۔ اس نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا:

"میں نے سنا نہیں۔"

"میں نے دیکھا نہیں۔"

"میں نے خیال نہیں کیا۔"

"میری تو خبر نہ تھی۔"

اس کے باوجود وہ میرے ساتھ نہیں تھا میرے پاس نہیں تھا میرے روم میں نہیں تھا "اپنے پاکستان میں نہیں تھا۔ وہ محبت کا مارا نہ تھا، محبت میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھیں شرارت سے ناپا کرتیں، لیکن میں نے اپنی زندگی میں ایسا تنہا اور اداس نوجوان اور کوئی نہ دیکھا تھا۔ میں جب بھی اس سے وکٹوریہ کے بارے میں پوچھتا وہ بغیر کسی تاثر کے میرے ہر سوال

کا جواب دیتا۔ جب بھی از خود اس کا ذکر کرتا پوری تفصیل اور ساری مجزیات کے ساتھ کرتا۔ اس کے باوجود میرے اور اس کے درمیان تنہائی کا کوئی ہاتھ بھر کا فاصلہ رہتا اور میں اور سارا روم اور روم کے سارے بستے اور سارے کھلے اور اس کے باغات اور اس کے گورے بدروں کی لڑکیاں، کوئی بھی اس کی تنہائی دور نہ کر سکتیں۔ ایک ہفتہ میرے پاس قیام کرنے کے بعد وہ مجھ سے نکل گیا مگر نیپلز چلا گیا اور وہاں سے دفائی ہماز میں سوار ہو کر پاکستان روانہ ہو گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد مجھ پر اُداسی کا ایسا دورہ پڑا کہ میں نے یونیورسٹی سے پانچ دن کی رخصت لی۔ اپنا انچی کپڑا تیار کیا اور ہالینڈ روانہ ہو گیا۔ سہ پہر کے قریب میں ذین ہاگ پہنچا۔ تھوڑی دیر ہوئی میں سویا۔ پھر خاموشی کے ساتھ سگریٹ پیتا رہا۔ پانی پی کر ایک مرتبہ پھر سونے کی کوشش کی، لیکن نیند نہ آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا، تو معلوم ہوا کہ ابھی بیگ میں شام نہیں ہوئی۔ ذرا اٹھ کر ہوگی۔ میں بے مقصد بازاروں میں گھومتا اور دکانوں میں جھانکتا رہا۔ سائیکل چلائی لوگوں کو دیکھتا رہا اور جب شام ہوئی تو میں وکٹوریہ کی انسٹی ٹیوٹ میں پہنچا۔ وکٹوریہ اپنے کمرے میں تھی، لیکن اس نے کہا بھیجا کہ کمان کو ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھائیے، میں ابھی آتی ہوں میں ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھ کر رسلے دیکھتا رہا، پھر دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کی تفصیلات کا جائزہ لیتا رہا، پھر اپنی کرسی پر بیٹھا اور دوبارہ رسلوں کی تصویریں دیکھنے لگا۔ سامنے کا دروازہ کھلا اور سفید براق کپڑوں میں ملبوس وکٹوریہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ آگے بڑھا کر کہا:

”وکٹوریہ“

میں نے بڑی شائستگی کے ساتھ اس کے ہاتھ کی انگلیاں آہستگی سے دبائیں اور سلیقے کے ساتھ کہا:

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا نام اشفاق احمد ہے اور میں راحت کا دوست ہوں“

”راحت!“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”کیسا ہے وہ؟ چلا گیا یا ابھی روم

میں ہی ہے؟“

”چلا گیا“ میں نے کہا۔

”روم میں وہ تمہارے پاس ہی ٹھہرا تھا ناں؟“ وکٹوریہ نے کرسی میرے قریب کھینچی اور ہم بڑی آہستگی سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پھر وہ کہنے لگی:

”اُداس تو نہیں تھا؟“

”تھا۔ میں نے مڑھا کر کہا۔“ کچھ زیادہ ہی اُداس تھا۔ بہت ہی تنہا۔ ہر وقت تمہیں یاد کرتا تھا“

وکٹوریہ نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی سفید کلائی پر پریسٹ وائچ کی طلائی زنجیر ٹھیک کرنے لگی، پھر اس نے سر اٹھایا اور بولی:

”کب گیا؟“

میں نے کہا:

”روم سے تین دن ہوئے روانہ ہو گیا تھا۔ اب معلوم نہیں نیپلز بھی کچھ دن ٹھہرا یا نہیں“

”نیپلز!“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”کیوں؟ کیا ہوائی جہاز سے نہیں گیا؟“

میں نے کہا:

”نہیں، وہ تو بحری جہاز سے گیا ہے“

”اوہ موسیو اشفاق!“ اس نے دیکھی ہو کر کہا۔ ”اسے بحری جہاز میں نہیں جانے دینا تھا۔

کتنے دن لگتے ہیں پاکستان پہنچنے کے لیے؟“

”نودن!“ میں نے جواب دیا۔

”نودن اور نو راتیں وہ اکیلا رہے گا، اکیلا سوچے گا۔ اکیلا بیٹھے گا۔ یہ اس نے

کیا کیا؟“

مجھے وکٹوریہ کی باتوں سے کچھ کنٹرول قسم کی مضرب ہونے کا شبہ ہوا۔ وہ راحت کے بارے میں متفکر ضرورتی، لیکن اس کی پریش فی ٹیکنیکل قسم کی تھی۔ اس میں رُوح کا فقدان تھا اور بار بار

سر بلا بلا کر پہنچ کر رہی تھی۔ وہ کافی خواہش کرتی تھی اور اُس کی گردن عام چینی عورتوں کے مقابلے میں لمبی تھی۔ اس کے بال بالکل سیاہ تھے اور اس کی ناک اس قدر چھٹی نہ تھی۔ اب اس کے سفید لباس میں مجھے سیوں کے رنگ کی لکیریں بھی نظر آنے لگیں۔ وہ مبتلا میں مبتلا ضرور دکھائی دیتی تھی، لیکن اس قدر جھگ نہ تھی۔ اُسے دکھ ضرور تھا، لیکن وہ تنہا نہ تھی۔ اُداس نہ تھی۔ ہم بڑی دیر تک اسی طرح چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر اُس نے آہستہ سے پوچھا:

”خاور کے متعلق کیا کہتا تھا؟“

”خاور! میں نے حیرانی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔“

”خاور کے بارے میں اُس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“ وکٹوریہ نے گلا صاف کر کے پوچھا۔

”نہیں“ میں نے اعتراف کو جھپٹاتے ہوئے کہا۔ ”وہ کچھ کہتا بھی تھا اور نہیں بھی کہتا تھا۔“

”وہ بیمار ہے اور خاموش ہے اور اس کو رونا نہیں آتا۔“

”وہی خاوراں؟ میں نے دماغ پر جھوٹ ٹوٹ زور دیتے ہوئے کہا۔“ جواہر۔۔۔

کیا نام... اُدھر...“

”کراچی سے آئی ہے وکٹوریہ نے کہا۔ تمہارے پاکستان سے۔“

”اُسے وہ روم سے دیوکار ڈھونڈ بیجا کرتا تھا۔ میں نے اعتماد کے ساتھ کہا۔“ اس سے زیادہ اُس نے کوئی خاص ذکر نہیں کیا۔

”بڑا سنگ دل ہے تمہارا دوست!“ یہ کہہ کر وکٹوریہ پھر خاموش ہو گئی۔

ایک مرتبہ سانا ماریا ماجرے سے ٹرام میں سوار ہوتے وقت رش کی وجہ سے راحت کے کوٹ کا کالر اٹ گیا تھا اور اندر کی جیب میں احتیاط سے رکھا ہوا دیوکار ڈھونڈ بیجا تھا اس پر لکھا تھا۔

ٹومی دانی کہ سوزِ قراست تُو
وگرگوں کو دلتِ دیرِ عمر را!

میں اس وقت اس شعر کا مکمل استعمال نہ سمجھتا تھا، لیکن اب بیگ میں آجانے کے بعد اور وکٹوریہ سے مختصر سی ملاقات کے بعد بہت سی ٹوٹی ہوئی کڑیاں آپس میں ہتی جا رہی تھی۔ وکٹوریہ جنت کی محبوبہ نہ تھی بلکہ اس کی زرداں اور کونفی دانت تھی۔ اس نے ایک صبح ہوٹل میں خاور کے کمرے سے گزرتے ہوئے اسے تلاوت کرتے سنا تھا اور اس کا کافر دل ہمیشہ کے لیے مومن ہو گیا تھا۔ پھر وہ بھی اپنے کمرے میں اخبار بچھا کر فجر کی نماز پڑھنے لگا اور آہستہ آہستہ دونوں جاننا زکوٰۃ لے رُخ بچھا کر اکٹھے نماز پڑھنے لگے۔ جب انسانوں کے درمیان جسم کی محبت ہو تو وہ ایک دوسرے کی طرف مقناطیس کی طرح کھینچنے لگتے ہیں۔ جب ان میں آگئی اور دانش کی قدر مشترک ہو تو وہ لمبی سیروں، لمبے راستوں اور لمبے سفر کے ساتھی بن جاتے ہیں اور جب ان کی محبت پر رُوحانیت کا ابر اُتر آئے، تو وہ بستروں کے انبار میں دو محصور بچوں کی طرح ٹانے کی ایسی چادریں بن جاتے ہیں جس سے ان کی رہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ یا تو جینے کچھ کر مدد کرنے والوں کو بلاتے ہیں یا دم گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ یہی کیفیت خاور کی تھی۔

جب میں اور وکٹوریہ اس کے کمرے میں پہنچے، تو وہ عشا کی نماز پڑھ رہی تھی۔ ہم ایک کونے میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے سلام پھیر کر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ دُعا مانگی اور اُٹھ کر چلی پھرنے لگی۔ پھر اس نے جاننا زکوٰۃ کیا اور اپنے سر ہانے رکھ دیا۔ وکٹوریہ نے اس سے میرا تعارف کرایا، تو اس نے آہستگی سے ”السلام علیکم“ کہا اور پگ پگ پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے بات شروع کرنے کی کوشش کی، لیکن میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں نے ایسی تنہا، اس قدر اُداس، اتنی شانت اور ایسی کوئی لڑکی اپنی ساری عمر میں نہیں دیکھی۔ اس کا منگیترا پاکستان نیوی میں ملازم تھا اور اس نے کبھی کسی کا دل نہ دکھایا تھا۔ خاور بھی اس کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

یہی تنہائی جب ریگتی رنگتی عمر کے آخری حصے میں پہنچتی ہے تو آدمی انسانوں کی بولی سمجھنے سے قاصر ہونے لگتا ہے، پھر وہ بھولل ہے، جالوروں سے، دیواروں سے اور موتوں سے ڈانٹا لگ شروع کر دیتا ہے۔ ایک بھرے ہوئے گھر میں جہاں اس کی بے پناہ عزت ہوتی ہے، جہاں اسے بے پناہ مان دیا جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک پُرانی کرسی، اُدھر گھلے درتپے اور بند

کتاب سے قریب تر پاتا ہے۔ ان کی اُداسی میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب ان کے بچے ان کے لیے فادرز ڈے یا مدرز ڈے کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کی تنہائی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب گھر کے لوگ کسی اہم کام میں ان سے مشورہ لیتے ہیں یا ان کے فیصلوں پر سر جھکانے کے لیے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس عمر میں کوئی طویل بیماری اُن کی تنہائی کم کرنے میں سب سے بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ کچھ بدنصیب ایسی بیماریوں سے صحت یاب ہو جاتے ہیں، تو ان کا آخری سہارا بھی ٹوٹ جاتا ہے اور وہ تنہائی کی ڈوری سے کھینچتے نہی نفی کرتے نیستی کی آباد دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کی بات سمجھنے اور ان سے کلام کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اصل میں بکتر اور زعم کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے تنہائی، مفارقت اور ایکانت۔ بڑے بڑے دلیوں، قطبوں اور غولوں میں جب بکتر اور زعم کا بیج چھوٹنے لگتا تھا، تو انہیں تنہائی اور مفارقت کا داغ دے کر سنان وادیوں یا آباد شہروں میں جھوڑ دیا جاتا تھا، جہاں وہ کنجری بن کرنا چہنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور ناچ ناچ کر بارمنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ یہ تو دیوانے لوگ تھے، اگر کوئی معمولی آدمی بھی تخلیق کے کشمکش اور تخلیقی قوتوں سے آشنا نہ ہو تو دیوانہ کی طرح جلتے گی، اس کے ایمان اور اس کی خوشی کو گمن بن کر کھا جائے گی، تو پھر آہستہ آہستہ اُسے تخلیق کا عرفان ہونے لگے گا تخلیقی عمل کا شعور پیدا ہونے لگے گا۔

تنہائی، اُداسی، مفارقت اور ایکانت کے بارے میں سوچتا سوچتا میں بھی نیند کی وادی میں اترنے لگا۔ خان بابا کی کوٹھڑی کے اندر پہلے جیکریٹیکے پر سر رکھتے میرا بارہ کی دنیا سے جو تعلق تھا اُس کا آخری رشتہ ایک مینے کی آواز تھا جو میری نیند کی پہلی جھوک میں جذب ہونا جارا ہوتا تھا۔ صبح سویرے چھ بجے سے ذرا پہلے لیڈر سوئی لے کر ہماری کوٹھڑی میں آگیا اور ہمارے پیروں اور سروں پر بٹھولے مار کر ہمیں جگانے لگا۔ جارا لیڈر ایک روشن خمیر مستعد اور نیک نفس انسان ہے۔ اس کا دل جس قدر صاف ہے اسی قدر دماغ بھی صاف ہے۔ جب وہ

ایک پروگرام اپنے ذہن میں طے کر لیتا ہے تو پھر اس سے بال برابر انحراف نہیں کرتا۔ رات ہم نے پروگرام بنایا تھا کہ صبح سویرے بھیل سیف الملوک چلیں گے اور سارا دن وہاں گزار کر شام کے وقت واپس ناراد آئیں گے۔ آنے جانے کا بندوبست، دن بھر کا راشن پانی اور دوسری ضرورت کی چیزوں کا اہتمام اس کے ذمے تھا۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ وہ ان ساری چیزوں کا بندوبست رات کو سونے سے پہلے کر کے سوئے گا اور ہمیں اتنی جلدی جگانے آجائے گا۔ ہمیں اس کا بے وقت آنا بہت برا معلوم ہوا۔ خاص طور پر عماد اور مسعود کو جو فجر پڑھنے کے بعد پھر تہروں میں دبک کر سو گئے تھے۔ لیڈر کی سوئی کے ٹھکوروں سے مفتی بھٹا اٹھا اور جل کر بولا۔ ”عمر مزادے، پہلے نو جوانوں کو اٹھا پھر مجھے جگا۔ یہ کیا کہ سب سے پہلے میرے سر پر ہی ٹاپ کرنے لگ گیا ہے۔“

”وہ اٹھتے نہیں۔“ عمر نے صبح کر کہا۔ ”تم تو بیانے بیانے آدمی ہو تم تو اٹھو۔“

”میرا تو بھئی سونا نمبر ایک ہی ختم نہیں ہوا اور تم اُسی کی جان کے دشمن ہو گئے ہو۔ ابھی تو مجھے سونا نمبر دو شروع کرنا ہے۔“

مفتی کی ایک زالی عادت ہے۔ وہ جس کمرے میں جس بستر پر سوتا ہے صبح چار پانچ بجے وہاں سے اُٹھ کر کسی دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر پھر سو جاتا ہے۔ عام طور پر اس کا سونا نمبر دو فرش پر ہوتا ہے اور اگر فرش پر قالین یا دری وغیرہ نہ بچی ہو تو وہ دوسرے کمرے میں ٹنگوں پر میز پر یا کرسیوں پر جا کر سو جاتا ہے۔ پھر وہ دن چڑھے بیدار ہوتا ہے اور ننگے پاؤں ہر کمرے میں، ہر برآمدے میں گھومتا رہتا ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ اُسے چائے کا ایک بڑا گنگ نہ مل جائے۔ چائے پینے کے بعد اُسے اپنے ارد گرد کی چیز پر نظر آنے لگتی ہیں اور وہ خواب کی وادی سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ جاتا ہے۔ اگر اس کی یہ ڈرل پوری نہ ہو، تو سارا دن بیزارانہ چین اور تنگ دل رہتا ہے۔

اتنے میں گونگا پرائیڈوں اور انڈوں کی ٹرے لے کر آگیا۔ لیڈر کا حکم تھا کہ پہلے گلی کے ناشتے کر لو، اس کے بعد منہ ہاتھ دھونا اور شیو وغیرہ کرنا۔ ہم سب نے ہاتھ دھوئے اور شیو کرنے کو ناشتے

پر ترجیح دی اور اپنے اپنے بستروں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیڈر سے کہا ابھی چائے نہ بنوائے اور ہماری کٹوں کا معائنہ کر لے کہ ان میں جھیل سیف الملوک تک جانے کی تمام چیزیں ٹھیک ہیں یا نہیں۔ لیڈر ہماری کٹوں کا معائنہ کرنے چلا گیا اور ہم شیو کرنے لگے۔ جب مرد جوان ہوتا ہے تو اس کی شیو میں سب کو دلچسپی ہوتی ہے۔ خود اس کو بھی حجامت بنانے میں مزہ آتا ہے۔ لیڈر، سیفٹی، گرم پانی کا گنگ، خوشبودار صابن، برش، سماگ رات کے بعد عورت کو سب سے پیاری چیز مرد کا شیو کرنا لگتی ہے۔ دلن خواہ جاگ رہی ہو یا سوئی ہوئی ہو دو لہا کبھی بھی نسل خانے میں شیو نہیں کرتا، اپنی بیوی کے پلنگ کے پاس جھپوٹی میز لگا کر شیو بناتا ہے اور اپنا چہرہ دیکھنے میں دیکھتا جاتا ہے۔ مرد کو اپنے ذاتی استعمال کے سامان میں بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔ عورت کو دوسرے کو دکھانے کے سامان میں آئندہ آتا ہے۔

جب تک عورت مرد کا سامان رتہتی ہے وہ اس پر جان چھڑکے جاتا ہے اس کے لئے حلال ہوتا رہتا ہے جب وہ آزاد اور خود مختار ہو جاتی ہے تو مرد اس کی ایک آزاد اور خود مختار فرد کی حیثیت سے عزت کرنے لگتا ہے اور دونوں کے درمیان باہمی الفت کے بجائے تعظیم کا جذبہ کارفرما ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے شیو کا سامان ان کی بیویاں پیک کر کے رکھتی ہیں، کچھ کے اردلی اور ملازم یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔ باقی کے خود اپنا سامان دھو کر رکھتے ہیں اور کچھ انہیں اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں، اگلے دن کے لئے۔ بڑی عمر کا آدمی اکیلا اپنی شیو کرتا ہے۔ اس کے برش پکڑنے اور سینٹی چلانے میں کوئی خوبصورتی نہیں ہوتی۔ اس کے چہرے پر صابن کا جھاگ نہیں اٹھتا۔ ہلکے نیلے رنگ کا پچنگلی دار پانی سا چمٹتا رہتا ہے جو کشش ثقل سے موٹے موٹے قطرہ کی صورت میں نیچے جی کر رہتا رہتا ہے۔ اسے اپنی کمال ایک طرف سے پکڑ کر سینٹی چلانی پڑتی ہے اور اس کو بار بار تکرر کرنا پڑتا ہے۔ ہم سب چونکہ بڑی عمر کے لوگ تھے اس لئے ایک دوسرے سے دُور دُور کوئی پتھر پڑ کوئی دروازے کی دلیز پر کوئی کھڑے ہو کر اور کوئی گڑھی پر بیٹھ کر شیو کر رہے تھے اور ہماری ٹھوڑیوں سے نیگنوں قطرے ٹپک رہے تھے۔

اب نارائن کی سب سے بلند چوٹی کے پیچھے سے سورج نکل آیا تھا اور ہم اپنی اپنی کسٹ

کندھوں پر اٹھائے، چھڑیاں ہاتھوں میں پکڑے بازار سے گزر رہے تھے جہاں گھڑی سازوں کی بہت سی دکانیں تھیں۔ لیڈر ہم سب سے آگے تھا اور اس کی پیٹھی پر سب سے زیادہ بوجہ لدا جو ایتنا بھتیجی چونکہ ستر سال کا تھا اس لئے قطار میں سب سے پیچھے تھا۔ ہم پتھروں کے سڑوں پر پاؤں رکھتے، چھڑیوں سے دوسرے پتھروں کو ٹھکورتے جھیل سیف الملوک کی طرف رواں تھے اور جاگے سامنے سات میل لمبا رستہ اور ڈھائی ہزار فٹ کی چڑھائی منہ کھولے کھڑی تھی۔ جب ہم فارسٹ ریسٹ ہاؤس والا موڑ مڑ کر اغروٹوں کی چھاؤں میں چلنے لگے تو دو راگیروں نے ہمیں روک کر پوچھا۔ ”کدھر کے ارادے ہیں صاحب؟“

”جھیل سیف الملوک کے“

”پیدل؟“

”جی جناب“

”پہلے بھی کبھی گئے ہیں پیدل؟“

”نہیں جناب، پہلا موقع ہے“

”والہی مشکل ہے“۔ ایک نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”کیوں؟“۔ عمامہ نے پوچھا۔

”میدانی لوگ اتنی چڑھائی نہیں چڑھ سکتے صاحب“

سامنے سے ایک لمبا ترنگا نوجوان آ رہا تھا۔ اس کے سر پر سندھی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں بکری کی سری تھی جسے اس نے کان سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ بھی باتوں میں ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔ سفید ڈاڑھی والے نے بتایا کہ یہ لوگ لاہور اور راولپنڈی کے رہنے والے ہیں اور پیدل سیف الملوک جا رہے ہیں۔ سندھی ٹوپی والا مہربان اور پتھر پر تھوک کر بولا۔ ”ہفتہ دس دن ہونے ایک فوجی پاکستان نے بھی جوشوش کی تھی۔ بڑا خوبصورت جوان تھا، لیکن جب سیدوں کے بنگلوں سے اُپر گیا اور پہلی لمبی چڑھائی چڑھی تو ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا اور دم دے دیا“

”کیوں؟“۔ مسعود نے پوچھا۔

”کلیجہ پھٹ گیا اور کیوں؟ سالم حبیب کرا کے اس کی لاش بالا کوٹ لے جانی گئی اور پھر پورے فوجی اعزاز کے ساتھ اس کو دفن کیا گیا۔ آپ کی پینڈی کا تھا۔“

”سن مُنفتی“ مسعود نے ہنس کر کہا۔ ”تمہارا دل بھی کمزور ہے اور دو دفعہ ہسپتال بھی ہوئے۔ جو سالم حبیب کرائی پڑے گی۔“

”کتھے پیسے لگیں گے؟“ مُنفتی نے پوچھا۔

”سو روپے۔“ سندھی ٹوپی اور بکری کی سری والے نے جواب دیا۔

”سو میرے پاس ہے یا رو۔“ تیلون کی چھوٹی حبیب میں۔ فکر نہ کرنا اور چندہ جمع کرنے نہ بیٹھ جانا۔“ مُنفتی نے آرام سے کہا اور ان تینوں کے ساتھ باری باری پرتیاک مصافحہ کر کے آگے چلنے لگا۔ پھر ان لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ یہاں قبر کھدوانے پر کتنی لاگت آتی ہے اور وہ لوگ بتا رہے تھے کہ قبر تو قبسے کے لوگ مل ملا کر مُنفتی ہی کو دیتے ہیں، لیکن جگہ تلاش کرنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔ عماد پوچھ رہا تھا کہ یہاں قبروں کے تعویذ لکڑی کے کیوں بناتے ہیں اور وہ بتا رہے تھے کہ اخروٹ عام ہوتا ہے اس لئے سستا پڑتا ہے اندر پتھر ہوتے ہیں اور اُپر اخروٹ کی لکڑی کا بکسا۔ قبر خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ مُنفتی چونکہ ان باتوں میں شریک نہیں ہوا تھا اس لئے ہم سے آگے نکل گیا تھا۔ اب وہ ہمارا لیڈر تھا اور ہم قطار کی صورت میں اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ راستے میں عمر نے ہم سب کو روک کر کہا۔ ”یار مُنفتی کو مناد وہ نہ جائے۔ وہ ہارٹ کا مریض ہے اور اس کو دو مرتبہ اینک ہو چکا ہے۔“ مسعود کہہ رہا تھا ”جب اس کی دوائیاں ساتھ ہیں تو پھر زیادہ فکر کرنا مناسب نہیں۔“ اعظمی نے کہا۔ ”لیڈر اپنی کٹ اچھی طرح سے دیکھ لو کہ اس میں مُنفتی کی دوائیاں ہیں بھی یا نہیں۔“ ہم نے پتھروں کی مینڈھ پر کٹ کھول کر دیکھی اس میں مُنفتی کی تینوں شیشیاں موجود تھیں اور مریض ہمارے خدشات کی پروا کئے بغیر بڑے آرام سے چڑھائی پڑھ رہا تھا۔

جھیل سیف الملوک کو جانے والا رستہ بڑا پتھر بلبا ہے۔ اس میں ہر ہر قدم پر ٹھوکر لگتی ہے اور ہر قدم اُونچا نیچا پڑتا ہے۔ ہم نے اپنا سفر شروع تو کر دیا تھا، لیکن اس کے ختم ہونے کے بارے میں یقین سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ جوں جوں ہم ایک ایک فٹ ایک ایک گز اُدھر کو ٹھٹھ

رہے تھے، دھوپ تیز ہو رہی تھی اور ہوا کمزور۔ چہرے پر اور گردن پر سونیاں چھینے لگی تھیں اور اس کیچھنے میں دقت ہونے لگی تھی۔ قبسے سے کوئی ایک میل دُور نکل آنے کے بعد ہم نے پہلا پڑاؤ ایک تھگی کی اوٹ میں کیا جہاں تھوڑا سا سایہ تھا۔ سب نے اعظمی کے فولڈنگ گلاس سے کہل کا ٹھنڈا پانی پیا اور ٹانگیں لمبی کر کے ایک دوسرے کے قریب بیٹھ گئے۔ اعظمی اپنی چھڑی سے پتھروں پر سنگ ترنگ بجا رہا تھا اور مُنفتی کی طرف کافی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ عماد اور عمر کی پڑائی شربطیل رہی تھی کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر آدھ گھنٹے میں واپس آجاؤ اور دس روپے لے لو۔ عمر کہہ رہا تھا دس کم ہیں، بیس دو تو بھی چلا جاتا ہوں اور اگر دس ہی دینے ہیں تو چوٹی ذرا چھوٹی کر دو۔ سامنے والی کے بجائے دوسری لے لو۔ یہ باتیں ہاتھ والی۔ مسعود نے کہا۔ ”مُنفتی جی، یہ پہاڑ اور میدان میں اور ادھان میں اور نیچان میں کچھ فرق ہے کہ بس نظر ہی کا دھوکا ہے؟“

مُنفتی نے کہا۔ ”کھل پوش سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضور آپ کے نزدیک کھڑاؤ اسلام میں کچھ فرق ہے یا نہیں تو آپ نے کہا تھا، بھائی کچھ بھی نہیں۔ دونوں شانیں سرکاری ہیں۔ اندھیر اُجالے کا ساحل ہے۔ سردی میں دھوپ بھلی معلوم ہوتی ہے گرمی میں چھاؤں۔ دن کو روشنی چھی لگتی ہے رات کو اندھیرا۔ اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کا کسی کو بھی علم نہیں۔ پتہ نہیں یہ ادنیٰ یا نیچائی ایک سی ہیں یا ان میں کچھ فرق ہے۔“

عماد جو مُنفتی کی بات غور سے سن رہا تھا، ٹوپی اتار کر بولا۔ ”دونوں سرکاری شانیں ہیں مُنفتی جی، فکر نہ کرو۔“

”فکر میں کرتا ہوں یا تیرا یہ کچھ لگتا مسعود کرتا ہے مجھے کیا، میں کیوں فکر کروں؟“

عمر نے کہا۔ ”اوتے نعتین شاہ تجھے یہ باتیں سمجھ میں آتی ہیں معرفت کی؟“

”اس کو تو ایک جی بات سمجھ میں آتی ہے۔“ مسعود ہنس کر بولا۔ ”اور وہ یہ کہ زیادہ سے

زیادہ روپیہ کیسے کمایا جاسکتا ہے اور کس طرح سنبھال کر رکھا جاسکتا ہے۔“

”ہاں سچ۔“ عماد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ اس قدر لاپچی اور پیسے کے پتہ کیوں ہیں؟“

میں نے کھسیانی نہنسی ہنس کر کہا۔ ”در اصل یہ خاصیت میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے اور

چونکہ میں نے اسے دُور کرنے کی کوشش نہیں کی اس لئے یہ اور بھی راسخ ہوئی گئی۔ اب میں معمول نہ

کے چکر سے نکل نہیں سکتا۔

”جب تمہیں اس بات کا اتنا احساس ہے تو پھر اس چکر سے نکل کیوں نہیں آتے؟“
عمر نے پوچھا۔

”میں نے کہا۔“ احساس دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک اکتسابی اور دوسرا جذباتی۔ جب آدمی کو اکتسابی اور کتابی احساس ہوتا ہے تو وہ ہر مسئلے کا تجزیہ کر کے اسے اس طرح چھوڑ دیتا ہے اور جب اس کی پیش قدمی جذباتی ہوتی ہے تو وہ اس مسئلے کے حل کرنے کے لیے ہمدردی محسوس کرتا ہے اور عام طور پر کامیاب ہوتا ہے۔ میں چونکہ حصولِ زرا اور جلبِ منفعت کو کتابی طور پر برا سمجھتا ہوں جذباتی طور پر نہیں اس لئے اس چکر سے نکل نہیں سکتا۔“

”تو تم اس کو جذباتی مسئلہ بنا کر سوچا کرو ناں۔“ عمر نے بھول پسنے سے نصیحت کی اور میں نے اسی بھول پن کے ساتھ اس کی نصیحت پر عمل کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اتنے میں ٹھگی سے ایک آدمی اور اس کی نو دس سال کی لڑکی برآمد ہوئی۔ وہ ہمارے پاس آکر کھڑے ہو گئے تو مسعود نے جیب سے دو تین ڈالر نکال کر لڑکی کو دیئے۔ آدمی نے پوچھا کہ تم لوگ خدا نخواستہ بھیل سیف الملوک دیکھنے تو نہیں جا رہے اور ہم نے بیک آواز کہا۔ ”اگر اللہ وہیں جا رہے ہیں۔“ وہ بیچارہ کچھ فکر مند سا ہو گیا اور مرنے لگا کر بولا۔ ”پچھلے سال لاہور سے بی بیوں کا ایک قافلہ آیا تھا۔ کوئی تیس پینتیس بیبیاں تھیں۔ بہت خوبصورت اور بہت ہی اچھے کپڑوں والی۔ ان کے ساتھ ان کی لڑکیاں اور متیں بھی تھیں۔ وہ بھی پیدل سیف الملوک جا رہی تھیں۔“

”پھر؟“ عماد نے پوچھا۔

”آگے ایک اغروٹ کا درخت آئے گا۔ آدھے رات کے بعد کچی پہاڑی پر اس کے نیچے آپ کو ایک بڑا سا پتھر دکھائی دے گا، آدھا کالا اور آدھا لال۔ ایک بی بی نے جو ان سب میں سے خوبصورت تھی اس پتھر پر بیٹھ کر اپنی چپلی کا فیتہ کسا اور بس وہیں ختم ہو گئی۔“

”کیا ہو گئی؟“ عمر نے چیخ کر پوچھا۔

”مڑ گئی۔“ چھوٹی لڑکی نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ عماد نے پوچھا۔

”بس جی اللہ کا حکم۔ جسم کا زور پڑا خون نے گرمی کھائی۔ ٹھنڈی ہوائ نے پٹا مارا اور نس پھٹ گئی۔“

”پھر؟“ عماد نے پوچھا۔

”پھر کیا جی، اس کو سالم جیب کر کے لے گئے۔ لاہور کی بی بی بھی بڑی خوبصورت۔“

”تم نے مری ہوئی دیکھی تھی؟“ عمر نے پوچھا۔

”ناں جی ہم نے تو نہیں دیکھی پہلے لوگوں سے سنا ہے۔“

”پہلے لوگوں سے؟“ مفتی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”پہلے لوگ جو اس ٹھگی میں رہتے تھے۔ ہم سے پہلے۔“

اعظمی نے کہا۔ ”اٹھو یارو، یہ تو سب کو سالم جیب کر دیتے ہیں۔ آئندہ کوئی آدمی بلا تو اس سے بات نہ کرنا۔“

”بالکل ٹھیک ہے جی۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”یہ پرلوں کا علاقہ ہے جب تک پہلے آدمی کو السلام علیکم کہو اور وہ علیکم السلام کہہ کر جواب نہ دے اس کے ساتھ بات نہیں کرنی چاہیے۔“

”کیوں؟“ عماد نے پوچھا۔

”وہ آدمی نہیں ہوتا جی، پری کا رُوب ہوتا ہے، پڑیل ہوتی ہے۔“

”یار یہ پریاں اور پڑیل میں بھی بڑی دیکھی مخلوق ہیں۔“ مفتی نے کہا۔ ”مجھے ان لوگوں پر

انسانوں سے بھی زیادہ ترس آتا ہے۔“

”لو شالا لوگ ترس کرنے کدھر چلا گیا۔“ اعظمی ہنس کر بولا۔

مفتی نے کہا۔ ”عزت علی شاہ قلندر نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں ہم شاہ عبدالعزیز سے پڑھتے تھے تو ایک طالب علم تھا، نہایت پاکیزہ صورت اور موہنی ثورت۔ اس کے پاس ایک چڑیل خوبصورت عورت بن کر آیا کرتی تھی اور دو روپے ہرات کو دے جاتی تھی۔“

”دو روپے؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور مسعود قہقہہ مار کر بولا۔ ”اس کمبخت کو صرف دو روپے ہی نظر آئے اور وہ خوبصورت

عدت نظر آئی جو ہر رات طالب علم کے پاس آتی تھی۔ لعنت ہو تیری کمرشل سوچ پر۔

منقہ نے جھٹاکر کہا۔ ”سنو مارڈ غور سے سنو۔ وہ چڑیل تو بصورت عورت کے روپ میں تمام رات اس طالب علم کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک رات دونوں ایک چار پائی پر تھے اور چراغ کوئی پانچ پھ ہاتھ کے فاصلے پر طاق میں روشن تھا۔ طالب علم نے ایک عام مرد کی طرح اس سے کہا کہ جا چراغ گل کر دے۔ اس عورت نے دیں سے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر چراغ گل کر دیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر طالب علم سہم گیا اور ڈر کے مارے لرزے لگا۔ عورت نے بہت کچھ تسلی بخشی اس چارے کی کہ اگر ہاتھ باز نہ کر لوں۔ اسے گل رعنا، میں تجھ پر عاشق ہوں اور تیری باندی ہوں کسی قسم کا اندیشہ نہ کرو لڑکا چپ چاپ اپنی جگہ خوفزدہ لیٹا رہا۔ جوں توں کر کے رات بسر کی اور صبح کو یہ ماجرا شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں بیان کیا۔ حضرت نے ایک تعویذ لکھ کر اس کے بازو پر باندھ دیا۔ رات ہوئی تو وہ عورت حسب معمول پھر اس کی کھڑکی میں آئی مگر وہ کھڑکی بند اور روک کر گئی۔ میں نے تیرے ساتھ کیا برائی کی جو تو نے ایسا ظلم مجھے سہم سیدہ پر ڈھایا۔ خدا کے لئے یہ تعویذ کھول ڈال اب میں چار روپے روز دیا کروں گی۔

مسعود نے زد کا نعرہ مارا اور چلا کر کہا۔ ”سنا شاہ جی؟ چار روپے روز؟ اور میں شرمندہ سا ہو گیا۔

”پھر پھر؟“ عمر نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”پھر منقہ؟“

”پھر کیا؟“ منقہ نے کہا۔ ”اس عالم نے تعویذ کھولا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔“

”یہ تعویذ ایک مرتبہ میری بیوی نے بھی کرایا تھا۔ عمر نے آہستہ سے کہا۔

”لیکن اس نے کوئی خاص کاٹ نہیں کی۔“ اعظمی مسکرا کر بولا۔

”نہیں بھی نہیں۔“ مسعود نے چھڑی اُپر اٹھا کر کہا۔ ”پرسنل بات نہیں خاص طور پر

لیڈر کے بارے میں تو کوئی بھی بات نہیں؟“

پھر ہم اٹھے اور منزل کی طرف چلنے لگے۔ راستہ جب پتھر والا ہو، سورج کی تمازت تیز ہو

ہر قدم پر برعصائی ہو تو سافٹ مشگل سے طے ہوتی ہے۔ ہم اپنے پاؤں پر تو مضبوط تھے، لیکن

ہمیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ لیڈر کا حکم تھا کہ چلتے رہو، چلتے رہو اور چلتے رہو۔

روکے تو مومینٹ ٹوٹ جائے گا اور تم لوگ کبھی بھی جھیل تک نہ پہنچ سکو گے۔ ہمارے پہلو سے دو نوجوان لڑکے ٹٹوں پر سوار گزرے۔ ان کے ساتھ پیدل گائیڈ تھے جو ان نوجوانوں کو جھیل دکھانے لے جا رہے تھے۔ مسعود نے حسرت بھری نظروں سے ٹٹوں کو دیکھا اور پھر گردن جھکا کر چلنے لگا۔ راستے میں پتھروں کے درمیان طرح طرح کے جنگلی پھول اُگے تھے جن میں سے تقریباً ہر ایک کو اعظمی جانتا تھا اور اس کی نسل کو پہچانتا تھا۔ اعظمی کو پھول جمع کرنے کا شوق ہے۔ تازہ رنگ برنگے، چھوٹے، بڑے، سُوکھے، استری کئے ہوئے پھول۔ وہ بار بار جھک کر پتھروں کے درمیان سے کوئی پھول توڑتا۔ اس سے ایک آدھ بات کرتا اور پھر احتیاط سے کاغذ میں لپیٹ کر اپنے پیٹے میں رکھ لیتا۔ اعظمی کا مزاج اپنی طرز کا نرالا ہے۔ اُسے قدرت نے لفظوں سے کھیلنا، ان کی موت بدلنا، ان کے معنی اٹا نا کچھ اسی طرح سے سکھایا ہے کہ اس کے سارے دوست اس کی اس خوبی کو خرابی سمجھنے لگے ہیں اور اس سے بیٹھا بیٹھا حسد رکھتے ہیں۔ وہ میری آپ کی طرح سے ایک چھوٹا انسان ہے اور چھوٹی چھوٹی بے شمار کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ ہماری طرح اس کا بھی ایک ہی منتہائے مقصود ہے۔ نوکری کرنا، بال بچوں کو پالنا، اگلی ترقی پر دھجھو اور آخر میں ریٹائر ہو کر فوت ہو جانا۔ اس ساری نارمل اور صحت مند زندگی کے درمیان اسے ایک ہی مزن مرض لاحق ہے اور وہ ہے پھولوں سے محبت کرنا۔ میں نے اعظمی کو پھولوں سے محبت کرتے زیادہ قریب سے نہیں دیکھا، لیکن مجھے یقین ہے وہ ان سے کافی پیار کرتا ہوگا۔ پھولوں سے محبت کرنے والے لوگ، کیا مرد، کیا عورتیں، عام طور پر معمولی شکل و صورت کے ہوتے ہیں۔ وہ پھولوں کی خوشبو سے یا ان کی رنگت سے یا ان کی گھڑت سے پیار نہیں کرتے، ان کے ہونے سے پیار کرتے ہیں۔ منسل شیخوپورہ کے ایک دُور افتادہ گاؤں کوڑکن میں میں نے ایک نوجوان مصنف بیجو کو پھولوں سے پیار کرتے دیکھا ہے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے کوارٹر کے صحن میں جھاڑو دیتے دیتے اچانک ک جاتی اور زمین پر گرے ہوئے کسی پھول کو اٹھا کر دیکھنے لگتی۔ دیکھنا اس کا عشق تھا۔ دیکھنا اس کا جذبہ تھا، مستی تھی اور وہ پھول کو دیکھتے دیکھتے ایک اور طرح کی ٹیاریاں جاتی۔ بڑی قبولی بے حد

ovq (Ovum) RECEPIVE

جیسے اردو اپنی جہاز سے ٹوٹ کر فضا کی پذیرائی کے لئے ہوتا ہے۔ اس لڑکی کو بڑی گالیاں، بڑے دھوکے اور بڑی ٹھوکریں اور مٹھڑے سنے بڑتے تھے کیونکہ وہ کام دھیان سے

نہیں کرتی تھی۔

”مفتی چلتے چلتے رک کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنے بوٹ کے تسمے کھول کر اس میں سے لکڑ نکالنے لگا۔ ہم سب اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ لیڈر کا حکم تھا کہ ہم میں سے کوئی بیٹھنے نہ پائے کیونکہ بدن گرم ہیں سانس مرتب ہیں اور ٹانگیں چلتی ہیں اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی رخنہ پڑ گیا تو ساری مہم دھری کی دھری رہ جائے گی۔ پھر لیڈر نے مفتی سے پوچھا کہ اس کا دل کس طرح سے تھل رہا ہے۔ مفتی نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا کہ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ کچھ زیادہ ٹھیک نہیں تھا۔ عماد نے رائے دی کہ مفتی جی کو ایک لال گولی اسی وقت دے دینی چاہیے، لیکن مفتی نہ مانا اور یہی کتار ہا کہ جب ضرورت پڑے گی تو وہ خود مانگ لے گا۔ اس مختصر سے قیام کے بعد ہمارا قافلہ پھر آگے چلنے لگا۔

مکئی کے چھوٹے بڑے کھیتوں کی مینڈھیں کاٹتے ہوئے جب ہم ایک ایلے راستے پر آئے جو نسبتاً کم پتھر والا تھا اور جس کی گیلڈنڈی کے نیچے کچی مٹی بھی دکھائی دیتی تھی تو ہماری جان میں جان آئی۔ پیچھے سے دو گولوں نے ہمارے قریب آکر سر نکالا اور زور سے السلام علیکم کہا۔ ہم سب نے باجماعت ان کے سلام کا جواب دیا۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کے خالی برتن تھے اور سروں پر ساگ کی گھڑیاں تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم نے ناران کے بازار میں لوگوں کو باتیں کرتے سنا ہے کہ ایک ستر سال کا بڑھا پیدل جمیل سیف الملوک دیکھنے جا رہا ہے۔ مفتی نے رک کر کہا۔ ”وہ بڑھائیں ہوں۔ کر لو کیا کر سکتے ہو؟“

دوسرے نے کہا۔ ”آپ کے منہ پر خون چرٹو آ آیا ہے۔ اس ارادے سے باز آ جائیں۔ نہیں تو کلیجہ پھٹ جائے گا۔“

مفتی بولا۔ ”یہ کلیجہ پہلے بھی تین مرتبہ پھٹ چکا ہے۔ ایک مرتبہ بٹالے میں۔ پھر قصور میں اور حال ہی میں لاہور میں۔“

”لاہور میں دھرم پورے کے اندر پھٹا تھا۔“ اعلیٰ نے ہنس کر کہا اور پھر مجھ سے کہنے لگا ”کیا نام تھا اس کا شاد جی؟“

”عالم بی بی“

”عالم بی بی کون؟“ عماد نے پوچھا۔

”یہ نمازیوں کے سننے کی بات نہیں۔“ مفتی نے جواب دیا۔ ”یہ بے نمازیوں کی وار داتیں ہیں۔“

دونوں گوالے ہماری باتوں سے بیزار ہو کر جلدی جلدی قدم اٹھانے لگے اور دیکھتے دیکھتے اپنے برتنوں اور گھڑیوں سمیت پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ اب اغروٹ کا وہ درخت قریب آ رہا تھا جہاں لاہور کی ایک خوبصورت طالبہ نے دم توڑا تھا اور اس کی لاش سالم حبیب میں گھر واپس گئی تھی۔ ہم سب جو رنگا ہوں سے اغروٹ کے اس تناور درخت کو دیکھ رہے تھے جس کے نیچے خانہ بدوشوں کا ایک چھوٹا سا کنبہ بیٹھا تھا اور ان کے پہلو میں سیاہ رنگ کا ایک کتا بڑے زور سے بھونک رہا تھا۔ مسعود نے گردن گھما کر ادھر دیکھا اور پھر بڑھے میل کی طرح سر ڈال کر لمبے لمبے قدم اٹھانے لگا۔ عماد چونکہ سانس کا طالب علم ہے اور اس کو دنیا کی ہر چھوٹی بڑی بات کا علم ہے اس لئے وہ چلنے اور رکنے کی سائنس سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ اسی نے ہم سب کو یہ رائے دی تھی کہ چلنے میں ایک ردم ہونا چاہیے۔ جس تال پر قدم اٹھاؤ اسی پر اٹھاتے چلے جاؤ۔ اگر اکھڑے یا بے تالے ہوئے تو جلد تھک جاؤ گے اور کبھی اپنی منزل کو نہ پہنچ سکو گے۔ اس کے کہنے کے مطابق میں اور مسعود دل ہی دل میں اپنی چال کے ماترے گنتے جاتے تھے اور ٹھیک جا رہے تھے۔ عمر چونکہ پہاڑی آدمی ہے اور اس کا بچپن اوڑھانی دھرم سالے میں گزری ہے اس لئے اس کو چلنے میں تکلیف نہ ہوتی تھی۔ اعلیٰ کچھ ایسا بے مغز اونٹ ہے کہ اس کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ مسافت طے کر رہا ہے۔ چلنے کے معاملے میں اگر کوئی تکلیف میں مبتلا تھا تو وہ عتا د تھا۔ ایک تو اس کے قدم تال سے باہر پڑ رہے تھے دوسرے بلندی پر آ جانے کی وجہ سے اس کا سر گھوم رہا تھا اور اسے ہلکی ہلکی ابکائیاں آرہی تھیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں ہر بڑے سانس دان کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ زمین کی زندگی بڑے لوگوں کے لئے بڑی مشکلیں پیدا کر دیتی ہے۔

سامنے سے کچھ لوگ نکدالیں اور پھاڑے لے کر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ سلک کی قیص پہنے ایک موٹا سا میٹ بھی تھا۔ یہ مزدوروں کی پہلی بیسٹ تھی جو راستے کا گلشیہ کاٹ کر

آرہی تھی۔ انہوں نے ہمیں روک کر ہم سے سگریٹ مانگے اور ہمیں یہ مشورہ دیا کہ ہمیں سنے واپس چلے جائیں کیونکہ پھیل اچھی بہت دُور تھی اور شام پڑنے تک ہم بشکل تمام وہاں پہنچ سکتے تھے۔ میسٹ نے کہا سب برسوں تک حبیب چلنی شروع ہو جائے گی اور شہری لوگوں کو کونے جانے میں تکلیف نہ ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ بھی برسوں تک انتظار کریں اور اپنی جان مشقت میں نہ ڈالیں۔“

ہم نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور آگے چل پڑے۔ آگے چلتا، آگے بڑھتا اور مسلسل چلتے رہنا الوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ ہر وقت منزل پر نگاہ رکھنی اور جدوجہد کے ساتھ زندہ رہنا زندہ لوگوں اور زندہ قوموں کا کام ہے جو پیچھے رہ جاتا ہے وہ پس جاتا ہے، مر جاتا ہے، ختم ہو جاتا ہے۔ بلندی بلندی بلندی۔ شہرت شہرت شہرت۔ عزت عزت عزت، لیکن آگے بڑھنے، ہر وقت جدوجہد کرنے اور ستاروں پر کندیں ڈالنے کی کوئی حد نہیں۔ اگر ایک ڈاکٹر ہو ایک معمولی سائیم بی بی ایس سا ہیوال کا رہنے والا، جانوں کا لڑاکا، معمولی گھرانے کا فرزند اور وہ ترقی کرنے لگے اور ترقی کرنا کرنا انگلستان پہنچ جائے اور سرحدی میں اپنے کمالات دکھا کر رائل سوسائٹی آف سرجنز کا فیلو بن جائے اور اس کی تحقیقات دنیا کی سات زبانوں میں ترجمہ ہو کر سارے عالم میں پھیل جائیں اور اس کے لئے اعزازی ڈگریوں کے بند دروازے آپ سے آپ کھٹنے لگیں اور اُسے ہر ملک اپنے یہاں رہنے کی دعوت دے اور اُسے انگلینڈ ڈمی سی سے اس لڑکی کا خط ملے جس نے ایم بی بی ایس کے چوتھے سال میں اس سے بدتمیزی کی تھی اور ڈنبر کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب آپ کچھ زیادہ ہی بور ہیں۔ آپ مجھے امپریس نہیں کر سکتے۔ اور یہ بات اس کے دل میں گرہ بن کر بیٹھ جائے اور اُس نے اس گرہ کو کھولنے کے لئے مسلسل جدوجہد مسلسل کوشش اور لگاتار محنت کی ہو اور اس محنت کے صلے میں اُسے دنیا سے طب میں وہ مقام ملا جو جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اور پھر واشنگٹن ڈی سی کے ڈیپوٹنٹ سرجن کے بڑے صاحب کی اس لڑکی سے اس کی شادی ہو جائے اور اس شادی پر چند غیر ملکی ڈاکٹر بھی کراچی آئیں اور اس شادی میں شریک ہوں تو کتنا بڑا خواب شرمندہ تعبیر ہو اور نوجوان کی کیسی دیرینہ آرزو پوری ہو۔

پھر وہ ہائکس بلے کے ہٹ میں تہنی مون منائیں۔ گھوڑا ڈاکا، غاس پور اور ایوریہ میں ایک ساتھ ایک مینڈ گزائیں، لندن، پیرس اور روم کے ہوٹلوں میں اپنی رنگین، خوشگوار اور پائیدار ازدواجی زندگی کے پروگرام بنائیں۔ اپنے بچوں کے نام پہلے سے سوچیں۔ لڑکی ہر جسٹر میں دستخط کرتے وقت اپنے نئے نام کے نئے لفظ کو اُجاگر کر کے لکھے، تو خوشی، شادمانی اور کامیابی کے کیسے کیسے شادمانے کہیں اور جب ان کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا اور زچہ بچہ ہسپتال سے گھر آئیں اور کوٹھی کے تینوں بڑے لالوں میں تین بڑے تنبو تانے جائیں اور پولیس بند نہ بنے، تو محنت اور مسلسل جدوجہد اور کامیابی اور کامرانی کیسے کیسے رنگ برنگے جوڑے پہن کر ان تنبوؤں کے درمیان اور قتالوں کے ساتھ ساتھ پکر لگائیں۔

جب ڈاکٹر کے آفسر شیو لوٹن کی خوشبو اور اس کی بیوی کے نینا بچی کی نکمت ایک ساتھ بچے کے گالوں میں رچنے لگے تو زندگی کس کس طرح ان کی کوٹھی کے دروازے اور درجوں میں جھولا جھولے اور پھر جب ایک دن اس لڑکی کا ایک کزن بھارت کے جنگی کیمپ سے رہا ہو کر کراچی اپنی کزن سے ملنے جائے اور ڈاکٹر کا کیپٹن سے پہلی مرتبہ تعارف ہو اور تینوں لان میں بیٹھ کر چائے پیئیں اور جنگی کیمپوں کے حالات سنیں اور تنہائی، آوازی اور دُوبدی کے قصے بیان کریں اور رات کے وقت کیپٹن اپنے کمرے میں کھڑکی کھول کر وائیلن بجائے اور سمندر کی لہریں اس میں آنس بھر میں اور مسلسل جدوجہد اور کش مکش اور کوشش کا لکڑ ہارا اپنے تکیے پر سر رکھ کر سو جائے اور اس کی بیوی وائیلن کی آواز سُنتی رہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے کانوں میں گرنے لگیں اور ساتھ کے کمرے میں جا کر وہ اپنے بچے کو دیر تک دیکھتی رہے اور پھر مٹھی بھر آیا کو کبل اڑھا کر واپس اپنے بستر میں آکر لیٹ جائے تو کیا ہو اور اگر مسلسل جدوجہد کرنے والا محنتی، زندہ اور الوالعزم ڈاکٹر بقیہ عمر اپنی بیوی کے آنسو پونچھتا رہے اور اس کا کوئی علاج نہ کر سکے تو کیا ہو! اور اگر وہ کیپٹن کو گرمی چھوڑ دے اور شادی کرانے سے انکار کر دے اور پورٹ ٹرسٹ میں ملازم ہو کر لیاری کوارٹرز میں رہنے لگے تو کون روکے! اور اگر ڈاکٹر اپنی بیوی کو علاج کی عرض سے ولایت لے جائے اور اس کا علاج نہ ہو سکے تو پھر کون سے تار سے پرکند ڈالے! لیکن ہر وقت اپنی منزل پر نگاہ رکھنا اور جدوجہد کے ساتھ زندہ رہنا، زندہ لوگوں

اور زندہ قوموں کا کام ہے جو پیچھے رہ جاتا ہے وہ پس جاتا ہے، مَر جاتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری نگاہیں اپنی منزل کی طرف تھیں اور ہم ایک زندہ قوم کے روپ میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہم کل چھ تھے اور چھ کے چھ ایک ساتھ چل رہے تھے اگر ہم پانچ بچے یا اس سے بھی کم ہوتے تو بھی اسی طرح چلتے۔ تعداد کا کر دگی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ نہ کارکردگی سے کوئی متاثر ہوتا ہے۔ ایک وقت ہوتا ہے ایک لمحے کی بات ہوتی ہے جب اثر کا جالا موثر بن جاتا ہے۔ اس وقت نہ کہوتر کی کوئی خوبی تھی نہ نور جہاں کی، نہ شہزادہ سلیم کی۔ ایک لمحہ تھا جو اپنا کام کر گیا اور پھر سالوں اور مہینوں پر محیط ہو گیا۔

مسعود نے چیخ مکر کہا۔ ”شاہ جی پھر واپس پہنچ گئے لاہور؟“
میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”نہیں یار میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔“

”اس کو مارو۔“ مفتی نے رُک کر کہا۔ ”گنتی میں ہم چھ ہیں، لیکن اصل میں پانچ ہیں۔ یہ سال ہر وقت غائب رہتا ہے۔“

”حاضر سائیں حاضر۔“ میں نے جواب دیا اور پھر ہم چلنے لگے۔ دراصل سانس پھول جانے کے باعث ہم زیادہ باتیں نہیں کر سکتے تھے اور مومینٹم پرائز پڑنے کی وجہ سے رُک بھی نہ سکتے تھے۔

دور سامنے مزدوروں کی دوسری بیٹ گلیشٹر کاٹ رہی تھی اور ہمیں ان کے پھاؤڑے اوپر اٹھتے اور نیچے گرتے صاف دکھائی دینے لگے تھے۔

عمر نے کہا۔ ”عماد بتا گلیشٹر یہاں سے کتنی دُور ہے؟“

”گلیشٹر؟“ عماد نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔ ”یہاں سے؟ بس ہوگا کوئی ڈیڑھ میل دُور۔“

”ٹھیک ہے۔“ عمر نے تسلیم کیا اور سوٹی ہوا میں لہرا دی۔

اعظمی نے کہا۔ ”لوشا لوگ کوئی شرط ہی نہیں لگائی۔ اُس نے ڈیڑھ میل کہا۔ اُس نے

مان لیا۔“

”ان دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا ہے۔“ مسعود بولا۔ ”اب یہ جھیل تک کوئی شرط نہیں

لگائیں گے۔“

”سمجھوتہ بھی بڑے کام کی چیز ہے۔“ مفتی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”جب سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو آدمی سکمی ہو جاتا ہے۔“

”نہیں مفتی جی۔“ مسعود نے اپنی ہیکلاہٹ کے ساتھ کہا۔ ”سمجھوتے میں زبردستی کا اہل منٹ ہوتا ہے۔ مان لینے کی کیفیت نہیں ہوتی۔ سب کچھ جانتے ہوئے سمجھوتہ کرنا بڑا کرناک ہے۔“

”اور میرا بابا کہتا ہے۔“ میں نے اُونچی آواز میں کہا۔ ”کہ ماننے کے لئے جاننا ضروری نہیں۔“

”واہ واہ۔“ مسعود نے نعرہ لگایا۔ ”پنہ بابے کی باتیں مٹا۔“

میں نے کہا۔ ”اس وقت سانس پھولی ہوئی ہے کہیں بیٹھیں گے تو بات کریں گے۔“
ہم پھولی ہوئی سانسوں اور ٹوکی ٹانگوں کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور گلیشیر ہم سے

دُور ہوتا رہا۔ راستہ سمنان تھا اور چاروں طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ خاموشی کی بھی ایک اپنی آواز ہوتی ہے۔ ایک اپنی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک اپنا ہی بیٹرن ہوتا ہے۔ میں نے

ایک زمانے میں مختلف خاموشیاں ریکارڈ کی تھیں۔ رات کے ایک بجے مقبرہ نور جہاں کے باہر پانچ منٹ کی خاموشی ریکارڈ کی تھی۔ پھر آدھی رات کو سمن آباد کی ڈوگنی گراؤنڈ کی خاموشی

ریکارڈ کی تھی۔ پھر چوستان میں آدھی رات کا ساٹا ریکارڈ کیا تھا۔ یہ تینوں ریکارڈیں میرے پاس موجود ہیں اور میں نے انہیں کئی لوگوں کو سنوایا ہے۔ ایک جگہ کی خاموشی دوسری جگہ سے

مختلف ہے۔ جب ایک نہایت ہی خاموش جگہ میں آدمی تین گھنٹے تک مسلسل بیٹھا ہے تو ابتدا میں اس پر بڑی خوشگوار کیفیات گزرتی ہیں۔ پھر دل کے دھڑکنے کی صدا آنے لگتی ہے۔

اس کے ساتھ نبض چلنے اور رگوں کے پھڑکنے کی آواز شروع ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ صدا میں اتنی بلند ہو جاتی ہیں کہ ”کانوں“ کے پردے پھٹنے لگتے ہیں اور اندر باہر بشمار دھول

بجنے لگتے ہیں۔ اتنی اُونچی آواز آتی ہے کہ آدمی سے برداشت نہیں ہوتی اور وہ مضطرب ہو کر سناٹے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور ان آوازوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے جو اس کے معمول میں داخل ہوتی ہیں۔ ساٹا اور خاموشی بڑا عذاب ہے اور یوگی لوگ بڑی مشکل سے ان

پر قابو پاتے ہیں۔

ہمارے دایں ہاتھ اُونچے اُونچے پہاڑ تھے اور ان پر چھدرے چھدرے درخت اُگے تھے۔ کہیں کہیں اکا دکا جھونپڑے بھی تھے۔ کبھی کبھار ان کے پاس چرتی ہوئی بکریاں بھی نظر آ جاتی تھیں، لیکن اس ویرانے میں سوائے ہم چھدرے کے اور کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے اور اتنی لمبی مسافت طے کرتے ہوئے ہم سب کی شکلیں مختلف ہو گئی تھیں اور کانوں کے نیچے جبرڑوں کے پاس جلد کچ گئی تھی۔ اُوپر کی جھریاں نیچے کی جھریوں سے آملی تھیں اور آنکھیں جھوٹی ہو گئی تھیں۔ مسلسل ہانپنے اور مستقل زور لگاتے رہنے کی وجہ سے ہمارے پیچھے پڑے دل، جگر اور انترپوں کا کچھ حصہ جسموں سے باہر آ گیا تھا اور ہماری کمروں اور بیٹوں کے ارد گرد لٹک گیا تھا۔ جب ہم چلتے تھے تو باہر لٹکے ہوئے دل، جگر، پیچھے پڑے اور انتریاں ہمارے وجود سے ٹکرا رہی تھیں اور ان پر راستے کی دھول جم رہی تھی۔ یہ جسمانی تکلیف کچھ کچھ اس تکلیف سے ملتی تھی جب سلمیٰ باجی ہمارے قصبے سے گاڑی میں سوار ہوئی تھیں اور میں کچی چھت پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ نزع، فرقت اور سکس کا کرب تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔ میں مڑا تو کبھی نہیں، لیکن میں نے دو آدمیوں کو نزع کی حالت میں ضرور دیکھا ہے۔ دونوں مختلف مقامات پر مختلف حالات میں مر رہے تھے، لیکن ان کی جان کنی کی کیفیت ایک سی تھی۔ پہلے شدید تشنگن ہوتا تھا پھر ڈھیلے ہو جاتے تھے۔ پھر ان کے حلق سے آواز آنے لگتی تھی اور آہستہ آہستہ ان کے چہرے پر خوف کی ایک لکیر کر دیں بدل کر گزر جاتی تھی۔ پھر چار پانچ سیکنڈ تک وہ مکمل سکون کی لپیٹ میں آ جاتے اور اس کے بعد پھر وہی ڈرل شروع ہو جاتی۔ مرنے سے پندرہ بیس سیکنڈ پہلے ان کے چہروں پر طاییت، سکون اور سُپردگی کی کیفیت پیدا ہوتی۔ پھر جیسے لذت حاصل کرتے وقت انسان "سی" کرتا ہے، وہ سارے کے سارے لذت میں ڈوب گئے۔ گردن ذرا سی ہلی اور منکا ڈھلک گیا اور مجھے یوں لگا جیسے انسان خواب میں پہاڑ پر سے چھلانگ لگتا ہے۔ انہوں نے بھی چھلانگیں لگادیں۔

فرقت میں بھی آدمی کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے، لیکن وہ آخری اور لمبی چھلانگ نہیں لگا سکتا۔ اس کے دل کے گرد اگر دسٹین لیس سٹیل کے بیڈ کی ٹوک آہستگی سے پھرتی رہتی

ہے اور اس کا دل بند ڈبے کے اناس کی قاشوں کی طرح کٹتا رہتا ہے جب بلیڈ اُوپر سے لے کر نیچے تک سارے دل کی گول گول قاشیں کاٹ چکتا ہے تو وہ قاشیں پھر چڑھ جاتی ہیں اور بلیڈ نئے سرے سے اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس گھومتے ہوئے بلیڈ کو روکنے کے کئی عوامل ہیں۔ کچھ کارگر بھی ہیں اور بلیڈ کی گردش کو روک بھی دیتے ہیں، لیکن کبھی کبھی کافی وقت گزر جانے کے بعد یہ بلیڈ پھر سے گھومنا شروع کر دیتا ہے جیسے سر دیوں میں غلطی سے غلط بیٹن دب جانے پر گرمیوں کا ڈکا جوا سیلنگ فین گھومنے لگتا ہے۔

جب ہم گلیشیر کے قریب پہنچے تو مزدور برف کے ڈھیلوں پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور گپیں لڑا رہے تھے۔ ہم اپنی اپنی چھریوں کی نوکیں برف میں گاڑتے گلیشیر سے گزرنے لگے۔ کٹے ہوئے بھر بھرے راستے پر برف کو کچ کر کچ کر کے ہمارے پیروں تلے دب رہی تھی اور ہمارے پیسے ہوئے پاؤں اندر ہی اندر ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ یہ ٹھنڈک بڑی خوش آئند تھی۔ بچھلے ہوئے بالوں سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کی طرح۔ اُس میں تو دُوری کا احساس ہوتا ہے، لیکن اس میں پاؤں پڑنے کی کیفیت بھی تھی۔ ہم نے مزدوروں کو ایک زبان سلام کیا اور ان کے قریب سے گزرنے لگے۔ مٹی برف پر کبڑا ہو کر تپل رہا تھا اور اُسے ہر لمحہ پھسل جانے کا خوف لاحق تھا۔ مسعود ماترے گستاخا جہاں رہا تھا۔ میں بے تالا تھا اور عمر اور اعظمی نارمل انداز میں چل رہے تھے۔ ایک عمارت کی حالت غراب تھی۔ ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے اُسے پھرا بکا لے آنے لگی تھی۔ برف کا ٹوٹا شکل سے ڈھائی تین سو گز لمبا ہو گا، لیکن اُسے عبور کرنے میں اندازے سے زیادہ وقت لگا۔ گلیشیر ختم ہوا تو مفتی نے مکر سیدھی کر کے کہا "اب لاؤ ذرا"۔

لیڈر نے فوراً کٹ کھول کر سُرخ گولیوں والی ٹیشی نکالی تو مفتی جھلا اُٹھا۔ "ٹیشی نہیں گدھے لیڈر، مجھے چائے چاہیے۔"

اور ہم سب مل کر چائے چاہیے، کون سی جناب؟ گانے لگے۔ لیڈر نے سوئی اُٹھا کر ہمارا کوس بیچ ہی میں کاٹ دیا اور اعلان کرنے کے انداز میں بولا۔ "چائے وہاں مل سکے گی جہاں چشمہ ہوگا، پہاڑی کی اوٹ ہوگی، درختوں کی چھاؤں ہوگی اور سبزے کا ہمارا ٹکڑا ہوگا۔"

”اور اگر“۔ مفتی نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ ساری چیزیں ایک جگہ نہ ملیں تو چائے بھی نہیں ملے گی۔“

”کیوں نہیں کیوں نہیں۔“ لیڈر نے چکر کر کہا۔ ”یہ چیزیں نہ بھی ہوئیں تو بھی چائے ملے گی۔ تم چلو تو سہی۔“

عمدانے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں مفتی جی، آپ عیسیٰ تو سہی، دس قدم پر چشمہ مل جائے گا۔“

”چشمہ ماروٹن بھی ملے گا اور دل شاد بھی۔“ اعظمی نے کہا۔

”دلشاد کون ہے۔ مسعود نے پوچھا۔

”وہی جو پیشاور سے آزاد کشمیر ریڈیو پر گانے آیا کرتی تھی۔“ عمدانے جواب دیا۔

”یار وہ دلشاد تو بڑی موٹی تھی۔“ عمر بولا۔ ”یہ دوسری اچھی تھی لائپور والی۔“

”لائپور کی ساری دل شادیں اچھی ہوتی ہیں بھائی۔“ اعظمی نے سیری کیپ ہاتھ پر جھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

”یار اس دل شاد کے ساتھ نظامی مرحوم نے بڑا اچھا لطیفہ کیا۔“ مسعود نے کہا تو لیڈر بولا۔ ”اب آگے بھی چلو کہ ہمیں رُکے رہو گے۔ راستہ لمبا ہے اور وقت کم ہے۔“

وقت کی کمی بھی انسان کو ختم کر دیتی ہے۔ اگر وقت نہ ہوتا تو انسان کو کئی طرح کی تکنیکیں

ضرور ہوتیں، لیکن وقت کی کمی کی کبھی شکایت نہ ہوتی۔ صمدانی صاحب اور ریحانہ کی محبت

میں بھی وقت کی کمی حارج ہو گئی۔ وہ ایک بہت بڑے بنک کے زونل مینجر تھے اور ان

کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ ریحانہ مشکل سے اٹھائیس انٹیس برس کی ہو گی۔ بھرا بھرا بدن،

ہلکی گندم گوں رنگت، کٹے ہوئے بال، ٹھوڑی کے عین درمیان چھوٹا سا تیل۔ وہ ان کے

بنک میں ایک مانیسٹ کی حیثیت سے آئی تھی اور اپنی خدا داد لیاقت کی بنا پر جو نیر آفیسر

ہو گئی تھی۔ اُس کو پتہ نہیں صمدانی صاحب کی کون سی بات پسند آئی جو ان پر ہزار جان سے

فریفتہ ہو گئی۔ سہیلیوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ پارٹیوں میں جانا ختم کر دیا۔ کاغذوں پر توجہ دینا چھوڑ

دی۔ صمدانی صاحب کا بڑا لڑکا لندن میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے گیا تھا اور اسے گئے ہوئے

پورا ایک سال ہو گیا تھا۔ صمدانی صاحب ہر اتوار ریحانہ کو اپنی کار میں لے کر راول ڈیم جاتے تو انہیں اپنا بڑا لڑکا ضرور یاد آتا، لیکن وہ اس کے بارے میں کوئی بات نہ کرتے۔ وہ اپنی کار ڈیم کے پہلو میں کھڑی کر کے لمبی سیرول پر نکل جاتے اور ریحانہ سارے رستے ان کے بازو کے ساتھ لٹکتی جھولتی جاتی۔ جن جھاڑیوں میں جھول نہ بھی ہوتے ان میں بھی جھول نظر آتے۔ جن پتھروں میں چمک نہ بھی ہوتی ان میں بھی نیلم کی رگیں صاف نظر آتیں۔ جو راستے نہ ختم ہونے والے ہوتے وہ بھی ختم ہو جاتے۔ صمدانی صاحب کا ہر ملازم ان سے خوش تھا۔ ہر ماتحت ان کی مروت اور شفقت کے گن گاتا تھا۔ دو سال کی ان لمبی سیرول کے بعد اچانک ایک دن ایک ایفینٹنٹ سوڈ آف آنر لے کر ان دونوں کے درمیان آگیا اور ریحانہ نے اس کے کندھے پر انگلی پھیر کر پوچھا۔ ”یہ جھول تین کب ہوں گے؟“

”آج سے پورے دو مہینے بعد۔“ ایفینٹنٹ نے جواب دیا اور وہ دونوں سکوتر لے کر راول ڈیم چلے گئے۔ ہر شام راول ڈیم کی طرف جاتے ہوئے ریحانہ کو صمدانی صاحب ضرور یاد آتے، لیکن وہ ان کے بارے میں کوئی بات نہ کرتی۔ ڈیم کی چڑھائی پر سکوتر ڈالتے ہوئے شاید کو ریحانہ کا بازو اپنے سے ہونے پیٹ کے گرد ایک سانپ لگتا جو سیریلوں میں ہودت حاصل کرنے کے لئے کسی چیتے کے بدن سے لگ کر بیٹھ گیا ہو۔ ڈیم کے کنارے پہنچ کر ریحانہ کو سطح آب پر بہت سے بھرے، شکارے اور گنڈولہ نظر آتے جن کے بندھے ہوئے پردوں کے درمیان مرد اور عورتیں گٹاریں اور باب لے کر گارہے ہوتے۔ گھاس پر نیم دراز ہو کر جب شاہد اس سے اپنے یونٹ کی باتیں کرتا تو ریحانہ کو یوں لگتا جیسے وہ جے جے دتی کا الاپ کر رہا ہو۔ اس کی شخصیت کا سب سے خوبصورت حصہ فوجیوں کے خاص انداز کی محبت تھا۔ ریحانہ اس کا مدد اور لمبائی سے متعین کرتے ہوئے ہمیشہ یہ کہا کرتی۔ ”جھٹھے یہ بہت اچھی لگتی ہے۔“ آپ لوگوں کی محبت۔

ایک شام جب صمدانی صاحب ریحانہ کے گھر گئے تو اس نے بڑی غشی کے ساتھ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ صمدانی صاحب کی عمر اب پچاس سے بہت اوپر نکل گئی تھی۔ انہوں نے گھر کے اندر کھٹنے والے دروازے

کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ریحانہ“ اب وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ میں تمہارے صحن خانہ کی وہ دھوپ ہوں جو زمین سے اٹھ کر اونچی دیواروں پر پہنچ چکی ہے۔ ابھی یہ مٹی پر آئے گی اور پھر اندھیرا پھیل جائے گا۔ مجھے آرام سے مٹی پر پہنچ لینے دو۔ ریحانہ نے سر جھکا کر کہا۔ ”ہاں سر، وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ بہت ہی کم۔ میرے لئے تو آپ سے بھی زیادہ کم رہ گیا ہے۔“

صمدانی صاحب کی آنکھوں میں اس اقرار سے خوشی کے جگنو چمکے اور ان کی عمر پچاس سے بہت نیچے پہنچ گئی۔

”پھر ریحانہ؟“ انہوں نے گلا صاف کر کے کہا۔ ”مجھے اپنی محبت، قرب اور اپنے ساتھ کے چند مہینے اور عطا کرو۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔“

ریحانہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو اتر آئے اور اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”میں نے کہا ناں سر، وقت بہت ہی کم رہ گیا ہے اور ابھی ساری زندگی پڑی ہے۔ اب مجھے جانے دیں۔“

کوئی دس سیکنڈ تک کمرے میں خاموشی رہی پھر ریحانہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”در اصل سر، اب ہر لڑکی کے لیے شادی کا ایک وقت ہوتا ہے اور جب وہ گزر جائے تو پھر وہ لڑکی ساری عمر ایسے ہی رہ جاتی ہے۔ میرا وقت بھی بہت کم رہ گیا ہے۔ مجھے جانے ہی دیں۔“

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور قالین پر صمدانی صاحب کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ روتی ہوئی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔

وقت کم تھا۔ جھیل دور تھی اور ہمیں ہر حال میں سہ پہر سے پہلے پہلے وہاں پہنچنا تھا۔ راستے میں کھانا کھانے اور چائے پینے کے لیے ایک گھنٹے کی بریک لازمی تھی۔

لیڈر سوئی گھا گھا کر رہا تھا۔ جلدی کرو، جلدی کرو۔ ہمت سے کام لو۔ وقت کم ہے اور ہمیں دور پہنچنا ہے۔

”شاباش شاباش میرے جواں ہمت ساتھ شوباش“۔ مسعود بار بار نعرے لگا رہا

تھا اور مفتی کو ان کے نعرے اور لٹکارے ناگوار گزر رہے تھے۔

جب ہم کچی چڑھائی کا ایک موڑ مڑے تو سامنے گھاس کا ایک وسیع میدان نظر آیا۔ اس کے عین وسط میں ریوڑ کے چار اونچے درخت ایسا دکھتے تھے۔ مفتی نے رگ کر کہا۔ چائے کا مقام مل گیا۔

”کہاں؟ کہاں؟“ سب نے حیران ہو کر پوچھا۔

”وہ سامنے“ مفتی نے سوٹی سے اشارہ کیا۔

”اور پانی؟“ لیڈر نے پوچھا۔

”پانی کی تلاش میں لیڈر جائے۔“ عماد بولا اور پھر ہم نے ”لیڈر، لیڈر“ کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ لیڈر ہماری کم ہمتی کے آگے ہتھیار ڈال گیا اور ہمیں درختوں کے جھنڈ کی طرف لے چلا۔ بڑی خوبصورت گھاس تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا پھول کھلے تھے۔ اعلیٰ ان غبیلوں کے نام بتا رہا تھا۔ مسعود انہیں سوٹیاں مارتا پھل رہا تھا۔ پائین کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جب ہم اپنی اپنی کمروں کھول کر آرام سے بیٹھ گئے، تو لیڈر نے اپنی کمرٹ سے کیتل نکالی اور کہنے لگا۔ ”اب مردوں کی طرح بیٹھ کیوں گئے ہو؟ پھر کٹھے کر کے چولہا بننا اور کھنگلے جلاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”وس منٹ تک ہم سے بات نہ کرنا ورنہ ہم ماریں گے۔“

”ماریں گے اور رکھ کر عدالتی ماریں گے۔“ اعلیٰ نے کہا۔

لیڈر بڑبڑا کر خاموش ہو گیا، لیکن اپنی جگہ سے اٹھا نہیں۔ دراصل وہ بھی تنگ گیا تھا اور تھکا ہوا آدمی جب ایک مرتبہ بیٹھ جائے تو پھر اس سے اٹھا نہیں جاتا۔ ہم سب آنکھیں موند کر گھانا پر لیٹ گئے اور ہماری خاموشی نے ہماری توجہ کا دامن وسیع کر دیا۔ کوئی ایک منٹ کے سکوت کے بعد ہمیں ڈرب ڈرب اور ٹکل ٹکل کی آواز آنے لگی۔ لیڈر اپنی جگہ سے تڑپ کر اٹھا اور گردن گھما کر بولا۔ ”اوسے کیلنڈر چہتر تو یہ چل رہا ہے، ہماری کمروں کے پیچھے۔“ عماد نے کسنی کے بل ہو کر دیکھا ذرا سی اونچائی پر گھاس کے سرسبز پودوں کے درمیان پانی کے بڑے بڑے قطرے کوڑہ بھر گمرائی میں گر رہے تھے۔ عماد نے لیڈر سے کہا۔ ”بیٹا کیتلی لے جا کر اس ٹرکل کے پیچھے رکھ دے۔“

یہ کہہ کر وہ پھر لیٹ گیا اور اپنے مومال سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ سوچ کی تیز اور تکیگی کرنیں درختوں کی ڈالیوں سے ہو کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

کوئی پندرہ منٹ اسی طرح لیٹے رہنے کے بعد مسعودؒ "إِلَّا اللہ" کا نعرہ مار کر اٹھا اور پتھر ڈھونڈنے لگا۔ اٹھی بھی اُس کے پیچھے چلا پھر میں اور عتا دُٹھ کر کھٹکے اٹھنے کرنے لگے۔ ریلوے کے درختوں کی چھانگ اور غیر قانونی طور پر کاٹی ہوئی لکڑی کے بڑے چھوڑے اور حُر دھڑکچرے ہوئے تھے۔ ہم نے جُولہا بنایا، آگ جلانی اور کیتلی اُس پر دھری۔ پھر توشہ دان سے پر اٹھے اور انڈوں کی ٹکیاں نکالیں اور پُڑے کے سامنے بیٹھ کر کھانے لگے۔ بڑی شدید جھوک لگی تھی اور اُونچائی پر لطیف اوزون اسی خوراک میں لطیف سی چٹنی کا کام دے رہی تھی۔

جب ہم کھانا کھا چکے اور کیتلی میں کس چائے بن چکی تولید نے ہر ایک کی بیالی لبالب بھرتے ہوئے کہا: "اوسے مُردہ! کوئی بات کرو۔ اب تو کھانا بھی کھا لیا ہے۔"

"ضرور ضرور" مسعود نے اپنی آخری بُرقی گرم چائے کے گھونٹ سے آگے دیکھتے ہوئے کہا: "شاہ جی سے اس کے بابے کی باتیں سُنتے ہیں۔"

"بابا بوب کوئی نہیں یار" عمر نے کہا: "اس سے اُمی کی لڑکیوں کی باتیں سُنتے ہیں۔"

"دفع کر یا ر اُمی کو گولی مار" عتا دے کہا: "سو مرتبہ دیکھا ہے ہم نے اُمی۔ یہ بتاؤ شاہ جی۔"

کو آپ نے چین میں کیا دیکھا اور ان کو ہم سے کیسے مختلف پایا؟

"واہ واہ" مُفتی نے کہا: "چین، چین، چین۔"

میں نے کہا: "یار چین میں نے دیکھا ضرور ہے، لیکن بڑی دیر ہوئی دیکھا تھا۔ اب پتہ

نہیں اس کا حال کیا ہو گا۔"

"کوئی بھی حال ہو" مسعود نے کہا: "تم موجودہ حال کو بھول جاؤ، اپنے زمانے کی

بات کرو۔"

"چین صوفیوں کا ملک ہے اور وہاں تصوف کا فلسفہ چلتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ" عمر نے چڑ کر کہا: "کوئی عقل کی بات کرو۔ اتنے بڑے عظیم انسان کو صوفی

بنار ہے ہو، راہب بنار ہے ہو، گوشہ نشین بنار ہے ہو۔"

میں نے کہا: "عمر جب تک میں نے صوفی ازم کے بارے میں کچھ نہ پڑھا تھا اور تصوف کے بارے میں علم حاصل نہ کیا تھا میری بھی یہی سوچ تھی، جو تہمداری ہے اور ایک میں کیا ہر شریف آدمی اور پڑھے لکھے مہذب آدمی کی بھی سوچ ہے، لیکن اس علم پر ایک دو کتابیں پڑھنے کے بعد اور ان سے کچھ حاصل نہ کر سکنے کے بعد میں ان بابوں اور بزرگوں کی تلاش میں نکلا، جو ہمارے علم، ہماری دھرتی، ہماری سائیکس اور ہماری مٹی سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے پاس ہمارے لگتوں کا علم اور ان کی وراثت ہے۔"

"یہ جو پیر فقیر ہوتے ہیں" عمر نے سر جھٹک کر کہا: "روپے دو گنے کرنے والے؟"

"یہ بھی اور ان کے علاوہ دوسرے بھی جو بڑی بڑی پگڑیاں باندھتے ہیں۔ ڈارٹھی کو مندی

لگاتے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی رکھتے ہیں۔ ڈکار لیتے ہوئے ایکسیوز می کے بجائے اکھنڈ کہتے

ہیں اور پُرانی قسم کے حنائی کاغذ پر چھپی ہوئی کتابیں پڑھتے ہیں۔ استنجا کرتے ہیں، مصافحہ کرنے

کے بعد دونوں ہاتھ سینے پر لگاتے ہیں۔"

"تمہیں کیا ضرورت آ پڑی تھی ان لوگوں سے ملنے کی؟ مسعود نے پوچھا۔

"اس لیے" میں نے کہا کہ میں "ٹائم" لائف، نیوزویک، سوویٹ نیوز اور ریڈرز ڈائجسٹ

پڑھ پڑھ کر تنگ آ چکا تھا اور میرا دل چاہنے لگا تھا کہ میں ان بابوں کی بات بھی سنوں جنہیں میں

اور میرا باپ اور میرے بھائی نہیں کئی سال ہوئے گاؤں میں چھوڑ آئے تھے۔ دراصل میں اپنے

لگتوں سے ملنا چاہتا تھا۔ میں ہر نفعے "حلقے میں جا جا کر اُداس ہو گیا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" مُفتی نے پوچھا۔

"یہ مُفتی جی ۶۶ اور ۶۷ء کی درمیانی مدت کا ذکر ہے۔ میں نے اپنا پورٹریٹ ٹیپ ریکارڈ

لیا اور لاکھ پوز سالار والی، گولڑہ شریف اور پاکپتن شریف کے چکر لگانے لگا کہ شاید یہاں

مجھے کوئی ایسا بابا باہل جائے جس کے پاس ہمارے لگتوں کا اصل علم ہو۔ وہ علم نہ ہو جو مؤذبی

صاحب اور پرویز صاحب اور ڈاکٹر اسرار صاحب اور ادارۃ ثقافت اسلامیہ اور جامعہ

اشرفیہ اور اقبال اکیڈمیوں کی طرف سے عطا ہوتا ہے، چنانچہ اس سفر وسیلۂ ظفر کے دوران

مجھے چند اصلی بابوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، جو اکتسابی علم نہ رکھتے تھے۔ پنجابی کے سوا اُو کوئی

زبان نہ جانتے تھے۔ تجربہ عملی سے نا آشنا تھے۔ شخصیت کے اعتبار سے بڑے ساڈا اور لمبے اور انداز کے بڑے نرم تھے۔ میں نے ان سے کچھ باتیں نہیں کچھ باتیں ان میں دیکھیں۔ کچھ مجھے سمجھ آیا، باقی کا سارا میرے پلے نہیں پڑا۔

”لاہور میں جب میں نے ایک بابا سے کہا کہ میں صوفی ہونا چاہتا ہوں تو انہوں نے پوچھا کس لیے؟ میں نے کہا کہ اس لیے کہ یہ مجھے پسند ہے۔ آپ نے کہا: مشکل کام ہے سوچو تو میں نے عرض کیا: اب مشکل نہیں رہا کیونکہ اس کی پڑاؤ مری اور مدلل پاس کر چکا ہوں۔ پاس انفس نفی اثبات کا دور در کر لیتا ہوں۔ اسم ذات کے محل کی بھی پریکٹس ہے۔ آگے کے راستے معلوم نہیں وہ آپ سے پوچھنے آیا ہوں اور آپ کی گائیڈ منس چاہتا ہوں۔“

بابا نے ہنس کر کہا تو پھر تم روحانی طاقت حاصل کرنا چاہتے ہو۔ صوفی بننا نہیں چاہتے ہو۔ میں نے کہا ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ کہنے لگا روحانی طاقت حاصل کرنے کا مقصد صرف غرقِ عادات یعنی کرامات کا حصول ہے اور یہ طاقت چند مشقوں اور ریاضتوں سے پیدا ہو سکتی ہے لیکن تصوف کا مقصد کچھ اور ہے؟ وہ کیا؟ میں نے پوچھا تو بابا نے کہا تصوف کا مقصد خدمتِ خلق اور مخلوقِ خدا کی بہتری میں لگے رہنا ہے۔ مخلوق اللہ سے دور رہنا رہبانیت ہے اور اللہ کی مخلوق میں اللہ کے لیے رہنا یہ پاکی ہے اور دین ہے۔ مجھے اس بابا کی یہ بات اچھی نہ لگی بے چارہ پینڈو بابا تھا اور اس کا علم محدود تھا۔ میں اٹھ کر آنے لگا تو کہنے لگا روٹی کھا کر جانا۔ میں نے کہا، جی کوئی بات نہیں، میں ساہیوال پہنچ کر کھالوں گا۔ کہنے لگا، خدمتِ سعادت ہے، ہمیں اس سے محروم نہ کرو۔ میں طوعاً و کرہاً بیٹھ گیا۔ بابا اندھے کالی اور پیالی لے آیا۔ پھر اس نے دیگچے سے شوربان نکال کر پیالی میں ڈالا اور دال رکابی میں چنگیر سے مجھے ایک روٹی نکال کر دی جسے میں ہاتھ میں پکڑ کر کھانے لگا۔ وہاں کھیاں کافی تھیں۔ بار بار دایو لگا کر حملے کرتی تھیں۔ بابا میرے سامنے بیٹھ کر مکھیاں اڑانے کے لیے کندھری بنانے لگا اور میں روٹی کھاتا رہا۔

استخر میں مغرب کی اذان ہوئی۔ کونے میں اس کے مریدوں اور چیلوں نے تھوڑی سی جگہ لیپ پوت کر کے ایک مسجد سی بنا رکھی تھی۔ وہاں دس بارہ آدمیوں کی جماعت کھڑی ہوئی۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی ندامت ہوئی کہ میں روٹی کھا رہا ہوں اور پیر مکھیاں جمل رہا ہے۔ میں نے کہا بابا جی آپ نماز پڑھیں۔ کہنے لگے آپ کھائیں۔ میں نے کہا، جی مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے آپ جا کر نماز پڑھیں۔ مسکرا کر بولے، کوئی بات نہیں آپ کھانا کھائیں تھوڑی دیر بعد میں نے پھر کہا۔ جناب عالی، انہوں نے نیت بھی باندھ لی ہے آپ نماز ادا کر لیں قضا ہو جائے گی۔ بابا ہنس کر بولا نماز کی قضا ہے بیٹا، خدمت کی کوئی قضا نہیں۔ آپ آرام سے روٹی کھائیں۔۔۔

”میں اس جیسے تین بابوں سے تین مختلف جگہوں میں بلا اور ہر جگہ سے مجھے بلاؤسی ہوئی نہ کسی نے کوئی درد بتلایا نہ وظیفہ سکھایا نہ اسمِ اعظم کی ترکیب بتائی۔ بس یہی حکم دیا کہ خلقِ خدا کی خدمت کرو۔ ان کے درمیان رہو۔ تصوف کی منزلیں خود بخود ملے جوتی چلی جائیں گی۔ میں نے اس علم کو بے کار اور بگس جان کر پھر ٹائم، نیوز ویک اور سو ویٹ نیوز کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کوئی ایک سال بعد مجھے چین جانے کا اتفاق ہوا اور ایک ہفتے کے قیام کے بعد مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ چین کے سب لوگ صوفی ہیں اور ماؤزے تنگ ایک بڑا پیر ہے۔ گو ان کا رخ دنیا کا ہے اور وہ رفعتِ انسانی کے لیے کوشش کر رہے ہیں، لیکن ان کا طریق کار اور انداز حصول اور مدارج طے کرنے کا قرینہ سارے کا سارا صوفیہ جیسا ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں ملتے کے لیے جانا ضروری نہیں۔ جو فرمان کو سن لیتا ہے وہ گناہ سے پاک ہو جاتا ہے کیونکہ جو سن لیتا ہے اس پر کرنے کا مقام آجاتا ہے۔ پہلے سنا ہے، اس کے بعد کرنا اور اس کے بعد جانا ہے۔ سارا چین اس تصور کی لپیٹ میں پڑا ہوا ہے۔ پہلے ساری مخلوق ماؤ کے فرمان کو سنتی ہے پھر اس پر بلا حیل و مجتہ عمل شروع کر دیتی ہے اور جب عمل اپنے آخری مراحل میں داخل ہو جاتا ہے تو لوگوں پر خود بخود کھلنے لگتا ہے کہ فرمان کی رُوح اور اس کا فلسفہ کیا تھا۔ ان میں گیان اور علم اور جان کاری پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے جو پاڈچی سے پوچھا۔ یار تمہارے ملک کے لوگ ماؤ کی بات اس طرح سے کیوں مانتے ہیں اور اس پر بلا حیل و مجتہ کیوں عمل کرتے ہیں اور یہاں دسکشن اور سٹنگ اور تخریگ کا کیوں رواج نہیں؟ تو اس نے ہنس کر کہا سٹنگ تخریگ منافقوں اور دیا کاروں کے فلسفے ہیں۔ جب مان ہی لیا، تو پھر وقت ضائع کرنے

سے فائدہ ہے جب باپ کو مان لیا تو والدہ کے پاس جا کر تمام تفصیلات کی تحقیق کرنے سے فائدہ بے گنجے یا دیا کہ لاہور کے ایک بابے نے مجھ سے کہا تھا۔ بات اُس وقت تک نہیں مانی جاتی جب تک بات والے کو نہ مانا جائے...

بہن کا اور عین کے لوگوں کا سب سے بڑا فلسفہ آتنا وصد قنا ہے جو بات بڑا پیر کے گا وہی حق ہوگی۔ اس کے بعد جو خلیفہ کہے گا وہی درست ہوگی اسی پر عمل ہوگا۔ تو پھر وکیل پیسٹون کی اور کمیونسٹوں کی عطا ہے عین میں نہ لوگوں کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے نہ باہر نہ وہاں تہمتی مجلسیں آراستہ ہوتی ہیں نہ گفتگو بازوں کی پالیاں جیتی ہیں نہ حلقے ہیں نہ گلدے لوگ ہیں اور آپس کا میل جول ہے اور خوشامال اور سنگتیں ہیں اور گانا بجانا، چھانا اور ہنسنا ہے۔ میں نے جو پاؤچی سے بڑا کہا کہ اور نہیں تو کم از کم پیکنگ میں ایک اعلیٰ درجے کے حلقہ ارباب ذوق قسم کی مجلس ہی بنا لو جہاں لوگ آسکیں ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر معاملات و سکس کر سکیں ایک دوسرے کو اپنے علم کی چچی سے ناک پکڑ کر دوایلا سکیں، لیکن اس کجنت نے میری بات نہ مانی اور مجھے شک ہوا کہ وہ پاک عین دوستی کمزور کرنے کے لیے سب درشن میں لگا ہوا ہے۔ اُس نے کہا ہمارے فلسفے کی یہ بنیاد ہے کہ جو جس چیز کا علم نہیں رکھتا وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ جب تک وہ عمل طور پر عرفان حاصل نہ کر لے۔ اپنے بڑگوڑے اس میں نہ جلائے۔ جب تک پوری کیفیت اُس پر نہ واپس دے وہ بات کرنے کا مجاز نہیں، میں نے کہا یہ تو ہمارے صوفی بھی کہتے ہیں کہ صاحبو جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان یا اقرار نہیں کرنا چاہیئے۔ اُس نے کہا۔ میں صوفی کو تو نہیں جانتا، لیکن ہمارے یہاں یہی بات ہے کہ اگر میں نے کھیت میں کام نہیں کیا تو کھیت کی بات نہیں کروں گا۔ اگر فیکٹری میں کام نہیں کیا تو فیکٹری کی بات نہیں کروں گا اور اگر سکول میں نہیں پڑھا تو درس و تدریس کی بات نہیں کروں گا۔ میں نے کہا گویا تمہارے یہاں صاحبِ حال ہی اپنے حال کی بات کر سکتا ہے۔ اُس نے پوچھا صاحبِ حال کا کیا مطلب ہے میں نے کہا۔ صاحبِ حال وہ ہوتا ہے جو ایک تو حال پر گنڈ رہا ہو نہ ماضی کی یادیں مبتلا ہو نہ مستقبل سے خوفزدہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس پر ایک خاص علم کا ایک خاص عمل کا اور ایک خاص کیفیت کا تاثر ہو۔ ہمارے یہاں صوفیا راسی بات کہتے

ایسا اعلان کرنے اور راسی تحریر لکھنے سے منع کرتے ہیں جو مستحکم کی اپنی کیفیت نہ ہو اپنا حال نہ ہو مثلاً ایک خاص کیفیت، ایک خاص جذب، ایک خاص واردات کی بدولت جو کہا جائے یا لکھا جائے اُسے تو حق سمجھتے ہیں باقی کو ناحق۔ اپنا حال ہے تو نظم، غزل، نعت لکھنے کو مجاز سمجھتے ہیں۔ طرح مصرع پر غزل لکھنے کو ریا اور منافقت پر معمول کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنا حال ہے اور خلقِ خدا میں رہ کر زندگی بسر کی ہے اور ان کی زندگی اور ان کی کیفیات اور ان کی مشکلات اور ان کے انساؤ کو حال بنایا ہے تو مضمون لکھ سکتے ہیں ورنہ ریا کاری ہے اور خلقِ خدا کے ساتھ منافقت ہے نہ جو پاؤچی نے ڈائری نکال کر عینی زبان میں 'حال' اور صاحبِ حال کی ترکیبیں لکھ لیں اور ہنس کر مجھ سے پوچھنے لگا۔ تم صاحبِ حال ادیب ہو؟ میں نے کہا میرے چار افسانے صاحبِ حال کی کیفیت کے ہیں باقی کے تین سوانحارہ مضمون منافقت اور ریا کے ہیں۔ اُس نے ہنس کر کہا، 'بڑی خطرناک پروپوشن ہے' میں نے کہا ایسے ہی ہے اور یونی ہوگا، پھر اُس نے پوچھا یہ باتیں جو تم نے ابھی بتائیں کسی کتاب میں ہیں جو میں واپس کر لیتی جا کر خرید سکوں میں نے کہا ایسی تو کتاب نہیں۔ 'تو پھر تم نے کہاں سے سُنیں؟'۔ اُس نے پوچھا۔ میں نے کہا 'ان بابوں سے جو ہمارا پُرانا نظم رکھتے ہیں۔ اُس نے خوش ہو کر کہا 'تو گویا تمہارے یہاں بھی یہ سسٹم ہے۔ فیکٹریک کا 'تم لوگوں سے ملتے ہو اور ان سے سیکھتے ہو' میں نے کہا ایسا تو کوئی سسٹم نہیں۔ میں تو اپنے شوق کی غرض سے گیا تھا۔ صوفی ازم کا علم سیکھنے اور انہوں نے میرے ہاتھ میں ایک گھگھوٹھا دیا کہ خلقِ خدا کی خدمت کرو۔ فیض یاب لوگوں کی صحبت میں رہو، ماسے درجے آپ سے آپ مل جائیں گے۔ ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں...

وادیہ جو پاؤچی نے سر ہلا کر کہا: خوب لوگ ہیں تمہارے ملک کے، اصل پتے سڑنگ گولڈ میں نے کہا میں نے اُن سے ملنا ترک کر دیا ہے۔ بے چارے اور اُن پڑھ سے لوگ ہیں۔ لباس میں بھی مجھ سے مختلف، تعلیم میں بھی مجھ سے مختلف اور سوچ میں بھی مختلف۔ ان کی تو بولی بھی میری بولی سے مختلف ہے۔ کہتے ہیں اگر خدا کو راضی کرنا ہے تو اُس کے محبوب کو خوش کرو اور خدا کا محبوب وہ انسان سمجھتے ہیں جسے اُس نے بنایا۔ پھر اپنی روح اس میں چھوٹی پھراس کے لیے عزائیل کو ابلیس بنا کر ذلیل و خوار کیا۔ وہ کہتے ہیں اُن کا مقام حاصل کرنا ہے تو خدا کے محبوب کی

خدمت کرو۔ اس کو خوش کرو۔ اس کی خوشامد کرو وہ آپ سے آپ ہاتھ میں آجائے گا۔ عین اسی طرح جس طرح عاشق کے روبرو محبوب کی تعریف کرنے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے سے عاشق خوش ہوتا ہے، چو پاؤچی نے کمر کی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کو خوش اس کو کو خدمت اس کی، بڑا آسان کام ہے۔ تم کہتے کیوں نہیں ہو؟ تم کو تو تمہارا خدا بھی انہی کی بدولت مل رہا ہے؟ میں نے چو پاؤچی کو خوش کرنے کی غرض سے کہا: ہمیں خدا نہیں چاہیے یا۔ ہم پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگ ہیں، ہم خدا کو لے کر کیا کریں گے اور چونکہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں اس لیے ہم نے اس کے محبوب کو لے کر چاہنا ہے؟ ہمیں تو اس کے جھٹلانے کے لیے اور اس کا بطلان کرنے کے لیے قدم قدم پر اس کے محبوب کے ناسیں دھواں دینا پڑتا ہے، اسے ٹھکلی پر کھینچنا پڑتا ہے۔ چاہے سرکاری دفتر ہو چاہے سبزی منڈی ہو، چاہے بازار ہو چاہے حویلی ہو، چاہے ادبی محفل ہو چاہے منار عید ہو ہمیں کسی نہ کسی صورت اس کے محبوب کو چاٹنے مار کر سیدھا رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کریں تو کیمخت سر چڑھ جائے۔ میری بات سن کر چو پاؤچی زور سے ہنسا:

عمر نے نعرہ مار کر کہا: ختم کر اپنی رام کہانی۔ بکواسی کہیں گا۔ نہ قصوف سے واقف نہ مار کمر سے۔ یادیاں مارے جاتا ہے دیسی بابوؤں کی طرح۔ اوئے سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں دیسی اور پینڈو علموں کا کیا فائدہ؟

"شاہاش" اٹھلی نے کہا: دیسی علم سے تو دیسی کنگ ہی پیدا ہوگی۔ نس بندی کا علم تو نہیں آسکے گا۔

"تو بھی نہ بک"۔ لیڈر نے جھڑک کر کہا: ہر بات میں محنت ہی سوجھتی ہے۔ سیدھی طرح سے بول بھی نہیں سکتا۔

ہم نے اپنی اپنی کٹھیں اٹھائیں۔ ان میں طے شدہ اصول کے مطابق پیاپیاں، چائے کا ڈبہ، چینی اور خشک دودھ کے ڈبے، کیتل اور پین، ڈالے اور پھر آگے کی طرف چلنے لگے۔ اب مفتی کی طبیعت کچھ بوجھل ہو گئی تھی اور اس کے قدم مشکل سے اٹھتے تھے وہ بار بار گرکتا اور ہم سب سے آگے چلنے کو کہتا، لیکن کوئی بھی اس کو پیچھے چھوڑ کر چلنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مسکو

کا خیال تھا کہ اسے ایک چٹان کی اوٹ تلے بیٹھنا اور آرام کرنا چاہیے اور سفر ترک کر دینا چاہیے۔ لیڈر بغد تھا کہ اگر ہم میں سے ایک بھی پیچھے رہ گیا تو ہم کا لطف ادا ہوا جائے گا۔ میری، عماد کی اور اٹھلی کی کوئی رائے نہ تھی۔ ہم اچھے عوام کی طرح بڑے لیڈروں کے آخری فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں بادل زور سے گر جا اور ہم سب نے نگاہیں اُپر اٹھا دیں۔ صرف مفتی اپنی چھڑی پر جھکا جو اچھے راستے کو دیکھتا رہا۔ لیڈر نے کہا: بارش کے آثار ہیں مفتی کا ساتھ چلنا ٹھیک نہیں، بس کو بڑی تکلیف ہوگی۔ لیڈر کے بدلے ہوئے نظریے پر مفتی کو کدھ پہنچا، لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ کوئی سوگڑ کے فاصلے پر ایک بڑی سی چٹان پہاڑ کے پہلو سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ لیڈر ذلیل لگا کر اسے دیکھنے لگا اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد زور سے بولا: لے آؤ اس کو۔ بڑی فٹ کلاس جگہ ہے۔ لیٹ بھی سکتا ہے، بیٹھ بھی سکتا ہے۔ ہم مفتی کو بانوؤں سے بکر لکر اس طرف لے چلے۔ اس کو ہمارا سہارا دینا اچھا نہ لگا اور اس کے چہرے پر تکد کے آثار پیدا ہو گئے۔ دراصل مرد کا مرد کو اور عورت کا عورت کو سہارا دینا بڑا ناگوار گزرتا ہے جن لوگوں نے زندگی میں آپ کو سہارا دیا ہو یا آپ پر احسان کیا ہو، وہی آپ کو سب سے زیادہ بُرے لگتے ہیں اور آپ ان کی جان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ سہارا لینے کے لیے آپ کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ کمزور ہیں اور آپ کو کسی کی مدد کی ضرورت ہے۔ سہارا دینے والا جب پہلی مرتبہ آگے بڑھ کر آپ کا ہاتھ تھامتا ہے، تو آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک قوی، جھیل، مضبوط، تنومند پہلوان غم ٹھونک کر اکھاڑے میں اترتا ہے اور اس نے آپ کے ساتھ پنجہ ملایا ہے۔ جب وہ آپ کو سہارا دیکر پہلا قدم اٹھاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے آپ کو اڑھنے پر چڑھایا اور دوسرے قدم پر پٹخنی دے دی۔ اس سے پٹنے اور شکست کھانے کے بعد آپ کے پاس زندہ رہنے کے لیے ایک ہی آرزو رہ جاتی ہے کہ کب وہ دن آئے جب میں اس کو چڑھتی پر چڑھا کر اس طرح پٹخنی دوں اور اپنی مزیت کا بدلہ اُتار دوں۔ سا اہما سال گزرنے کے بعد جب سہارا دینے والا آپ کے ہاتھوں پٹتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ میرے ساتھ یہ سلوک ET TN BRATE لیکن یہی لکھا کہ جب انسان کو مخالفت جنس سے ملتا ہے تو اس کی ساری عمر سہارا دینے والے ہاتھ کو چومتے اور اس کی کلائی سے گال رگڑتے گزرتی ہے اور اسے ہر گھڑی

یہی خوف لگا رہتا ہے کہ یہ ہاتھ مجھے چھوڑ نہ دے، مجھ سے دُور نہ ہو جائے۔

اس معاملے میں عورت کو مرد پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ بچے کو سہارا دیتی ہے جو ان کا محکمہ بنتی ہے اور بوڑھے کو انگلی سے پکڑ کر گورت تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔ جوانی میں عورت کا یہ کمال اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اُس کی نگاہ انتخاب جب اپنے محبوب پر پڑتی ہے تو اس کا سب سے پہلا سنجیدہ سوال یہ ہوتا ہے کہ ”آپ اس طرح سے کیوں رہتے ہیں؟ اور اس طرح“ کی تفصیلات ہم کرنے میں مرد کیسے کامیاب ہو سکتا ہے اور اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اُس کے دُکھ درد میں شریک ہونے کے لیے ”مے آئی کم ان پلیئر“ کہہ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دے رہا ہے۔ مرد کا جواب عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ ”مجھے آج تک کسی نے سمجھا نہیں اور میری ضروریات کی طرف توجہ نہیں دی۔ ان ضروریات میں خوراک، لباس، سیکس، محبت، تفریح اور دھول دھپا سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ لڑکی کبھی اُس سے یہ نہیں کہتی کہ آج سے میں آپ کو سمجھنے کی کوشش کروں گی یا میں آپ کی ضرورتیں پوری کروں گی یا میں آپ کو سہارا دوں گی۔ وہ تو بس چپ چاپ تنگی باندھ کر اپنے محبوب کو تنگ جاتی ہے اور اس کی آنکھوں کے اندر ایک نازک سا ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور محبوب کا سارا وجود اس کے ساتھ جھونے لگتا ہے اور جب ان کی شادی ہو جاتی ہے تو پہلی ہی رات کو نو جوان اپنی زندگی کے سارے واقعات، سارے دُکھ، ساری کلفتیں کھول کر رکھ دیتا ہے اور اپنے عزیز دل، رشتہ داروں، دوستوں اور مہربانوں کے سلوک اس کے قدموں کے سامنے اس طرح بکھیر دیتا ہے کہ دُہن کے نازک پاؤں کو ٹھوکر لگانے میں آسانی رہے اور ٹکڑی ایسے ہونٹوں کو لفظوں بھیجنے میں وقت نہ ہو پھر شادی کے دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ مرد اپنی ساری کلفتیں، سارے دُکھ، سارے بوجھ ایک ایک کر کے گھراتا رہتا ہے اور یہی وہی سے مزید سہارے کی التجا کرتا رہتا ہے۔

مُنتی چونکہ مرد تھا اور اُسے سہارا دینے والے ہم سب اُس کے دوست بھی مَرُو تھے، اس لیے اُس کے چہرے پر تکرار کے آثار پیدا ہو گئے اور اُس نے ان ہاتھوں کو پسند نہ کیا جنہوں نے اس کے بازو تھام رکھے تھے۔

جب ہم اُس کچھوہ کے پاس پہنچے جہاں مُنتی کو بٹھانا تھا اور ہمیں آگے جانا تھا اور پھر لوٹے ہوئے اس کو وہاں سے لینا تھا تو میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ ایک سا دھو تھا بڑی عمر کا جس نے گیسو کے کپڑے پہن رکھے تھے اور سر اور بھونوں منڈائی ہوئی تھیں اور اس کے پاس پیتل کا ایک تالوٹ تھا اور وہ برگد کے تنے کے سہارے بیٹھا تھا۔ اتنے بڑے برگد کے نیچے جتنے بڑے برگد تھے مہما بڈھ کو زوان ہوا تھا۔ یہ برگد ہمارے قبضے کے سکول سے کوئی فز لانگ بھر کے فاصلے پر تھا اور اس کے نیچے اتنا اندھیرا تھا کہ ہم لڑکے کبھی اُس کی چھاؤں میں سے نہ گزرے تھے۔ مجھے جب بھی کسی آسیب زدہ جگہ کا خیال آتا ہے اُس برگد کا اندھیرا اُس کے پتوں کی گرد اور اُس کی ڈاڑھیوں کے کچھ ضرور یاد آ جاتے ہیں۔ میں اُس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور نیک بہن کر سکول جاتا تھا جس دن پہلے پہل میں نے اُس سا دھو کو اس برگد تلے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ سُرخ کشمکش ہوئی مٹی کا ایک بُت ہو جس کی آنکھوں میں گہرے سبز رنگ کے کپنے پڑے ہوں۔ میں نے اُسے حرکت کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ جس مقام پر پہلے دن دیکھا تھا، دو تین مہینے تک اسی طرح اسی حالت میں دیکھتا رہا۔

پھر ایک دن وہ سا دھو لیٹ گیا اور اُس کا تالوٹ بھی اُس کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اپنی دنوں ہمارے قبضے میں سُرخ آندھی آئی اور سارے گھر سُرخ مُنتی سے اُٹ گئے سا دھو کے جسم پر برگد کے پتوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ پھر ایک دن بارش برسی۔ زور کی موسلا دھار بارش اور وہ سا دھو کئے جسم سے سارے پتے بہا کر لے گئی۔ دوپتے اُس کے لیٹے ہوئے تالوٹ میں اُسی طرح پڑے رہے۔ میں سکول سے آتے جاتے نظریں چڑا کر اس سا دھو کو ضرور دیکھا کرتا میری رفتار برگد کے پہلو میں قدرے سست ہو جاتی اور میں خوف کے مارے تیزی سے چل نہ سکتا۔ پتے نہیں وہ خود بھول کر ادھر آگیا تھا یا اُس کے گھر والے اُسے بھول گئے تھے یا شاید کسی سے بھی بھول نہ ہوئی ہو اور زوان کی طلب اُسے یہاں لے آئی ہو۔ دراصل بھول اور طلب میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ طلب جب صادق ہو جاتی ہے تو بھول بن جاتی ہے۔ طالب کو اپنا پڑا یا، دوست دشمن گرد و پیش، خود اپنا وجود کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ بس ایک طلب کی جھنجھیری سی گھومتی رہتی ہے، باقی سب کچھ لا ہو جاتا ہے۔ محبوب بھی جب اپنے چاہنے والے کو بھول جاتا

ہے، تو طلب کی ایک بھنبھیری سی بن جاتا ہے۔ جاہ کی طلب، زر کی طلب، نمود کی طلب، آسائش کی طلب اُس کے چاہنے والے کی تلاش بن کر اسے کوہِ کونولے پھرتی ہے۔ ایسا ہی وہ سادھو تھا۔ نہ وہ کسی کو ٹھوٹا تھا نہ کسی نے اُسے ٹھلا یا تھا۔ بس برگد کے نیچے ذرا سستانے اور دم لینے کو ٹھہر گیا تھا اور اُس کا یہ ”دم“ بہت ہی لمبا ہو گیا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اُس بُت کے چہرے پر ڈاڑھی بڑھی، جنوں نکلیں، ابرن گل کر بدن پر جیتھڑے بن گیا۔ سترنگا ہو گیا اور میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ مومے زہار کو دیکھا۔ گرمیوں کی ٹھنڈوں سے کوئی دس دن پہلے میں نے سکول جاتے ہوئے اُس بُت میں حرکت کے آثار دیکھے۔ اُس کے گھٹنے اوپر کوٹھتے تھے اور پھر نیچے بیٹھ جاتے تھے۔ سر ہلکے ہلکے دائیں بائیں ہلاتا تھا اور ایک ہاتھ میں بھی جنبش تھی۔ جب میں دوپہر کے بعد سکول سے لوٹا تو سادھو کے جسم کی حرکت بند ہو چکی تھی اور وہ پیلے دھاری دھار جھونڈ اُس کی آنکھوں پر بیٹھے تھے۔ رات بھر اُس کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا۔ اگلے دن سکول جاتے ہوئے میں نے حوصلہ کر کے برگد کے نیچے نگاہ ڈالی تو سادھو ابھی تک وہاں لیٹا ہوا تھا اور اُس کے چہرے اور اُس کی ننگی رانوں کے ساتھ بے شمار جھونڈ اور جھڑپیں چھٹی ہوئی تھیں۔ شام کے وقت کیٹی کے چوڑھے اُسے گند گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔

جب مفتی اپنی چھڑی زمین پر رکھ کر اس کھود میں بیٹھنے لگا، تو میں نے چیخ مار کر کہا: ”یہ نہیں ہو سکتا۔ مفتی یا تو ہمارے ساتھ چلے گا یا ہم سارے نہیں جائیں گے۔“

”لیکن کیوں بٹا لیڈر نے تنک کر پوچھا۔“

”اس لیے کہ اسے ہمارے ساتھ ہی رہنا ہو گا۔ ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔“

”کوئی بات نہیں یا رب مفتی نے مصاحمت آمیز لہجے میں کہا: تم لوگ جھیل دیکھ آؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

ہم سب نے مسعود کی ہاں میں ہاں ملائی اور مفتی اپنی سوٹی اٹھا کر پھر ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

راستہ لمبا تھا۔ جھیل ابھی دُور تھی اور اُونچائی تیزی سے اوپر کو اٹھتی جا رہی تھی۔ ہم چند قدم چلے ہوں گے کہ مفتی کو سانس لینے کے لیے پھر رگنا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی سارا قافلہ لگ گیا۔ جب قافلوں کا زمانہ تھا اور لوگ سفر اختیار کرنے کے لیے ہمتوں، مہینوں بلکہ سالوں تک ہم سفروں اور کاروانوں کا انتظار کیا کرتے تھے کہ کب آئیں یا کب روانہ ہوں تو شریک سفر ہوں۔ یہ قافلے اور کارواں دوران سفر ایک فرد کے لیے ٹھہرایا کرتے تھے اور اس وقت تک ٹھہرے رہتے تھے جب تک اس فرد کی ضرورت پوری نہ ہو جاتی تھی۔ یہ اجتماعی دُور تھا اور آدمی ایک دوسرے کی لڑی میں پرموئے ہوئے نیچر کے ساتھ بندھے تھے، لیکن جب انفرادیت کا دُور آیا تو افراد ایک دوسرے سے الگ ہو کر منفرد ہو گئے۔ منفرد سوج، منفرد مزاج، منفرد شوق، منفرد پسند، اس انفرادیت نے انسان کو بڑے خوشنما اور رنگین تحفے عطا کئے۔ اس کے وجود میں ہنس اور سُرخاب کے پرنکھل آئے، لیکن وہ اکیلا ہو گیا۔ خوفناک اور زور آور دنیا کا سامنا کرنے کے لیے بے یار و مددگار نیک و تنہا۔

ایک امریکی عورت سر پر پیلا رومال باندھے ٹو پر سوار جھیل دیکھ کر واپس آ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ ساتھ سیاہ ڈاڑھی والا ایک لُٹا گا ئینڈ چل رہا تھا اور ان کے پیچھے بھوری ڈالھی اور سُترے بالوں والا ایک لمبا ترنگا کوہستانی مرکوجار ہاتھا۔ لیڈر نے اُسے روک کر کہا، ”خان ہمارے ساتھی کو اٹھا کر جھیل تک چلو گے۔ ہم تمہیں دس روپے دیں گے۔“ دس روپے کا نام سن کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی چپلی کے بند کئے لگا۔ پھر اٹھ کر بولا: ”کون دوست ہے تمہارا؟“

”یہ مسعود نے سوٹی سے مفتی کی طرف اشارہ کیا اور مفتی نفی میں سر ہلا کر بولا: ”نہیں یا رب اس کی پیٹھ پر نہیں چڑھوں گا۔ میں چلوں گا۔“

”کیوں نہیں چڑھو گے؟“ اعلیٰ نے حیرانی سے پوچھا۔

”یہ انسان کی بے حرمتی ہے،“ مفتی بولا اور آگے چلنے لگا۔

”اوسے ٹھمر۔ لیڈر کرو کا۔“ آیا کمیں سے بڑا ترقی پسند۔ روز تمہارا کیا خیال ہے ہم آدمیوں کی بیٹیوں پر نہیں چڑھتے؟“

”چڑھتے ہیں۔“ مفتی نے رک کر کہا۔ لیکن اس طرح سے نہیں۔ چالاک سے چڑھتے ہیں۔ محبت سے چڑھتے ہیں۔ بشیاری سے چڑھتے ہیں۔“

”تو اب بھی بشیاری کے زور پر چڑھ جا۔“ مسعود ہنس کر بولا اور پھر ہم سب ہنسنے لگے۔ کوہستانی کو ہماری ہنسی بڑی بے معنی سی دکھائی دی اور وہ باری باری ہم سب کا منہ تکتے لگا۔ ”کوئی بات نہیں مفتی جی۔“ عماد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”چڑھ جاؤ کوئی نہیں دیکھے گا۔ کوئی نہیں بتائے گا۔“

مفتی کچھ ڈانواں ڈول سا ہو گیا تو لیڈر نے اپنی سوٹی اوپر اٹھا کر کہا۔ ”لو بھی قسم کھاؤ خدا کی جس نے کوہستانی اور اس کی بیٹی پیدا کی ہے کہ کوئی بھی واپس جا کر یہ نہیں بتلائے گا کہ مفتی نے راستے میں ایک آدمی پر سواری کی تھی۔“

ہم سب نے یک زبان ہو کر قسم کھائی اور اس عہد کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے دایں ہاتھ اوپر ہوا میں اٹھا دیئے۔ کوہستانی زمین پر بیٹھ گیا اور مفتی اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ ہم پھر اسی طرح سے چلنے لگے۔ کچھ اونٹ کی چال اکیلے سرخسے کی چال اور کچھ دھڑوٹے ہوئے کتے کی طرح۔ ہمارا اور مفتی کی ڈنڈا ڈولی کا فاصلہ کوئی دس قدم کا تھا۔ اچانک اس نے آواز لگا کر کہا۔ ”ہٹ جاؤ۔ ایک طرف ہو جاؤ۔“ بھگت کبیر کی بیوی آرہی ہے۔ مفتی کی آواز سن کر ہم ٹک گئے اور کوہستانی اسے لے کر ہمارے قریب آ گیا۔ مفتی نے کوہستانی کے گلے میں بازو ڈالے ڈالے کہنا شروع کیا کہ ایک روز بھگت کبیر مہاراج کے گھر چند سا دھو مہمان آئے۔ اتفاق سے اس وقت ان کے گھر پر کھانے پینے کی کوئی چیز موجود نہ تھی اور مہمانوں کو بھوکا رکھنا کبیر جی کا دھرم نہ تھا۔ بہت پریشان ہوئے اور اپنی بیوی سے کہنے لگے۔ اب کیا علاج کیا جائے؟ بیوی نے کہا۔ مہاراج کہنے کی بات تو نہیں، لیکن اب مشکل ایسی آپڑی ہے کہ کسے بنارہا بھی نہیں جاتا۔ ایک بنیا مجھ پر عاشق ہے اور مجھے دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھر کر رہے۔ مگر کم تو اس سے کچھ سودا لے آؤں۔ کبیر جی نے کہا نیکی اور پوچھ پوچھ۔ جاؤ شکار کرو۔ کبیر کی بیوی

جو نہایت خوبصورت اور ہلکی حسین ختی بننے کی دکان پر گئی اور کہا بے وقت مہمان آگئے ہیں۔ گھر پر کوئی چیز موجود نہیں۔ ان کے لیے اتنا سامان مطلوب ہے۔ بننے نے کہا اس شرط پر دیتا ہوں کہ تورات کو میرے پاس سب سے اور میری بغل گرم کرے۔ کبیر جی کی بیوی نے حامی بھر لی اور بننے کی شرط مان کے سودا لے آئی اور مہمانوں کو کچا کر کھلا دیا۔ جب رات زیادہ ہو گئی تو بھگت کبیر نے کہا لو اب کپڑے بدلو۔ زلیو پہننا اور جو وعدہ بننے سے کیا ہے اسے پورا کرو۔ بیوی نے بارہ ابرن اور سولہ سنگھار کیے اور کبیر جی اسے اپنی بیٹی پر لا کر بننے کے گھر کی طرف لے چلے۔ بڑی محبت سے لے جا کر اسے بننے کے دروازے پر جاتا رہا اور خود پلٹ آئے۔ بنیا اپنی محبوبہ کو دیکھ کر خوشی سے چھو لانا سمایا اور اس کی نگاہیں سر سے پاؤں تک نشانہ ہونے لگیں۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی اور ساری گلیاں کچھڑے بھری تھیں اس لیے اپنے محبوبہ کے پاؤں دیکھتے ہی حیران ہو کر لولا تمہاری جوتیاں کیوں صاف ہیں؟ ذرا کچھ نہیں لگی۔ کبیر مجھے اپنی بیٹی پر لا کر یہاں لایا ہے۔ یہ بات سننے ہی بننے کی حالت بدل گئی۔ قصور معاف کرایا اور کہا۔ تو میری ماں ہے۔ آٹے دال کا بھاؤ سب بھول گیا اور رام نام کا جاپ کرتا ہر دوار کی طرف نکل گیا۔

عظمیٰ نے سنجیدگی سے کہا۔ ویسے مفتی شکل و صورت سے اس وقت تو کبھی ہماری ماں ہی لگتا ہے، بتا تم کہہ کر کھل جائیں؟ ہم ہنسنے تو کوہستانی نے کہا۔ آگے چلو صاحب تمہارا یہ دوست کافی وزنی اے۔ جب ہم چلنے لگے تو میں نے زور کی ایک ہانک لگائی کہ سہ

کبیر ایلے ہو رہو جیسے زبل نیر
چھیچھے پیچھے پر پھرے کمت کبیر کبیر

مسعود ٹپ گیا اور رنگ کر بولا۔ شاہ جی اسے پھر پڑھو اور اس وقت تک پڑھتے رہو جب تک تمہاری سانس نہ ٹوٹ جائے۔ میں نے بڑی مشکل سے پہلا مصرعہ پڑھا اور میری سانس ٹوٹ گئی۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو یہ دوہرہ ہمیں صوفی قہتم نے سنا یا تھا۔ اس وقت بانو قدسیہ بھی ہمارے ساتھ پڑھتی تھی، لیکن جس دن صوفی صاحب نے یہ دوہرہ سنا یا تھا

اُس روز وہ چھٹی پر تھی مجھے یہ دوسرہ وہ دن، قدسیہ کی چھٹی اور صوفی صاحب کا اُس دن کا لباس آج بھی اُسی طرح سے یاد ہیں اور میں ان ساری چیزوں کو بلا کر ایک تصویر بنا سکتا ہوں۔ عورتوں کو واقعات اور حادثات میں حیرت الموعود یاد رہتے ہیں اور مرد کو ان کی تفصیلات یاد رہتی ہیں عورت خالق ہے اور مرد کو انفس میں ہے۔ عورت اپنے اندر ہی سے پرانا سُرا نامہ مواد لے کر ایک جیتا جاگتا برینڈ نیو پوجہ تخلیق کر دیتی ہے اور مرد بھاگ بھاگ کر اور چار دانگ عالم ہے چھوٹی چھوٹی چیزیں کٹی کر کے بڑی چابکدستی کے ساتھ ایک مودی کیمرو ایک دی۔ ٹی۔ آر۔ ریکارڈر یا ایک فوٹو سٹیٹ مشین بنا سکتا ہے۔ مرد پرفیکشنسٹ ہوتا ہے اس لیے اس کی نظر ہمیشہ جزئیات پر رہتی ہے۔ زندگی اور محبت کے میدان میں وہ چھوٹے چھوٹے پہچ اور ڈھب ہاں کتا چلتا ہے اور اس کا ایک قیچ ڈھیلا ہو جانے سے ساری مشین لڑکھڑانے لگتی ہے۔ عورت کے تانے بانے کا مواد ایک ہی ہوتا ہے کہیں سے ایک تار بھی ٹوٹ جائے تو جی کپڑے کی مجموعی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ہم سارے دوست آہستہ آہستہ منہ کی ڈنڈا ڈولی کے آگے چلے جا رہے تھے اور ہم میں سے ایک ایسا بھی تھا جس نے سولہ سال ایک لڑکی کے ساتھ بے پناہ محبت کی تھی اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی ساری زندگی اس محبت کی دہلیز پر قربان کر دی تھی۔ ابتدا میں جب ان دونوں کی نگاہیں آپس میں ملیں تو لڑکی گرم شال کی نگل مار کر سویٹ پٹنے لگی اور ہمارا دوست شام کے وقت چوبارے کی کھڑکی میں کھڑا ہو کر اُس چاند کا تنہا رہ کرنے لگا جو شہر پر چمکتا تھا اور جس پر اس لڑکی کی نگاہیں بھی مرکوز ہو سکتی تھیں۔ اپنے گھر کے غسل خانے میں وہ پانی کے تل کو تمام کر گھنٹوں کھڑا رہتا کہ شاید شہر کے دوسرے کونے پر مزہ لاقو دھونے کے لیے اُس نے بھی تل کھولا ہو اور زمین کے اندر ہی اندر جہتی پاپنوں کے راستے اُس کے ہاتھ کا لمس یہاں تک پہنچ گیا ہو۔ اُس کی نوٹ بک میں شہر کے ان تانگوں کے نمبر تھے جن میں اُس نے اس مقصد سے سواری کی تھی کہ شاید ان میں کبھی فرزانہ بیٹھی ہوگی۔ اُس نے اپنے شہر کے ہر کھمبے کو ہاتھ لگا کر دیکھا تھا کہ شاید راہ چلتے ہوئے کبھی فرزانہ کا ہاتھ یا رقبے کا کوئی اس سے ٹکرایا ہو۔ ہم سب فرزانہ کو جانتے تھے اور اپنے اپنے طور پر اُس کی طبیعت سے واقف تھے۔

اُس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ وہ ہمارے دوست کو چاہتی ہے یا اُس پر اسی طرح سے مرقی ہے جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وہ مڑ رہا تھا۔ فرزانہ تو اپنے جسم کے خام مواد سے ریشم کے کپڑے کی طرح ایک تار سا نکال رہی تھی اور اس میں لمبائی جابر جاتی تھی۔ اس کو خدا کے چاند یا کیمٹی کے ٹکے یا بجلی کے کھمبے کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ اس کے اس طرح پلٹے جانے کی کیفیت نے ہمارے دوست کو عجیب طرح کے واہموں میں گرفتار کر دیا تھا۔ خود ہم بھی کبھی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تھے کہ فرزانہ کو اس سے محبت ہے یا نہیں۔ پھر ان دونوں کے درمیان خط و کتابت شروع ہو گئی۔ دونوں طرف سے محبت کے اقرار ہونے لگے۔ وعدے وعید ہونے لگے۔ ہجر اور بے قراری کی داستانیں بیان ہونے لگیں اور دونوں کے درمیان کسک کی جگہ تڑپ نے لے لی، لیکن دونوں کی بنیادی خصوصیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ ہمارا دوست جب اُس کے نام خط پوسٹ کرنے جاتا تو اُس بس کا ٹکٹ سنبھال کر رکھ لیتا جس میں سوار ہو کر وہ جی پری او گیا تھا۔ بس سے اتر کر لیٹر بکس تک جاتے ہوئے وہ ہر مرتبہ اپنے قدم ضرور گنا کرتا۔ اور انہیں اس ٹکٹ کی پشت پر رقم کر لیا کرتا۔ جی پی او کی سیرٹھیاں چڑھتے ہوئے وہ ہر بار اس کنکر کو ضرور اٹھایا کرتا جو سیرٹھی پر قدم دھرنے سے پہلے اس کے پاؤں تلے آیا ہوتا۔ اُس کے پاس بس کے بہت سے ٹکٹ، کنکرول کی ایک پوٹلی اور قدموں کی بے شمار گنتی جمع ہو گئی تھی۔ فرزانہ کے پاس صرف اُس کے خط تھے، بدن کے گرد شمیری شال تھی اور دل میں شاید اُس کی یاد تھی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کے درمیان ملاقاتیں ہونے لگیں۔ طویل اور خاموش ملاقاتیں۔ فرزانہ کے سادے گھر والے ڈرائنگ روم میں جمع ہوتے ہمارا دوست بھی پہنچ جاتا۔ چائے کا دُور چلتا، سیاست پر گفتگو ہوتی، فلموں کی باتیں ہوتیں، ریڈیو پر گراموں پر تنقید کی جاتی اور رات گئے ہمارا دوست گھر واپس لوٹتا۔ ان طویل اور لا تعلقی ملاقاتوں میں فرزانہ اور ہمارے دوست کے درمیان تعلق کا بس ایک ہی فقرہ ابھر کرتا اور وہ بھی لفظوں کے بغیر۔ جب ان دونوں کو سب کی موجودگی میں اظہار محبت کرنا مقصود ہوتا یا ان کے سینے محبت کے بوجھ تلے چٹختے لگتے یا ایک کر بنا کر جین اُن کے وجود کے اندر گونج بن کر گھومتی اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملتا تو وہ اپنی پوری آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور پھر تین مرتبہ اپنے پوٹوں کو

مہینوں پر مہینے اور برسوں پر برس گزرتے رہے اور ان کے درمیان اکٹھیں کھولنے اور بند کرنے کا سلسلہ سولہ سال پر محیط ہو گیا۔ اس اثنا میں ہم سب نے اپنے دوست کو مختلف قسم کے مجرب نسخے عطا کیے۔ اپنے اپنے تجربات سے نوازا اور اس کو جہانی محبت کی طرف شدت سے اکسایا، لیکن اُس کا بخن ایسا جام ہو ا تھا کہ اُس طرف گتیر ہی نہ بدلتا تھا۔ اُس نے کئی مرتبہ کوشش کی، کئی سیکمیں بنائیں، ہم نے بھی مواقع فراہم کیے، لیکن وہ چوٹوں کے بسط و کشا سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ہمارا خیال ہے اس لڑکی کی چند برگزیدہ سہیلیوں نے بھی اس کو ایسے ہی مشورے دیئے ہوں گے جہی تو وہ ہمارے دوست کی پیش قدمیوں کے آگے استقبال بن گئی۔ پھر ان دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ ملاقی شدن ہیرا بار ابھاد در باغ۔ اور وہ دونوں موت کے کنارے جا کھڑے ہوئے۔ ہمارا دوست موت کی پرچائیں بن گیا اور اُس پر دنیا کی ہر نعمت کے دروازے بند ہو گئے۔ آہستہ آہستہ زندگی پر اُس کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور وہ ایک ڈھنڈا رویہ رانے میں تبدیل ہو گیا۔ ہمارا نسخہ اُٹ ثابت ہوا۔ دراصل وہ اس مٹی سے نہیں بنا تھا جس سے عام لوگ بنتے ہیں اچھے شریف خوش وضع، خوش اطوار لوگ وہ ایسے گارے سے بنا تھا جو مسجد کے پر نالے سے برکزمین پر جمع ہو جاتا ہے اور جس میں مصلوں کے تنگے اور صفوں کے دھاگے شامل ہوتے ہیں۔ ایسی مٹی سے بننے والے لوگ نہ نمازی ہوتے ہیں نہ دنیا دار نہ فروغی، کھنگرے ہوتے ہیں کوئی انہیں ٹھوک بھی نہیں مارتا۔ ٹھوکریں کھانے والے لوگوں کی انا بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ ان میں زندگی کے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بھی رہتی ہیں، لیکن دُھندلانے تک ایک ہی کلائی سے وابستہ ہو کر اس کا عکس دیکھتی رہتی ہیں۔ اس ملاقی شدن سے ہمارا دوست اور گھمبیر اور غم ناک اور خاموش ہو گیا جیسے لمبی اونٹنی سانس بھرنے سے بے شمار اور چھوٹی چھوٹی آہیں سینے میں سنبولیوں کی طرح کبلانے لگتی ہیں جیسے نکسیر میں ناک صاف کرنے سے ٹخن اور تیزی سے بہنے لگتا ہے۔

یلمڈ زور سے چیخا: "اے اشفاق تو پھر بھی رہ گیا"
 میں نے نگاہیں اوپر اٹھا کر دیکھا تو میرے ساتھی ایک اونچی صدا کی حد تک مجھ سے دُور
 ہو گئے تھے۔ حماد چھڑی کا سہارا لے کر کبڑا سا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا
 شرارت تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور سنجیدگی سے
 بولا: "شاہ جی! سچ بچانا اس وقت کیا سوچ رہے تھے؟"

میں نے کہا: میں علم طبقات الارض کی بابت سوچ رہا تھا۔
اس نے چلنے کا اشارہ کر کے پوچھا: پھر کس نتیجے پر پہنچے؟
میں نے کہا: میں ذہن کی تہوں میں کچھ زیادہ نیچے نہیں پہنچا تھا کہ لیڈ نے آواز دے دی۔
ابھی اور نیچے جانے کا ارادہ تھا؟ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”لیکن جہاں تک پہنچے۔“ عمامہ نے کہا ”وہاں کیا دیکھا؟“

”وہاں! میں نے سرفخر کا کرکما۔ وہاں کیدی کے پاپتوں کا ایک جال بچھا تھا۔ کچھ کمزور ہو گئے تھے۔ کچھ کھنگرا گئے تھے۔ چند ایک میں سے پانی رسم رہا تھا، لیکن ہرنالی کے اندر سے سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔“

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا: اس بھرنے کو دیکھو شاہجی، کیا گیت گاتا ہوں؟
جواب ہے۔ یہ گلشنِ مریاں ہے اس میں گیت ہوتے ہیں سسکیاں نہیں۔“

میں نے کہا۔ اپنے اپنے کان ہیں عدا کسی کو گیت سنائی دیں گے کسی کو کہیں۔“
 اُٹھی نے پلٹ کر کہا۔ تو سالے دونوں پیچھے رہ گئے۔ مضمتی کی سواری ان کے ساتھ ساتھ
 جاری تھی اور اس نے کوہستانی کے ماتھے پر اپنے ہاتھوں کی گنگھی ڈالی ہوئی تھی۔ ماتھے کا

اور ہاتھ کا بڑا پڑا تار شستہ ہے۔ کچھ ہاتھ ملتے تک سلام کرنے کی عرض سے جلتے ہیں کچھ ٹٹلی ہوئی زلف اٹھانے کے لیے۔ کچھ ہاتھ ماتھا پر ڈکڑ بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ ہاتھ ماتھا پیچھے دبانے اور ہونٹ اوپر اٹھانے کی عرض سے بڑھتے ہیں۔ کچھ ہاتھ دُور دیکھنے کے لیے ماتھے کا سا تان بناتے ہیں اور کچھ پریشانی کے عالم میں جیسے بیانی کرنے لگتے ہیں۔ پھر کچھ ہاتھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مریض کے ماتھے سے لگتے ہی اس کی بیماری سلب کر لیتے ہیں وہ آنکھیں کھول کر اپنے پر جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتا ہے اور سارے میں روشنی پھیل جاتی ہے۔ الفاظ اظہار کا بڑا سہارا ہیں، لیکن ہم ان کے بغیر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ بدن کی بولی بڑی مؤثر بولی ہے اور انسان اس کا مطلب خوب سمجھتا ہے۔ ہر حرکت، ہر جنبش، ہر لچک اپنے اندر ایک معنی رکھتی ہے۔ اس کے لیے مخاطب کو کوئی ڈکشنری دیکھنی نہیں پڑتی کسی سے معنی پوچھنے نہیں پڑتے۔ جب آپ دل ہی دل میں کسی کی پذیرائی کرتے ہیں کسی کو قبولیت کا شرف بخشتے ہیں تو باتیں کرتے ہوئے آپ کے بازو کھل کھل جاتے ہیں اور ہاتھوں کی انگلیاں پھیل پھیل جاتی ہیں۔ آپ کرسی سے آگے جھک کر بات کرتے ہیں۔ میز پر کھینیاں ٹیک کر سر آگے کر کے بولنے لگتے ہیں۔ کوٹ کے گریبان کے یا بلاؤز کے بٹن کھولنے سے آپ کی مُراد یہ ہوتی ہے کہ اوتھیں اپنے دل میں بٹھاؤں۔ تم سے دل کی باتیں کروں۔

جب کوئی خوبصورت چودہ سالہ لڑکی سڑک پر سے گزرتی ہے تو نوجوان دکا نڈار دونوں ہاتھ پھیلا کر انہیں کمر کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ بزرگ اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتے ہیں۔ خوش پوش مرد کا ہاتھ اپنی ٹانگیں کی طرف بڑھتا ہے۔ اٹالوی لوگ اپنی دائیں گال پر دائیں ہی ہاتھ کی انگشت شہادت سے برہم چلانے لگتے ہیں۔ سسلی کے لوگ بائیں کان کی بن گوش کو دائیں ہاتھ کی پتلی سے جھٹکے دینے لگتے ہیں۔ جب آدمی پریشان ہوتا ہے تو ساکت ہو جاتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے کرسی کے آرمز پر ڈکڑ بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے کندھے بیجاگی کے عالم میں ذرا ذرا ہلتے ہیں اور پھر رگ جاتے ہیں۔ جو عورت اپنے دونوں بازوؤں کو سینے پر کڑنڈلا کر آپ سے باتیں کرتی ہے وہ مخاطب خود اختیاری کا اعلان کر رہی ہوتی ہے اور بازوؤں کی خضیل کے پیچھے سے آپ سے جملام ہوتی ہے۔ جو بار بار اپنے سینے کو دوپٹے سے ڈھکتا

ہے اور ہونٹوں تک ہاتھ لے جاتی ہے وہ کہتی ہے قبول کیا بعض ایک گفتگو کے ایک ملاقات کے قبول کیا، ایک مسکراہٹ نصف معقول نصف غیر معقول پر قبول کیا۔ جب چھوٹی لڑکیاں بلوغت کو پہنچتی ہیں تو وہ سر جھکا کر اور سینہ اندر کر کے بدن کی بولی میں اعلان کرنے لگتی ہیں کہ میں جوان ہو رہی ہوں ایک طرف ہٹ جاؤ۔ کھڑے کھٹنے پر دوسری ٹانگ کی پندلی رکھ کر کھٹنے سے پاؤں گھمایو لا یا گھمایو والی یہ کہہ رہی ہوتی ہے کہ کبھی پھر بھی ملنا اور جلدی ملنا اور زیادہ قریب ہو کر ملنا۔ لیکن یہی پاؤں جب فرش پر بار بار بجنے لگتے ہیں اور آواز پاناؤ پنی ہونے لگتی ہے، تو بدن اپنی بولی میں کہتا ہے۔ میں بیزار ہو رہا ہوں، میں جارہا ہوں۔ میں جانا چاہتا ہوں۔

مردوں کے مقابلے میں عورتیں بدن بولی سے زیادہ کام لیتی ہیں۔ سمجھ دار مردان کی بات سمجھ جاتے ہیں اور نا سمجھ اپنی گفتگو میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ سنا سننے بیٹھی ہوئی عورت ان سے مخاطب ہے اور بڑی لمبی بات کہہ رہی ہے اور بار بار کہہ رہی ہے۔ آج کل جب سرسریں تیل لگانے اور چوٹی کرنے کا زمانہ نہیں رہا عورتیں کھٹے چھوڑے ہوئے بالوں کے پرے اپنے گالوں پر اُڑا لاتی ہیں۔ پھر انہیں سر کے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹاتی ہیں۔ ان میں انگلیوں سے کنگھی کرتی ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کو تھپتھپاتی ہیں گویا کہہ رہی ہوں میرے ہاتھ اس طرح تھپتھانے کے عادی ہیں اور یہ بھڑکے ہوئے جذبات کو آسودگی بخشتے ہیں۔ سر ایک طرف جھکانا آنکھوں کو گھمانا اور ہونٹوں کی کمان کو گول کرنا یہ کتا ہے کہ تم مجھے اچھے لگنے لگے ہو۔ اگلی دفعہ جب ملو گے تو اس سے بھی اچھے لگو گے پھر میں اپنی بدن بولی کا اگلا باب سنانا گی، نئی بات بتاؤں گی اور تم پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو جاؤ گے، اپنے آپ کو پیارے لگنے لگو گے۔ خود کو تھپکنے اور اپنے آپ کو لوری دینے والے کے جواب میں اگر سامنے کا مرد میز پر یا اپنی کرسی کے آرم پر یا اپنی کتاب پر انگلیوں سے تار دینے لگتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اُٹھ کر باہر جا رہا ہوں شاپ تم بھی اُٹھ کر باہر آ جانا شاپ یہاں بہت سے بیوہ لوگ بیٹھے ہیں ان کے درمیان جی نہیں لگتا شاپ باہر موسم اچھا ہے اور تنہائی ہے۔ کم ایوٹنس۔ مُفتی نے کوہستانی کے ماتھے پر اپنے ہاتھوں کی کنگھی ڈالی ہوئی تھی اور وہ دونوں آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ عموماً نے میری طرف دیکھے بغیر اسی طرح سر جھکائے ہوئے

پھر پوچھا: "ہاں شاہ جی تو پھر آپ کیا سوچ رہے تھے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے جملے سے کہا۔"

"کافی خاص بات لگتی تھی۔ اس نے کہا: "آپ کا چہرہ بڑا متفکر تھا۔"

میں نے کہا: "ہر دانشور کا چہرہ ہر وقت متفکر ہوتا ہے۔ یہ کوئی نرالی بات نہیں۔"

دانشور کے لفظ پر وہ زور سے ہنسا اور رک کر بولا: "ایک عام آدمی دانشور کی جگہ پر نہیں بیٹھتا۔"

میں نے کہا: "عماد اس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں۔ کسی سمسٹر سمسٹر کی ضرورت نہیں۔"

کوئی امتحان پاس کرنا نہیں پڑتا۔ بس کچھ عرصہ چند دانشوروں کے درمیان بیٹھ کر آدمی خود بھی

دانشور بن جاتا ہے۔"

کے لگا "شاہ جی میں ایک انجینئر ہوں اور ساری عمر ایک الیکٹرک ماسٹر بننا رہا

ہوں۔ اپنی سمجھ کے مطابق چند کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ کچھ سمجھ دار لوگوں سے بھی ملا ہوں۔ لیکن

میں دانشور نہیں بن سکا۔"

میں نے کہا: "سائنس کے طالب علموں کی سب سے بڑی غرابی یہ ہے کہ وہ دانشور نہیں

بن سکتے۔ تم لوگ بڑے شوق سے بی ایس سی۔ ایم ایس سی کرتے ہو تاکہ نوکری حاصل کرنے میں

آسانی رہے اور تم کو نوکری آسانی سے مل بھی جاتی ہے، لیکن اپنی تمام عملندی اور فہم و فراست

کے باوجود تم دانشور نہیں کہلا سکتے۔ انجینئر کہلاتے ہو ڈاکٹر کہلاتے ہو، جیالوجسٹ کہلاتے

ہو، لیکن دانشور نہیں۔"

اُس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا: "مجھے دانشور بننے کا بڑا شوق ہے اور میں اس کے لیے ہر طرح

کی قربانی دینے کو تیار ہوں، لیکن کوئی میری مدد نہیں کرتا۔"

میں نے کہا: "اب تو وقت گزر گیا عماد، پھر کبھی یہی اگلی زندگی میں، کسی اگلے زمانے میں"

وہ کچھ دیکھی سا ہو گیا اور خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ میری

طرف گھمایا اور پوچھا: "کیا مسعود بھی دانشور ہے؟"

میں نے کہا: "یہ اپنا مسود ہے۔"

"ہاں۔"

"نہیں یہ دانشور نہیں اور شاید اب ہو بھی نہ سکے۔"

"کیوں؟ عماد نے حیرانی سے پوچھا۔"

"اس نے اپنا چانس کھو دیا۔ اگر شروع ہی سے لاہور میں رہتا تو شاید بات

بن جاتی۔"

"لیکن یہ شاعری کرتا ہے۔ عماد نے وثوق سے کہا: "اس کی دو تین غزلیں تو بہت ہی

اچھی ہیں۔"

میں نے کہا: "دانشور ہونے کے لیے ادیب یا شاعر ہونا ضروری نہیں مصنف یا صاحب

کتاب ہونا لازمی نہیں۔ اس کے لیے ایک سیاسی نقطہ نظر رکھنا ضروری ہے۔"

"اس کا سیاسی نقطہ نظر ہے شاہ جی؟ عماد نے حیرت سے کہا: "یہ بڑا مسلمان اور سخت قسم کا

پاکستانی ہے اور پاکستان کو سیاسی طور پر ایک طاقتور ملک دیکھنے کا متمنی ہے۔"

"یہی باتیں اس کے دانشور ہونے کے خلاف جاتی ہیں۔ میں نے کہا: "اس لیے کہ مذہب

فیصلہ دہندہ ہے اور اقدار سب پرانے رہتے ہیں۔ انہیں میوزم میں تو جگہ دی جاسکتی ہے، مابلی سیاسی

سوچ اور آفاقی برادری اور بقاء کے باہمی کے بازار میں نہیں چلایا جاسکتا۔ مسعود کے پاس چونکہ

بہت ہی پُرانے سکتے ہیں اس لیے ان کے ساتھ وہ محلے کے بچوں سے لگتی پا، تو کھیل سکتا

ہے دانشوری کے مونٹی کارلو میں روٹے پرواؤ نہیں لگا سکتا۔"

عماد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "شاہ جی آپ کیونسٹ تو نہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹک دیا۔"

"سوشلسٹ؟ اس نے پوچھا۔"

میں نے دلن کی طرح سر جھٹکا کر آہستہ سے "ہاں" کہا اور اپنے فلیٹ بوٹ میں سے کھڑکھانے

کے لیے زمین پر بیٹھ گیا۔ جب میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو عماد ابھی تک ویسے ہی کھڑا تھا۔ اس کا مزہ حیرت

سے کھلا تھا اور اس کی گردن ذرا سی جھکی ہوئی تھی اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "شاہ جی آپ سوشلسٹ

کیوں ہیں؟"

میں نے کہا: "اس لیے کہ جب سے روس نے چیکو سلوکیہ پر حملہ کیا اور سٹروپ چک کا

مدعا ہی غائب کر دیا اس وقت سے کیونسٹ ہونے میں کوئی چارم باقی نہیں رہا۔"

"اور جمہوریت؟ اس نے آدھی سی بات کی۔"

”جمہوریت کا پہلے پہلے رواج تھا جب کوٹ سرون سے اوپر ہوتے تھے اور ان کے لپل تنگ ہوتے تھے۔ قیصوں کے کارچھوٹے اور نوکدار ہوا کرتے تھے۔ اب فیشن بدل گیا ہے اور میں وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں۔ سوٹسٹ ہونا وقت کے ساتھ چلنا ہے۔“

اس نے کہا: ”آپ وقت کے ساتھ اتنا کیوں چلتے ہیں؟“
میں نے کہا: ”میں ٹائم سرور ہوں غلام سرور نہیں۔ وقت کے ساتھ چلنا صحت بخش اور زندگی بخش ورزش ہے۔ اس میں لمبیات اور حیاتین اپنی پوری مقدار میں ملتے ہیں۔“

”لیکن دوسرے دانشور تو وقت اور زمانے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں شاہ جی!“
میں نے کہا: ”ان کا احتجاج درپردہ اقرار ہوتا ہے۔ عام لوگوں کو اور کم پڑھے لکھے انسانوں کو وہ احتجاج نظر آتا ہے جیسے محکمہ زراعت کی طرف سے دیوانوں پر لکھے ہوئے سلوگن پوہلی کو تلف کریں، میں ایک احتجاج نظر آتا ہے اور ایک عام پیٹرویل سمجھتا ہے کہ محکمہ زراعت پوہلی کے خلاف جہاد کرنے میں ان کے ساتھ شامل ہے، لیکن حقیقت میں وہ اقرار ہوتا ہے کہ پوہلی ہے اور اسی طرح رہے گی اور ہم اس کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔“

میری بات سنا دیکر سمجھ میں نہ آئی اور اس نے رواروی میں پوچھا: ”تو آپ بھی غریبی اور بیماری اور بھوک کے خلاف اسی قسم کا احتجاج کرتے ہیں؟“

”بالکل“ میں نے خفت سے جواب دیا: ”میرا احتجاج بھی پوہلی احتجاج ہے اور اسی چیز نے مجھے دانشور بنا دیا ہے۔ اگر مسعود چاہے تو وہ بھی پوہلی احتجاج کا اعلان کر کے دانشور بن سکتا ہے۔ غزلیں لکھ کر نہیں۔“

پھر ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھانے لگے اور تھوڑی دیر میں اپنے ساتھیوں سے باطلہ۔ مفتی اپنے کو ہستانی کی پیٹھ سے اتر آیا تھا اور دوسروں کے ساتھ قدم قدم چل رہا تھا۔ ہم پہاڑ پر کافی اوپر چڑھ آئے تھے اور چوٹی کے گرداگرد مسافت کے دائرے تنگ ہونے لگے تھے۔ لیڈر نے اپنی گھڑی دیکھی اور اعلان کیا کہ ہم بیس منٹ آدھ گھنٹہ اس جگہ تک سکتے ہیں یہ خبر پاتے ہی سب اسی جگہ سہراہ بیٹھ گئے اور اعلیٰ چھوٹوں کی تلاش میں آگے نکل گیا۔ کوہستانی ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر تنگ سے دانت کبیدنے لگا۔ مسعود نے اپنے تھیلے سے ایک سیب نکالا اور کوہستانی کی طرف بڑھا کر بولا: ”لو خان! سیب کھاؤ۔“ وہ مزے سے دانت کبیدتا

اور آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

”اوسے“ لیڈر نے چرچر کر کہا: ”سیب کیوں نہیں کھاتا؟ سیب اچھا نہیں لگتا؟“
”لگتا ہے لگتا کیوں نہیں؟“ اس نے لائقیت سے جواب دیا اور پھر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

”حد ہو گئی یا ریزہ لوگ سیب پسند نہیں کرتے حالانکہ ان کے اپنے ٹمک کا میوہ ہے۔“
لیڈر ہنس کر بولا۔

”اسی لیے نہیں کھاتے میری جان۔ مفتی نے کہا کہ ان کے ٹمک کا میوہ ہے۔ اس کو سیب دینا گویا ہمارے گاؤں میں کسی کو ایک بیر دینا ہے۔“
”تو یہ جب بھی کرے گا اٹی بات کرے گا۔“ عمر نے کہا: ”کماں سیب کماں بیر۔ کماں ہیرا کماں موتی۔“

”مفتی! مسعود نے مفتی کو ابکھ مار کر کہا: ”بس کر۔ اس پر اپنی باتیں ضائع نہ کیا کر۔ یہ لیڈر آدمی ہے اور لیڈروں کا دماغی لیول بس اسی قدر ہوتا ہے۔“
لیڈر غصے سے لال پیلا ہو گیا اور چیخ کر بولا: ”تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو، گدھا سمجھتے ہو؟“

مفتی نے کہا: ”سمجھتے نہیں، تم ہو! اس پر ایک زور کا قہقہہ پڑا اور اعلیٰ زور سے ہکار کر بولا: ”میرے بعد کیا بات ہو گئی؟ کون کس پر چڑھ گیا؟“

”یہ مفتی لیڈر پر چڑھ رہا ہے۔“ مسعود نے اونچی آواز میں جواب دیا۔
”لیکن وہ تو کوہستانی پر چڑھا ہوا تھا! اعلیٰ نے زور سے پوچھا۔

”کوہستانی بھاگ گیا۔“ عمامہ نے کہا: ”لیڈر کے بعد تمہاری باری ہے۔“

”عارضہ سائیں عاصمہ! اعلیٰ وہیں سے بولا اور مسعود کوہستانی کے لیے نکالا ہوا سیب خود کھانے لگا۔ کوہستانی بڑے بخور سے لڈھر بندر کی طرح پتھر پر بیٹھا ہوا تھا اور اپنی حضرت عیسیٰ ایسی سنہری ڈاڑھی سے تنکے نکال رہا تھا۔

”لو مفتی جی! اعلیٰ نے تین بنفشی پھول آگے بڑھا کر کہا: ”اسے ہماری طرف سے ان کو دے دینا۔“

مسعود نے سوالیہ نگاہوں سے اُٹلی کی طرف دیکھا تو اس نے اپنی قبینہ جیسی نگاہیں میرے اوپر گاڑ دیں۔ میں نے کہا: ”یہ کوستانی کا سبب کھار ہا ہے۔“

اُٹلی نے کہا: ”یہ سبب کی بات نہیں، زیب کی بات ہے۔ کیا نام تھان کا ہے؟“

”کن کا ہے؟ میں نے زنج ہو کر کہا۔“

”وہی جو دھر پور سے لاہور میں روتی تھیں؟“

”عالم بی بی۔“ مفتی نے بوں کہا جیسے کسی ملک کا دار الخلافہ بتایا ہو۔

”ہاں عالم بی بی۔ عالم بی بی: اُٹلی کی آنکھیں جھکیں۔ یہ پھول میں اُن کے لیے لایا تھا۔“

”مفتی۔“ لیڈر نے غصے سے کہا۔ اس حرامزادی عالم بی بی نے بڑا تنگ کیا ہے، سچ سچ بتا وہ کون تھی؟“

”وہ ایک حرامزادی تھی، مفتی نے ایمان سے کہا اور پڑیا سے ایک پان نکال کر منہ میں ڈال لیا۔“

سماد جو پہلے ہم جیسا تھا، لیکن اب بہت زیادہ نیک ہو گیا ہے، عالم بی بی کا نام سُن کر چونکا اور پھر اس کی ناک کے تختے اور بڑے ہو گئے۔ مفتی نے اس کے زانو پر ہاتھ مار کر کہا: ”شکر و عباد جی بچ گئے ہو ورنہ ہماری طرح سے مارے جاتے۔“

اُٹلی نے کہا: ”شاید مراد آؤمی تبا کو کا پان کھار ہا ہے، اگلے جہان جائے گا، تو بلا سوال قوم کے بارے میں کرے گا۔“

”لیکن مفتی جی۔“ مسعود نے کمال سنجیدگی سے پوچھا: ”یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ آپ تو ماشاء اللہ پوتے والے ہیں۔“

مفتی نے کہا: ”بے علموں کے ساتھ سیر کرنے میں لطف نہیں آتا تم لوگ آدمی کو آدمی نہیں سمجھتے اس کو بچے، جوان اور بوڑھے کے گز سے ناچتے ہو تم سارے درزی ہو۔ آؤٹ فٹر ہو۔ اب کوئی ٹیلر ماسٹر کو کیسے سمجھائے کہ مرد شروع دن سے لے کر آخر تک مرد ہوتا ہے اور اس کے تمام اعضا راسی طرح کام کرتے ہیں جیسے پہلے دن کر رہے تھے۔ عمر گزرنے سے کوئی عضو اپنی ڈیوٹی نہیں بدلا کرتا۔“

”لعنت ہو تجھ پر“ لیڈر نے اس کے سر پر سوٹی مار کر کہا: ”اس کا سر سفید ہو گیا، لیکن ترائوں

کی سی سوچ نہ گئی۔“

”اب یہ اپنا عمر ہے، مفتی نے اُٹلی سے کہا: ”کبھی مجھ سے نہیں پوچھے گا کہ مفتی جی حیرانی کی بات ہے آپ ستر سال کے ہو گئے، لیکن آپ کا دل ابھی تک خون پرپ کرتا ہے۔ آپ کی زبان اب بھی ذائقہ محسوس کرتی ہے۔ آپ کے گروے ابھی تک پیشاب بناتے ہیں۔ پھر وہ دُعا دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور پان دائیں سے بائیں گال میں بدل کر بولا: ”یارو، پھول پر اور عفتوال شباب پر اور جوانی پر اور ادھیر عمر کی نفسیات اور جنسیات پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن بوڑھوں پر ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ کسی بھڑوے نے ادھر تو جہی نہیں دی۔ دراصل بوڑھے کو ایک فرائیڈ کی شدت سے ضرورت ہے اور جب تک وہ نیا فرائیڈ پیدا نہیں ہو گا تم جیسے لوگ بے علم ہی مر جائیں گے۔“

مسعود نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا: ”اے بابا میں بوڑھوں کے بارے میں کچھ بتا۔“ مفتی نے کہا: ”سُنو میرے پیارے بچو! بوڑھے دراصل بوڑھے نہیں ہوتے۔ وہ انسان ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کا خوف، اخلاقی اقدار اور لوک لاج بوڑھوں کو ان کی نارمل جنسی زندگی بسر کرنے نہیں دیتی، چھوٹوں کی تنقید اور اپنے ہم عصروں کے طعن سے خوفزدہ ہو کر بوڑھا اپنی جنسی زندگی بچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس زندگی کو جو تیس بیسیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سالوں سے اس کی عادت ثانیہ بن چکی ہوتی ہے، اس کے بدن کا ایک جزو بن چکی ہوتی ہے، اس کی سائیکس کا ایک حصہ ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ بہت بڑا دھچکا ہوتا ہے میرے پیارے بچو اور اس دھچکے کو سہارا بنا بوڑھے ہی کا کام ہوتا ہے، لیکن یہ ٹوٹ اور یہ تھن چھٹ کیفیت بوڑھے کو بد مزاج، چڑخیز، غصہ، جھکی اور کرکڑا بنا دیتی ہے۔ وہ ہر اس شخص سے جھگڑتا ہے جس کو سوسائٹی کی طرف سے جنسی عمل کی اجازت ہو۔ ہر اس فیشن کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جس سے جنس کو تقویت ملتی ہو۔ پنجرے کا شیر ہر آزاد تماشا شانی پر دھاڑتا ہے اور دیکھنے والے حیران ہوتے ہیں کہ دیکھو اس بڑے کو جو کی گلیا ہے پوتا گیند بٹا برآمدے میں فرش پر چھوڑ جائے وہ لڑے گا۔ بیٹا نیا پنگ لانا بھول جائے تو وہ لڑے گا۔ بیٹی فریج کا دروازہ ٹھیک سے بند نہ کرے تو وہ لڑے گا۔ گوالا وقت پر دودھ نہ لائے تو وہ جھگڑے گا۔ بھوشلوار میں آزار بند ڈالنا بھول جائے تو وہ لڑے گا۔ بیوی کل کا آیا ہو خط آج دے تو وہ لڑے گا۔ عینک رکھ کر بھول جائے تو ہر ایک سے جھگڑے گا۔“

تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کے ہونٹوں پر سوال نہ آئے۔“

”سوال کیسا بڑا عمر نے بے چین ہو کر پوچھا۔“

”مفتی نے کہا: ”بوڑھے کو سب سے بڑا دلچسپا اس وقت لگتا ہے جب وہ کسی عورت سے ملاپ کا خواہش مند ہو۔ اس کا اظہار کرے اور پھر اس کو صاف انکار کر دیا جائے۔ وہ ایک نوجوان کی طرح اس انکار کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، شور نہیں مچاتا چپ چاپ خاموشی سے سُن لیتا ہے اور پنی جاتا ہے۔ اس انکار کے بعد وہ اپنے گرد و پیش سے اپنی خوراک سے اپنے لباس سے لاتعلقی ہو جاتا ہے اور ایک دن اپنے کپڑے اٹھا کر گھر کے کسی کمرے میں جاتا ہے اور وہاں جا کر خاموشی سے مر جاتا ہے۔“

مجھے یاد آیا ہمارا ایک یار تھا خواجہ رفیق جب میری اور اس کی دوستی ہوئی اس کی عمر کسٹھ برس کی تھی ادیس اپنی زندگی کی اٹھائیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ میری اور اس کی دوستی ایک نئے اور ایک لڑکی کے سلسلے میں ہوئی۔ خواجہ کے پاس کچھ پُرانے صدری نئے تھے جن میں سونا بنانے اور ہمزاد کو قابو میں کرنے سے لے کر ایک دن میں چھونے اور تین گھنٹے میں گولہ باری ختم کرنے کے نئے تھے۔ میری ایک عزیزہ شب کو رتھیں اور یاسین نے مجھے خواجہ کا پتہ دیا تھا۔ یاسین کراچی میں متوسط درجے کی لڑکیاں پہلائی کرتا تھا اور اس کا فلیٹ گاندھی گارڈن کے قریب تھا اس کے گھر ایک مرتبہ ہم نے جس لڑکی کو پسند کیا تھا وہ دراصل خواجہ کی کھیل تھی اور اس کے سوا اور کسی کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہ ہوتی تھی۔ اس لڑکی کا قد لمبا رنگ سانولا اور ماتھا تنگ تھا۔ آنکھوں میں شرارت گردن پر تل اور ایک نچھنے پر پھوٹے کا نشان تھا۔ اس نشان نے اس کی ناک میں مستقل طور پر ایک کوکہ ڈال رکھا تھا اور جب وہ بات کرتی تھی تو یہ کوکہ گرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جب ہم نے ذرا شوخ ہو کر اس سے بات کی تو وہ اٹھ کر بولی: ”میں خواجہ جی کو بتلا دوں گی“ پھر ہم نے یاسین سے خواجہ کے متعلق پوچھا اور یاسین نے بتایا کہ خواجہ ایک مقامی فرم میں اکاؤنٹنٹ ہے اور اس کے دو بیٹے کویت میں کام کرتے ہیں۔ تین بیٹیاں ہیں جن میں سے دو شادی شدہ ہیں اور لمبیا میں اپنے خاوندوں کے ساتھ رہتی ہیں تیسری راولپنڈی میں پیکچر آرٹسٹ ہے خواجہ کی لڑکی کراچی میں رہتا ہے۔ دن بھر اکاؤنٹنٹ کرتا ہے رات عورت کے ساتھ بسر کرتا ہے۔ دل کا بھی بڑا ہے اور نیت کا بھی۔ حاسد بھی ہے اور غلام بھی۔ تنگ نظر ہے، لیکن

”واہ بھی واہ“ لیڈر نے تالی بجا کر کہا: ”سارے کے پاس بیوی ہے پھر بھی لڑتا ہے۔“

”یہی تو بات ہے جن جی“ مفتی نے سر ہلا کر کہا: ”ماچس ہے، لیکن گھر والوں نے اسے پانی کی باٹی میں ڈال دیا ہے کھوکھا بھی گیلایا بھی گیلی۔“

”لیکن یا مفتی“ اٹھلی نے شرارت سے کہا: ”وہ دھرم پور سے والی ماچس تو دواٹر پروف تھی۔“

”تھی تو دواٹر پروف“ مفتی نے اقرار بھرے لہجے میں کہا: ”لیکن تھی مر سزی“ ربرڈ کی ڈوری سے بندھی تھی۔ ہاتھ آگے بڑھا دواٹر پوک کر اوپر چلی جاتی تھی۔ پیچھے ہٹو تو ٹانگ کر نیچے آ جاتی تھی، نواسے نواسیوں والی تھی، لیکن اپنی بیٹی سے جوان تھی۔“

عماد نے کہا: ”مفتی جی بوڑھے کے لیے جو ان ساتھی اچھا نہیں ہوتا؟“

”ہوتا ہے، ہوتا کیوں نہیں“ مفتی جی کو بولا: ”بوڑھا تو بلکہ بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ وہ عزت میں مشکل میں، بیماری میں، تنگ دستی میں قابل اعتماد ساتھی ہوتا ہے۔ اپنے ساتھی کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ وقت دیتا ہے۔ جوانوں کے مقابلے میں چونکہ بوڑھے کی مصروفیات کم ہوتی ہیں اس لیے محبت میں اختلاف میں اور تشکی میں زیادہ سے زیادہ وقت انویسٹ کر سکتا ہے۔ پھر وہ تجربہ کار ہوتا ہے اور اپنے ساتھی کو جسمانی طور پر زیادہ خوش رکھ سکتا ہے۔ ہنس لے ہنس لے، مفتی نے سر ہلا کر کہا: ”دل کھول کر ہنس لے، لیکن یہ باتیں میرے بعد تم لوگوں کو کوئی نہیں بتائے گا۔“

مسعود نے عمر کو ایک ہنر کا مارا اور مصنوعی غصے سے کہنے لگا: ”بد ذات مفتی جی کی باتوں پر ہنستا ہے!“

”ہاں دیکھو یہ ہنستا ہے“ اٹھلی نے کہا: ”حالانکہ شالا لوگ عام طور پر مفتی جی کی باتوں پر ہنستا ہے۔“

میں نے کہا: ”مفتی جی یہ تو کبواس کرتے ہیں اور اس وقت سنجیدہ موڈ میں نہیں ہیں۔ آپ مجھے اور عماد کو بتائیں۔“

”مفتی اپنی بات کی لمک میں کہنے لگا: ”بوڑھے کی راہ کا سب سے بڑا روڑا اس کی شکل ہوتی ہے۔ اس کی ہیئت ہوتی ہے۔ ناک لمبی ہو کر آگے کو جھک جاتی ہے۔ آنکھیں تنگ ہو جاتی ہیں چہرہ جھریوں سے اٹ جاتا ہے۔ اس کے جسم کے خیلے کم ہونے لگتے ہیں، لیکن وہ اس وقت

میں نے یاسین کی طرف اور یاسین نے میری طرف دیکھا اور کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔

خواجہ کے اس چھوٹے سے جملے سے مجھ میں یلغار کی قوت پیدا ہو گئی اور میں نے منہ پکڑ کر کہا: ”خواجہ جی کسی دن تازی کو ہمارے لیے بھی بچتی دے دیں“ وہ خاموش رہا۔ میں نے پھر کہا: ”بس ایک دن کے لیے“۔

خواجہ نے چہرہ میری طرف پھیرا اور ہولے سے بولا: ”جوان“ وہ میری پابند ہے۔ اس کو چھو نہیں مل سکتی“

میں نے کہا: ”ہم رقم خرچ کریں گے“
 کہنے لگا: ”پوچھ کے دیکھ لو جوان اگر وہ رقم کی شوقین ہے تو لے جاؤ“
 یاسین نے کہا: ”تو بہ سے خواجہ جی۔ وہ آپ کی پابند ہے رقم کی نہیں“
 میں نے کہا: ”آپ میں کیا صفت ہے؟“
 خواجہ بولا: ”میں پھر کی ہوں۔ سارے پرگھوم جاتا ہوں جوان۔ کر لو گے؟“
 میں نے کہا: ”کیوں نہیں“

ہنس کر بولا: ”تم نوجوانوں کو تو کان میں انگلی پھیرنا ٹھیک سے نہیں آتا تم کیا گھومو گے؟“
 میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا تو کہنے لگا: ”اے رضیہ سے ملانا تھا یاسین۔ منبر اسے ملانا تھا“

”ان سب سے تو مل لیے خواجہ جی“ یاسین نے آہستہ سے کہا۔

”اب تازی برہنہ لگیا ہے“ میں نے فقرہ نکال دیا۔

خواجہ صاحب نے زانو پر ہاتھ مار کر کہا: ”دیکھ لو۔ اس کی مرضی ہے میں کچھ نہیں کہتا“

میں نے کہا: ”اور شب کوری کا نسخہ“

اس نے کہا: ”وہ میں نے تم کو بتلا دیا ہے۔ اس عمر میں اگر لڑکی کو رات کے وقت نظر نہ آئے تو آسان اور سستا علاج شادی ہے“ پھر اس نے یاسین کی طرف دیکھ کر بغیر اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پوچھا: ”کتنے پیسے تھے تمہارے میرے ذمے؟“
 ”تیرہ خواجہ جی“ یاسین بولا۔

خوب خرچ کرتا ہے۔ بد شکل ہے، لیکن محبوب طبیعت ہے۔

ہم شب کوری کا نسخہ حاصل کرنے کے لیے یاسین کے ساتھ خواجہ کے فلیٹ گئے تو وہ شہمی تہ بند باندھے چارپائی پر لیٹا تھا اور ایک عورت اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ خواجہ جلدی سے اٹھا اور اس نے قریب بڑی ہوئی کرسی سے اپنا کُرتہ اٹھایا۔ اسے پہنا پھر عورت سے کہنے لگا: ”اب تو بامصغراں کل اسی وقت آجانا“ مصغراں کسی تکلف کے بغیر چارپائی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ یاسین نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا: ”یہ ہمارے یار ہیں اور بڑے دل والے آدمی ہیں کسی دفتر میں لکھنے لکھانے کا کام کرتے ہیں“ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو خواجہ نے کوئی توجہ نہ دی اور اپنا زانو زور سے ہلانے لگا۔ خواجہ کا قد چھوٹا اور رنگ سا نولا تھا۔ ماتھا تنگ اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ نہ ان میں نور تھا نہ روشنی۔ کھلی بھی بند دکھائی دیتی تھیں۔ چھوٹی ٹیسی ناک کے نیچے ٹوٹے برش ایسی بوئیں تھیں جن پر چمکدار خضاب کی وارنش تھی۔ سر کے بال کالے اور سفید تھے اور بوسل صاف کرنے کے برش کی طرح کھڑے تھے۔ خواجہ جب ان پر ہاتھ پھیرتا تو آواز سی بھی آتی تھی۔ اس کے ایک کان میں پھید تھا اور دوسرا ذرا سا اندر کو مڑا ہوا تھا۔ ٹھوڑی پر زخم کا نشان تھا اور جبرے کی ہڈی بہت سی چھوٹی تھی۔ چہرے کی جلد مندرت سے زیادہ کسی ہوتی تھی اور نتھنے کھینے ہوئے تھے۔ بازو بے تھے اور ہاتھ چھوٹے اور انگلیوں کے پوٹے بندروں کی طرح آگے سے گول اور پکدار تھے۔ گو وہ بڑے آرام سے چارپائی پر بیٹھا تھا، لیکن اس کا سارا وجود ایک پھر کی کی طرح گھومتا ہوا لگتا تھا۔

یاسین نے کہا: ”یہ آپ سے کوئی نسخہ لینے آئے ہیں“

”کیسا نسخہ؟ اس نے میری طرف دیکھ کر بغیر پوچھا۔

”شب کوری کا“ میں نے گلا صاف کر کے کہا۔

”کون بیمار ہے؟“

”میری بھانجی ہے“

”کس عمر کی ہے؟“

”اکیس بائیس برس کی“

”اس کی شادی کرو“

خواجہ جی نے پانچ پانچ کے تین نوٹ نکال کر اس کو دیئے اور کہا یہ سارے رکھ لے
جوان پھر کبھی حساب کریں گے۔

چلتے وقت جب میں نے اپنا ہاتھ خواجہ جی کی طرف بڑھایا تو انہوں نے دیکھا نہیں پڑتی
پر نظر میں جائے اسی طرح بیٹھے رہے۔ خواجہ جی سو کی طرح گون نہیں گھا سکتے تھے۔

اس کے بعد خواجہ جی سے ہماری یاری ہو گئی اور ہم ان کے یہاں روز آنے لگے۔ ان کے
فیصلے کے ایک کمرے پر تقریباً ہمارا قبضہ ہو گیا اور ہم نے یہاں راتیں بسر کرنا بھی شروع کر دیں
تازی کے ساتھ ہمارا رہنا پابو گیا اور وہ ہمیں سبھی کہہ کر بلانے لگی۔ تازی کون تھی اور اس کے گھر والے
کیا کرتے تھے اور اس کا جغرافیہ کیا تھا اس کی خبر نہ ہم کو تھی نہ خواجہ صاحب کو۔ وہ تین چار گھنٹے
کے لیے ہر روز ان کے پاس آتی اور دونوں چار پائی پر لیٹ کر دیر تک ایک دوسرے
سے باتیں کیا کرتے۔ پھر وہ اٹھ کر چائے بناتی مجھے آواز دیتی۔ ہم تینوں چائے پیتے اور وہ برقعہ
اڑھ کر گھر چلی جاتی۔ میں نے اُسے بار بار خواجہ جی سے تھنے تحائف اور رقم وصول کرتے دیکھا تھا۔
لیکن وہ اس میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ لیتی تھی۔ اس کا سب سے بڑا شوق ٹانے کی چادر اوپر ڈال کر
خواجہ صاحب کے ساتھ لیٹنا تھا۔ یہ چادر گھر کی دھلی ہوئی ایک عام سی چادر تھی جو بڑے بچے
کی سرداریاں اور جاگیر دار نیاں لیا کرتی ہیں۔ اس پر نہ کوئی پھول کٹھے تھے نہ اُس میں کوئی خوشبو
تھی نہ اس کا رنگ ہی جاذب تھا، لیکن اس کے نیچے لیٹنا اور اُس کو اپنے بدن پر محسوس کرنا تازی کا
محبوب ترین مشغلہ تھا۔ یہ چادر خواجہ کو اس کے بیٹے نے اوڑھ کر ہوں کے ساتھ کویت سے بھیجی تھی اور
اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے نیچے اباجی کا تنگ و نمود بھی شاہیں گزانا کرے گا۔ پھر
سبھی اور تازی کی زندگی میں ایک مہینہ ایسا بھی آیا کہ ہم دونوں کو خواجہ کے فیصلے سے ویس نکالا
مل گیا۔ خواجہ کا ایک رشتے کا بھوتاپا اپنی بیوی کے علاج کی غرض سے کراچی آ رہا تھا اور اسے مہینہ
ڈیڑھ مہینہ اپنے دادا کے پاس بٹھرتا تھا۔ تازی پر جدائی کے یہ دن قیامت بن کر ٹوٹے اور روتے
روتے اس کی بچی بندھ گئی۔ میں اسے اپنے ساتھ لٹا کر تسلیاں دے رہا تھا۔ خواجہ کرسی پر بیٹھا ٹھٹھول
میں پھونکیں مار رہا تھا اور تازی روئے جا رہی تھی۔ میں نے کسی ناروقی ہوئی عورت کا جسم بھی اس قدر
مضبوط اور طاؤس نہ دیکھا تھا۔ اس کے کندھے اور گات اور گردن ایسی فرگرس کے بڑے ٹائٹ کی طرح
سخت تھے، لیکن ان میں پلک کا احساس موجود تھا۔

خواجہ صاحب کا پوتا مع اپنی بیوی کے آگیا۔ اس کا جسم تندرست، قد اونچا، بال گھنگریالے
اور ہاتھ مضبوط تھے۔ وہ عارف دلے کی کبڈی ٹیم کا کپتان تھا اور اس کے اڑنگے میں آئے ہوئے
میانوالی کے جوان بھی اپنا آپ نہ چھڑوا سکتے تھے۔ اس کے ایک دانت برسوں کا پتھر چڑھا تھا
اور اس کے ہونٹ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ اس کے چہرے کی دلکشت دیکھ کر یہ محسوس ہوتا
تھا کہ شاہی مسجد کے مینار کو کسی نے تار کے برش سے رگڑ رگڑ کر دھو دیا ہو۔ اپنے دادے کی طرح
وہ بھی شوقین مزاج نوجوان تھا اور دو ہی تین ملاقاتوں میں میرے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ ایک دن
ہم دونوں خواجہ کی آنکھ بچا کر درمیان عمر کی دو عورتوں کو سیر کرانے جو ابندر لے گئے۔ ساحل ساحل
چلتے وہ دونوں ہم سے بہت دُور نکل گئے اور میں اور میری عورت ریت پر سپیاں اور گھونگے
چُھتے رہے۔ اس عرصے میں کئی لمحوں آئیں اور گزر گئیں۔ کئی جہاز دُور سے نظر آئے اور پھر غائب
ہو گئے۔ کئی گرد و سیر کے لیے آئے اور واپس چلے گئے۔ کوئی ڈھائی تین گھنٹے بعد وہ دونوں
واپس آئے۔ ان کے بالوں میں اور ان کے چہروں پر اور ان کی گردنوں پر خشک اور گیلی ریت
چھٹی ہوئی تھی۔ حالانکہ کراچی میں کبڈی کھیلنے کا رواج بالکل نہیں ہے۔

یہ نوجوان کوئی ڈیڑھ مہینہ خواجہ صاحب کے یہاں مقیم رہا اور اس عرصے میں خواجہ صاحب
اپنی بھوکا خود ہی علاج کرتے رہے اور وہ صبح گاندھی گارڈن کے چڑیا گھر سے طلوع ہوئی جب
اس نوجوان کی بیوی ایک دم بڑا کر اٹھی اور اس نے غسل خانے میں جا کر تے کرنا شروع کر دی
اس کا بدن چھوٹے چھوٹے دھچکوں سے دُہرا ہوا تھا اور وہ خشک کے دونوں کناروں کو
پکڑ کر رو رہی تھی۔ ابکاسیاں کر رہی تھی، کراہ رہی تھی، زور زور سے پاؤں زمین پر مار رہی تھی۔ نوجوان
گھبرا کر اٹھا اور خواجہ جی کے کمرے میں جا کر بین کرنے لگا۔ باباجی اٹھو، رضیہ کو کچھ ہو گیا ہے۔ اس
کو تے ایں آ رہی ہیں اور وہ مرنے لگی ہے۔ اسے کچھ دیں۔ اسے دیکھیں۔ اسے کیا کریں باباجی؟
خواجہ صاحب نے لیٹے لیٹے اپنے خا پشت سر پر ہاتھ بھیرا اور کہا۔ جب وہ فارغ
ہو جائے تو اُسے کنا پائے کے لیے پانی رکھ دے میں آج کشمیری چائے بناؤں گا۔ نوجوان کا
دل اس شقی بوڑھے کی بات پر دو نیم ہو گیا اور اس نے غسل خانے میں جا کر اپنی بیوی کو اپنے ساتھ
پٹا لیا۔ پھر وہ دونوں اور خواجہ جی کے گھر رہے، لیکن اس مدت میں نوجوان نے سنگدل بوڑھے

سے کلام تک کرنا گوارا نہ کیا۔

یہ ڈیڑھ مہینہ تازی پر بہت گراں گزرا۔ گو اس عرصے میں اس کی خواجہ صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، لیکن یہ ملاقاتیں ٹانے کی چادر میں لپٹی ہوئی نہ ہوتی تھیں۔ یاسین کے فلیٹ میں پڑتال کے ایک پُرانے پلنگ پر ہوتی تھیں جس کی نوار کے اندر بہت سے کھٹکوں کے گھر تھے۔ میں نے کسی من موہنی لڑکی کو ایسی اُجڑا صورت اور اس طرح سے دیران حال کبھی نہیں دیکھا۔ وہ یاسین کے فلیٹ میں پہنچ کر گھنٹوں خواجہ جی کا انتظار کیا کرتی، لیکن خواجہ جی کا کوئی پتہ نہ چلتا۔ پھر وہ زور زور سے رونے لگتی اور ہمارے پاس اُسے چُپ کرانے کے لیے کوئی بھینسا نہ ہوتا۔ وہ خاموش ہو جاتی تو اسے ہنسانے کے لیے ہمارے پاس وہ انگلیاں نہ ہوتیں جن کے پوٹے گول اور جلد پکلی اور ناک ہوتی۔ یاسین کے لیے وہ لڑکی مصیبت بن گئی تھی اور اس کو دیکھ کر اس کی دوسری لڑکیاں بھی متاثر ہونے لگی تھیں۔

جب خواجہ جی کا پوتا اور اس کی بہو کراچی سے گئے تو تازی کے سُوکھے دھانوں پر پانی پھرا اور وہ پھر سے تروتازہ ہو گئی۔ پہلے ہی روز جب وہ خواجہ کے کمرے میں آئی تو اس کے پاس مختلف ساز کے کاغذوں کی تین پرچیاں تھیں جن پر اس نے اس ڈیڑھ مہینے کے دُکھوں، طعنوں، جلاوطنی اور حسدوں کے نوٹس تیار کر رکھے تھے۔ وہ باری باری سے ہر ایک پر جواب مضمون لکھ سکتی تھی اور اسی نیت سے وہ یہ کاغذ لے کر خواجہ کے پاس آئی تھی۔ جب چار بائی پر لیٹے ہوئے خواجہ نے اُسے لیٹنے کے لیے کہا تو وہ سختی سے بولی: "نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں کُرسی پر۔ مہربانی۔" خواجہ نے بڑی محبت اور ملامت سے کہا: "لیکن میری جان میرا کوئی قصور، کوئی خطا؟ ایسی ناراضی۔"

تازی نے پرچی نکال کر کہا: "جس دن تمہارے مہمان آتے ہیں اس شام تم نے یاسین سے کہا تھا کہ میں کل سویرے آؤں گا تازی کو بتا دینا۔ میں آئی، لیکن تم نہیں آئے۔ میں تمہارے باپ کی نوکریا تمہارے خاندان کی غلام تھوڑی تھی کہ دن بھر تمہارا انتظار کرتی رہتی۔"

خواجہ نے اس کا فقرہ آدھا سن کر کرکٹ بدلی اور منہ دیوار کی طرف کر کے آنکھیں بند کر لیں جب اس کی آنکھیں بند ہوتی تھیں تو اس کے کان خود بخود ساتھ ہی بند ہو جاتے تھے۔ تازی نے غصے میں

پرچی کی گولی بنا کر کونے میں دے ماری۔ دونوں پاؤں ایک ساتھ اُپر اٹھا کر فرش پر دے مارے اور کُرسی کو لات مار کر کھڑا ک سے زمین پر گر دیا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی اور وہاں سے فلڈنگ لگ مارتی ہوئی خواجہ کے ساتھ چار بائی پر وہاں آگری جہاں کرکٹ بدلنے سے بگڑ خالی ہو گئی تھی۔ تازی نے اپنے دانت پوری قوت سے خواجہ کے بازو میں گڑو دیئے خواجہ چیخ مار کر شل کی طرح گھوما اور پھر کی طرح گھومتا چلا گیا۔

اگلے چھ مہینے کے واقعات بڑے سازگار، خوشگوار اور یادگار قسم کے تھے۔ ان کی تفصیلات بہت لمبی اور ان کی جزئیات زرد بکتر کی کڑیوں کی طرح ذہن کے وجود سے جڑی ہوئی ہیں۔ انہیں الگ الگ کر کے نہیں دکھایا جاسکتا۔ اس عرصے میں ہم تینوں ایک دوسرے کے بہت قریب لگے تھے اور ہماری دوستی کے درمیان سے ہوا بھی اپنی طرح سے نہ گزر سکتی تھی۔ ایک اتوار ہم تینوں خواجہ کے فلیٹ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور گپیں ہانک رہے تھے کہ خواجہ نے تازی کی غٹھڑی اُپر اٹھا کر کہا: "چن کھنوا پنا ہمزاد دیکھو گے؟"

تازی کا چہرہ خوف سے پیلا ہو گیا۔ "کون ہے، کدھر ہے، کہاں ہے؟" اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھ کر پوچھا: "کون آیا ہے؟"

خواجہ نے ہنس کر کہا: "ہمزاد بے وقوف! تیری سوکن نہیں۔ اصل ہمزاد جوت ابو کیا جاتا ہے۔"

یہ بات کچھ اس کی سمجھ میں آئی کچھ نہ آئی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بھی سر ہلا کر کہا: "خواجہ جی ٹھیک سے میں بھی نہیں سمجھا۔" خواجہ نے تازی کی ران پر پٹاخ سے ہاتھ مار کر کہا: "چلو اٹھو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" تازی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"اوہو آؤ توسی ڈرتی کیوں ہو؟" خواجہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے تازی کی کلائی پکڑ کر اسے بھی اٹھالیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ خواجہ نے الماری کھول کر اندر سے اپنی چُندنے والی رومی ڈلی نکالی اور اسے سر پر رکھ کر بصرے کی نوکری جانے والے کی طرح بیسی نکالتے لگا۔ ہم دونوں خاموشی سے اس کا منہ تک سبے تھے۔ پھر وہ پٹا اوٹھل خانے میں جا کر وضو کرنے لگا۔

چڑھتی ہوئی کمینوں اور ٹپکتی ہوئی ٹھوڑی کے ساتھ وہ غسل خانے سے برآمد ہوا اور ہم دونوں کو اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ فلیٹ کا دروازہ بند کر کے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا اور ہم بھی قدم قدم اس کے پیچھے زمین چڑھنے لگے۔ چوتھی منزل ختم ہونے پر اوپر کی چھت آگئی۔ دھوپ چمک رہی تھی اور آسمان بالکل صاف تھا۔ بائی کی ٹینگی کے لیے چبوترے کا سایہ فرش پر پڑ رہا تھا۔ یہ سایہ کوئی دس بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس کے بعد دھوپ ہی دھوپ تھی۔ خواجہ نے کچھ کے لیے مجھے کندھوں سے پکڑا اور چھاؤں میں اس طرح سے کھڑا کر دیا کہ میری گردن کا سایہ دھوپ اور سائے کی حد پر پڑتا تھا۔ میرا سارا وجود سائے میں تھا صرف سر اور گردن کی چھاؤں چھت کے فرش پر نظر آرہی تھی۔ پھر اس نے میرے سر کو اس طرح سے جھکا یا کہ میری ٹانگیں اپنے پاؤں پر جم گئیں۔ اپنا دایاں ہاتھ میرے بائیں کندھے پر رکھ کر وہ آہستہ آہستہ کچھ بڑھنے لگا اور پانچ دس منٹ تک اسی طرح پڑھتا رہا۔ پھر اس نے میری ٹھوڑی کے پیچھے اپنا ہاتھ رکھ کر میرا سر اوپر اٹھایا اور میں نے کھینچی دھوپ میں اپنے عین سامنے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر دیکھا۔ وہاں میں کھڑا تھا۔ وہی کپڑے وہی کھڑے ہونے کا انداز وہی چہرہ ویسے ہی بال۔ میں وہاں کھڑا مسکرا رہا تھا اور میں یہاں کھڑا خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں نے مرعوب ہو کر اپنا ہاتھ اٹھا کر اُسے سلام کرنے کی کوشش کی اور میں وہاں کھڑا ہوا اور شدت سے اور شرارت سے مسکرانے لگا۔ پھر میں نے اُسے دایاں بائیں جھولتے دیکھا جیسے وہ لنگنارہا ہوا اور میں نے یہاں یہ محسوس کیا جیسے میں کانپ رہا ہوں اور رونے لگا ہوں۔ خواجہ نے میرا سر اپنے ہاتھ سے پھرنے دیا اور کچھ پڑھ کر تین مرتبہ تالی بجاتی۔ پھر اس نے میری کمر پھینچائی جیسے کہ رہا ہو۔ بس اب جاؤ۔

میں نے سر اٹھا کر ڈرتے ڈرتے سامنے دیکھا۔ اب میں وہاں نہیں تھا۔ پھر خواجہ نے آگے بڑھ کر تازی کا بازو پکڑا اور اُسے سائے کی طرف کھینچا۔ اس نے خوفزدہ ہو کر ایک جھج جھج ماری اور خواجہ کا ہاتھ زور سے جھٹک کر ”میں نہیں، میں نہیں“ کہتی سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ شاید وہ میرا چہرہ دیکھ کر ڈر گئی تھی اور اُسے خواجہ سے خوف آنے لگا تھا۔ خواجہ ایک قہقہہ مار کر ہنسا اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر میری پیٹھوں کی طرف چل دیا۔

خواجہ نے جاؤ تو نا اور کال غلام ناگ قبیلوں سے یہ کیا تھا جب وہ فوج میں بھرتی ہو کر آسام گیا تھا۔ وہاں ایک ناگ عورت سے اس کی آشنائی ہو گئی تھی اور وہ اس کے بڑے بیٹے کا دوست

بن گیا تھا جو عمر میں خواجہ سے تین سال بڑا تھا۔ خواجہ بتاتا ہے کہ مگھو بڑے قد کا ٹھنڈی گرائڈیل عورت تھی اور اس کی بائیں ران پر آدمی کی شکل کا ایک بڑا سا ستا تھا اس کا خاندان باقی پکڑنے کا کام کرتا رہا تھا اور باقیوں کی بولی آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ مگھو کبھی تھی کہ اس کے خاندان کے جوان اور جنگلی تھینوں سے تعلقات تھے اور وہ اس کو دیکھ کر دُور سے سونڈ میں بلانا شروع کر دیتی تھیں۔ اس کے لڑکے کو اپنی ماں کی یہ بات بڑی ناگوار گزرتی تھی، لیکن خواجہ اس سے بڑا لطف لیا کرتا کہ وہ ایسے قصے بیان کرتے ہوئے مگھو غصے سے اور حسد سے سبز ہو جاتا کرتی اور اس کی آنکھیں میڑھتی ہو کر اوپر کو پڑھ جاتی تھیں۔ وہ جوان تھینوں کے لیے حرامزادیاں، کٹھنیاں، پُچل بھریاں کے الفاظ استعمال کیا کرتی اور ان کے ذکر سے اُس کی آنکھوں میں غصے اور نفرت اور دکھ کے آنسو آجایا کرتے تھے۔ وہ اپنے خاندان کو یاد کر کے کبھی نہ روتی تھی۔ اس کی بیو فانی اور بے اعتنائی اور ایک ٹھرا میرٹھیل ریٹینز کو یاد کر کے گھنٹوں آنسو بہا یا کرتی تھی۔ یہ آدمی اس نے بڑی محنت اور بڑی قربانیوں کے بعد جیتا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا دل ایک مچھیرن سے توڑ کر اپنی طرف کیا تھا۔ آٹھ سال تو اچھی طرح سے گزرے اور اس غرضے میں ان کے تین اولادیں بھی ہوئیں اور وہ بل کر کھیلنا کرتے اور باقی پکڑتے رہے، لیکن ایک چاندرات کو جب وہ تازہ پکڑی ہوئی تھینی کی وحشت کا سامنا کرنے کے لیے گڑھے میں اترا تو جوان تھینی نے اس کے بدن پر اپنی مست پھیرنی شروع کر دی اور خود لذت سے کاپنے لگی۔ مگھو چونکہ اسے پرکھڑی یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور اپنے خاندان کو تھینی کے سامنے عاجزی اور لذت سے سُر جھکائے عجیب و غریب آوازیں نکالتے سنتی رہی پھر مگھو جو سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے ایک بڑا پتھر اٹھا کر تھینی کے سر پر دے مارا۔ تھینی نے درد سے تو کم لیکن اپنی غلوت میں کسی کے ٹھل ہونے سے بلبل کر ایک جھج جھج ماری اور مگھو کے خاندان کو سونڈ میں لپیٹ کر اپنی پیٹھ پر بٹھالیا۔ سون کا یہ روتیہ دیکھ کر مگھو وہاں سے روتی بین کرتی اپنے بال کسوتی قبیلے کی طرف بھاگ گئی اور پھر ان میاں بیوی کے درمیان غیریت کی ایک وسیع غلطی حائل ہو گئی۔

خواجہ کہتا ہے کہ مگھو جو بتایا کرتی تھی کہ جس رات اس کا خاندان ایک نوجوان تھینی گئے جنگل میں ایک دو تہرے سے ماس کر رہے تھے ایک بوڑھا باقی دے پاؤں ادھر آٹھ لاس نے مہلا کے باپ کو قبول کی طرح اپنی سونڈ میں اٹھایا اور اپنے بدن کے دھکنے سے تھینی کو

زمین پر گر اویا۔ بھتی بھلا کر کھٹی اور اپنی سونڈ بڑھا کر مگکچو کے خاند کو بڈھے ہاتھی سے چڑھانا چاہا۔ لیکن اُس وقت تک بدنصیب انسان مضبوط سونڈ کے تنگ ہوتے ہوئے حلقے میں پک کر دم توڑ چکا تھا اور اس کی ساری پسلیاں چوڑا ہو گئی تھیں۔ نوجوان بھتی نے ہاتھی کے کان کے گرد اپنی سونڈ ڈال کر اُسے زور سے کھینچا اور بڈھے ہاتھی کا سارا کندھا خون سے لست پست ہو گیا۔ پھر ان دونوں میں باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ صبح قیلے کے لوگوں نے مگکچو کے خاند کی تلاش شروع کی تو کھنے جنگل میں موٹی دلدل والی جھیل کے پاس بھتی مری پڑی تھی۔ اور اس کے بدن پر چرے ہوئے فیل شکاری کے بڑے بڑے لوٹھڑے چمٹے ہوئے تھے۔ اوپنے درختوں پر گدھوں کے قافلے اتر آئے تھے اور دلدل والی جھیل کے درمیان ایک بڈھے ہاتھی کا جہاز ایسا جہم مزق ہو رہا تھا۔ قبیلے اٹھ رہے تھے اور پتلے گارے کی تہیں بھنور بنا رہی تھیں قبیلے کے سیانے نے سارے حالات کا جغرافیائی مطالعہ کرنے کے بعد مگکچو کو یہ کمائی سنانی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بوڑھے ہاتھی نے فتح پانے کے بعد خود کشتی کیوں کر لی تھی!

جس دن بھلا کا باپ مرا اُسی دن اُدھی رات کے وقت مگکچو کی باتیں ران پر زور کی کھلی اُٹھی اور وہ رات بھر غارش کی شدت سے چیختی اور کھلاتی رہی۔ صبح جب اُس نے اپنی ران کھول کر دیکھی تو اس پر ایک بڑا سیاہ دم تھا جس کی صورت آدمی کے چہرے سے ملتی تھی اور یہ پہرہ بھلا کے باپ کی شکل سے ملتا تھا۔ خواجہ بتایا کرتا تھا کہ جب میں اس چہرے پر ہاتھ پھیرتا تو مگکچو بہت خوش ہوتی اور اس کی آوازیں فاختہ کی کوکوسی پیدا ہو جاتی۔

ساڑھے تین سال خواجہ ملٹری کا جگمگوترا رہا اور یہ ساری مدت اس نے مگکچو کے چھوٹے بچے میں اس کے بڑے بیٹے بھلا کے ساتھ گزار دی۔ اچھا کھانا، اچھی شراب پینا اور رات کو مگکچو کے ساتھ لپٹ کر سو جانا۔ مگکچو قبیلے کی دوسری عورتوں کی طرح کوئی کام نہ کرتی تھی۔ اس کا پیشہ کالا علم تھا اور وہ جادو ٹوٹنے ٹوٹنے کے لیے دُور دُور تک مشہور تھی۔ اس پیشے سے اس کو اتنی آمدنی ہو جاتی کہ وہ تینوں دن عید دل اور راتیں شہر اتوں کی طرح گزارتے اور ہر وقت نشے میں جھومتے رہتے۔ اس اشنا میں جنگ بند ہو گئی اور ایک جرمن جوڈا کسی جغرافیائی مہم کے سلسلے میں یہاں خیمہ زن ہوا۔ لڑکی دن بھر مپ کیا کرتی اور اس کا ساتھی ایک چھوٹی سی گینتی اور کھٹاڑی لے کر جگہ جگہ سے زمین کھود کر دیکھا کرتا۔ گہرے پیلے رنگ کے خیمے کو سُرنگ گوٹ لگی تھی اور بھروسے

رنگ کے چمپر اور دُور سٹڈ کے سکرٹ میں سنہرے بالوں اور گلابی بدن والی لڑکی بندھتی۔ اس کے بازو کھلے تھے اور پینڈلیوں تک چمڑے کے بڑے بوٹ تھے۔ جتنی انگریزی اس کو آتی تھی خواجہ اس سے بہت زیادہ جانتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مختلف موضوعات پر رائیخا خیال کیا کرتے اور خواجہ گھبرا کر ہر بات اپنے اور مگکچو کے تعلقات کی تفصیل پر لے آیا کرتا۔ وہ چینی ڈاڑھی نکال کر اس میں نوٹس لیا کرتی اور اس کا ساتھی گینتی اور کھٹاڑی کے شوق میں بہت دُور نکل گیا ہوتا۔ پھر وہ تینوں سٹوڈ لیمپ جلا کر کالی کافی بناتے اور بغیر شکر کے پیتے۔ خواجہ نے چوکھ کالا علم نیا نیا کچا تھا اس لیے اس نے اپنا پہلا آزمائشی وار اس جرمن لڑکی پر کیا اور ایک بھٹے میں کامیاب ہو گیا۔ خواجہ کے اصرار پر جب مگکچو پہلی بار اس کے خیمے میں گئی تو دونوں نے ایک دوسرے کو پھینگی کی نگاہوں سے نہ دیکھا۔ خواجہ ترجمان کے فرائض سر انجام دیتا رہا، لیکن دونوں ایک دوسری کی نگاہوں کو سمجھتی رہیں۔ ایک دوسری کی بدن بولی کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں۔ شام کو جب خواجہ جھونپڑے میں آیا تو مگکچو نے کھکھری نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا: مجھے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دے، لیکن اس بھوری بندریا سے ذبح نہ کروا۔

خواجہ نے اُسے اپنے ساتھ چٹا کر کہا: کیسی باتیں کرتی ہے من موہنی! کہاں وہ کہاں تو! تیرے دل میں ایسا خیال کیوں آیا؟

مگکچو نے کہا: جب وہ ہم سے باتیں کر رہی تھی تو اس کی نگاہیں صرف تیری طرف تھیں اور صرف تجھی کو دیکھتی تھی۔

”وہ اس لیے“ خواجہ نے جواب دیا: کہ صرف میں اس کی بولی سمجھتا تھا اور جو بات سمجھتا ہو ہمیشہ نگاہیں اسی کی طرف کر کے بات کی جاتی ہے۔“

مگکچو نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور زور زور سے رونے لگی۔ خواجہ اسے چُپ کرانے میں مصروف ہو گیا اور اُسے چُپ کراتے کراتے جرمن لڑکی کے خیمہ لالوں میں ڈوب گیا۔

پھر ایک شام ایسی آئی کہ جرمن لڑکی کا ساتھی دیر تک جنگل سے نہ لوٹا۔ خواجہ اور وہ لڑکی اُسے دیر تک تلاش کرتے رہے اور بہت دُور نکل گئے۔ لڑکی نے دُختوں کے جُھنڈ میں ایک بڈھے سے گڑھے کو دیکھا اور جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔ خواجہ نے اس کی کلائی تھام کر کہا: آؤ نیچے

اتر کر دیکھتے ہیں شاید اس گڑھے کے کسی کونے میں کھدائی کر رہا ہو۔ لڑکی جھکی تو خواجہ اس کا بازو تھام کر نیچے پھسل گیا۔ وہ لڑکیوں کی کھاتے بری سبز گھاس اور جنگلی ساگ پر پھسلے کھڈے پاتال تک پہنچ گئے۔ لڑکی کے ننگے پاؤں اور گھٹنوں پر بہت سی خراشیں آگئی تھیں۔ خواجہ نے انہیں اپنی قمیص کے دامن سے صاف کیا اور اس کے کندھے پر اپنا گال رگڑنے لگا۔ جرمن لڑکی خوف اور لذت سے کانپنے لگی اور اس کے نل بوؤں کے اندر اس کے پیر پیچھے کو مڑنے لگے۔ خواجہ نے اسے اپنی گود میں ڈال لیا اور اس کے سترے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ جنگلی ساگ پر آرام سے لیٹی ہوئی جرمن لڑکی نے جب آنکھیں کھولیں اور اوپر دیکھا، تو گڑھے کے کنارے لگا جو کھڑی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے میں ایک بڑا سا پتھر ٹھٹھکا، تو اپنے آیا اور جرمن لڑکی کے سر کے پاس آکر زمین میں دھنس گیا۔ لڑکی نے زور سے چیخ ماری تو خواجہ بھی اچھلا۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لگا جو روتی بیٹی بین کرتی اپنے بال کھسوٹی قبیلے کی طرف جارہی تھی۔

جب خواجہ جرمن لڑکی کو اس کے خیمے میں چھوڑ کر تھو پڑے پر پہنچا، تو موٹے ٹمنوں والا چٹائی منڈھا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بڑی آوازیں دیں، بہت دروازہ بجایا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اس نے کھٹا ٹری لے کر دروازہ کاٹنا شروع کر دیا جب چٹائی کی تہیں کٹ کر نیچے گریں اور تھو پڑے کے اندر ڈرامی روشنی داخل ہوئی، تو خواجہ نے دیکھا، گیلے فرش پر نعن کا ایک تالاب ہے اور اس کے کنارے گراؤنڈیل لگا پتلی بیٹی ہے اور لکھنوی اس کے بائیں پستان کے نیچے پسلیوں میں گرٹی ہوئی ہے۔

جرمن سیاحوں کے ساتھ واپسی پر خواجہ کلکتہ میں مٹری پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور جھوٹا ہونے کی سزا میں انبالے چھاؤنی بھیج دیا گیا، لیکن جن دونوں کی میں بات کر رہا ہوں وہ تو خواجہ اور تازی کے زمانے کی بات ہے۔ اُس وقت ان دونوں کے بدن بولتے تھے اور ان کو زبان سے ایک دوسرے کی بولی سمجھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر خواجہ اس دنیا میں نہ رہے یا کراچی سے چلا جائے، تو تازی اس کی کھدائی کس طرح سے سہار کے گی اور زندہ رہنے کے لیے کس چیز کا سہارا لے گی۔ ایک دن میں نے حوصلہ کر کے تازی سے یہ بات پوچھ بھی لی۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے اور وہ سر جھکا کر بولی۔ میرے پاس نیلے تھوٹھے

کی ایک بڑی سی ڈلی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس علاقے میں خواجہ سے زیادہ خوش قسمت اور کوئی آدمی نہیں گزرا۔ کم از کم میری زندگی میں ایسا کوئی انسان نہیں آیا جس کے ساتھ ایک نو عمر لڑکی نے اس طرح سے محبت کی ہو۔

پھر ایک دن تازی اپنے وعدے کے خلاف بہت لیٹ پہنچی اور خواجہ جسے میں نے اپنی زندگی میں کبھی پریشان نہیں دیکھا تھا بہت بے چین نظر آیا۔ وہ پُر سکون صاحبِ عزم و ہمت استقلال کا مجسمہ کبھی چارپائی پر لیٹتا، کبھی اٹھ کھڑا، وتا۔ کبھی کھڑکی سے سرنکال کر ٹرک پر دیکھنے لگتا۔ کبھی گھڑے سے پانی پیتا، کبھی سگریٹ سلگاتا اور پھر آکر چارپائی پر لیٹ جاتا۔ تازی آئی اور اپنے بڑے قہقہے کے بند کھولتے ہوئے مسکرانے لگی۔ اس نے ایک آنکھ میچ کر خواجہ کی طرف دیکھا اور غرور مار کر کہا۔ ”سور ہے ہو سہنو“ خواجہ نے اسی طرح یلٹے یلٹے کہا۔ ”بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔“ وہ خواجہ کے پہلو میں دراز ہو گئی اور اسے لگ لگی کر کے کہنے لگی۔ ”دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں خواجہ نے پٹ کر دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں خاکی رنگ کا ایک لفافہ تھا اور اس لفافے میں خواجہ کے لیے قمیص کا بادامی کپڑا تھا۔ ”پسند ہے؟“ اس نے اٹھا کر پوچھا۔

”رکس کے لیے ہے؟“ خواجہ نے لائقیت سے کہا۔

”تمہارے لیے اور کس کے لیے؟“

”کیوں؟“

”کیوں کیا؟“ تازی نے جل کر کہا۔ ”قمیص کا کپڑا ہے مجھے پسند آگیا، میں نے لے لیا۔“

”یہ تو کم ہے۔“ خواجہ نے مصومیت کے ساتھ جواب دیا۔ ”مجھے تو اب چودہ گز

لٹھا چاہیئے۔“

”چودہ گز لٹھا! اکیلے؟“ تازی نے براہِ مان کر کہا۔

”ہاں!“ خواجہ بولا۔

”پھر تو ہمیں اٹھائیں گز لینا پڑے گا۔ مجھے بغیر کفن کے دفن کرو گے؟“

خواجہ نے کہا۔ ”بس رہنے دے!“

پھر ان کے درمیان کچھ اچھی باتیں نہ ہوئیں۔ دونوں طرف سے جیلے کٹے سے جیلے اُجرتے

ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ نہ رہے۔ اس تناؤ میں خواجہ بنی کی ڈوری کو ڈھیل دیتا

رہا اور وہ پھنسی ہوئی رو ہو کی طرح تڑپتی اور قہقہہ رہی۔ پھر وہ قہقہہ کا لٹافہ دہیں پھینک کر بڑبڑاتی ہوئی فلیٹ سے باہر نکل گئی۔

شام کو میں اور خواجہ فلم دیکھنے گئے۔ اس نے میرے ساتھ کئی باتیں کیں مختلف قسم کی عورتوں کو رام کرنے کے طریقے بتائے، لیکن اپنی ہی باتوں میں وہ خود موجود نہیں تھا، یکاڑی کی طرح بول رہا تھا۔ فلم دیکھتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں گوبرے پر مرکوز تھیں، لیکن اس کے ذہن کے اندر کوئی اور پروجیکٹر چل رہا تھا۔

ایک شام کھوکھے پر چائے پیتے ہوئے خواجہ نے مجھے بتایا کہ تازی کو کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ میرے ہاتھ سے پیالی چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ اس نے میری پیالی زمین سے اٹھا کر لڑکے کو آواز دی اور پھر کہنے لگا: ”جب عورت تم سے اٹھ کر بات کرنے کے بجائے کندھوں پر سے یا پہلو کی طرف سے نظریں گزار کر بات کرنے لگے تو سمجھ لو وہ سٹیشن بدلنے لگی ہے۔“ میں نے کہا: ”چھوڑو یا خواجہ! کسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو، تازی اور اس کو کسی سے عشق ہو جائے، تمہارے ہوتے ہوئے!“

خواجہ نے کہا: ”ہر انسان کے اندر ایک میٹر ہوتا ہے۔ کیا مرد کیا عورت، سبھی میٹر بڑھ کر بتا سکتے ہیں کہ محبوب کا رخ کس طرف ہے۔“

میں نے کہا: ”یہ میٹر کالے علم کا ہوگا۔ ہر ایک کے پاس تو نہیں ہوتا۔“ وہ میری بات سن کر ہنسا اور چل کر بولا: ”اُنکے پٹھے اس میں کالے علم کا کوئی دخل نہیں۔ یہ میٹر ہر شخص کو فٹ کیا کر یا ملتا ہے۔ جھک کر پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خود ہی سگنل دیتا ہے۔ خودی فریکوئنسی سیٹ کر دیتا ہے۔“

میں نے کہا: ”خواجہ یہ سب تیرے وہم ہیں۔ اب تو واقعی بوڑھا ہوتا جا رہا ہے۔“ اس نے لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

میں نے نچھینے طریق پر یہ بات تازی کو بتادی۔ پہلے اس کا چہرہ غصے سے لال ہوا پھر ایک دم پیلا ہو گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی: ”سچ بتا سچنی، اس کو کیسے معلوم ہوا؟“

یہ فخرہ سن کر میرے پاؤں تلے کی زمین ٹھل گئی۔ میرے سامنے کھڑی ہوئی تازی ایک دم معدوم ہو گئی۔ پھر آمو جو ہوئی۔ پھر دھواں سا بن کر ڈونو ہو گئی۔ پھر توبی جیسے کی طرح سامنے آکھڑی

ہوئی۔ ایک دم زوم آؤٹ ہو کر نقطہ سا بن گئی۔ اچانک زوم ان ہو کر میری ناک سے آگئی۔ اس کے چہرے کا ایک ایک سام چھوٹے چھوٹے جوتوں کی طرح پانی سے جھریا۔ میں نے کہا: ”تم نے کیا کم تازی؟“

تازی نے کہا: ”وہ بندر روڈ پر کتا بوں کی ایک دکان میں اکاؤنٹنٹ ہے اور ایف اے پاس ہے۔“

”کون؟ میں نے چیخ کر پوچھا۔“

”میں اس سے شادی کرانا چاہتی ہوں؟ اس نے جواب دیا۔“

”لیکن خواجہ؟ مجھے اس سے آگے کوئی اور لفظ نہ سوجھا۔“

وہ رونے لگی اور میرے ساتھ جھٹ کر بولی: ”میں خواجہ سے پیار کرتی ہوں۔ اس کو اپنی جان سمجھتی ہوں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔“

میں نے کہا: ”تمہارے ماں باپ یہ شادی طے کر رہے ہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا اور زور زور سے رونے لگی۔

روتی ہوئی عورت سے بات کرنا اس کی بات سمجھنا، اس کے لفظوں کو پہچانا اور اس کی سوچ تک پہنچنا بڑا مشکل کام ہے۔ میں زور زور سے اس کو جھنجھوٹنے لگا۔ جوں جوں میں اس کو بلاتا تھا وہ اور زور زور سے رونے لگتی تھی۔ پھر میں تھک ہار کر خاموش ہو گیا۔

میں نے وہ لڑکانیں دیکھا اور نہ اس سے کبھی ملا، لیکن تازی کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک شام جب وہ خواجہ سے مل کر واپس آ رہی تھی اور راستے میں موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی، تو رکشا تلاش کرنے میں اس لڑکے نے تازی کی مدد کی تھی۔ جب وہ رکشا میں بیٹھ چکی تھی تو اس لڑکے نے رکشا ڈرائیور کو ”ڈرائیور! کہہ کر روکنا اور تازی کے کچھڑ میں لیے ہوئے پلو کو زمین سے اٹھا کر پھوڑا تھا اور پھر اس کو تازی کے پاؤں کے پاس رکھ کر ایک طرف ہو گیا تھا۔

”خواجہ میری زندگی کی پہلی محبت ہے، میرا پہلوئی کا عشق ہے۔“ تازی رونے لگی: ”لیکن الطاف ہمدرد ہے۔ دل رکھنے والا ہے۔ خاموش ہے۔“

”اور جوان ہے۔“ میں نے کہا: ”تمہارا ہم عمر ہے۔“

اس نے میرے منہ پر زور کا ایک تھپڑ مارا اور کہنے لگی: ”تم ہر ایک کو اپنے جیسا مردی

سمجھتے ہو کہ انسان کے بجائے صرف جوانی سے محبت کرتا ہے۔

ہم دونوں خاموش ہو گئے اور یہ خاموشی بڑا طول کھینچ گئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میری کلاںیاں پکڑ لیں اور مٹھا کر کہی بولی: "بتاؤ سچنی میں اب کیا کروں؟ کس دیوار سے سر ماروں اور کہاں جا کر مروں؟"

میں نے کہا: "اس میں مرنے کی کیا بات ہے۔ خواجہ کو چھوڑ دو۔ اس کے ساتھ کوئی تم نے ٹھیکہ تو نہیں کیا؟"

"لیکن وہ مر جائے گا۔" اس نے غمزہ ہو کر کہا۔ "وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے گا۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔" میں نے یقین کے ساتھ کہا۔ "وہ کھیل کھایا آدمی ہے۔ کوئی ایک تیرے

ساتھ ہی تو وابستہ نہیں۔"

"میں جانتی ہوں اس کے بہت سے یارانے ہیں اور بڑی عورتوں سے اس کا تعلق ہے،

لیکن اس کی وابستگی صرف میرے ساتھ ہے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا؟"

"میرے وجود نے! "

"تمہارے وجود کے اندر کوئی میٹر لگا ہے؟"

"ہاں لگا ہے۔"

"پھر؟"

"بڑی مشکل بات ہے۔ اس کا کوئی اصل نہ مل سکے گا۔"

"تم آہستہ آہستہ خواجہ کو چھوڑ دو۔"

"میں آہستہ آہستہ ہی اس کو چھوڑ رہی ہوں۔"

"اور اس بات کا تمہیں رنج ہے؟"

"اب تو نہیں لیکن بعد میں شاید ضرور ہوگا۔"

"بعد سے کیا مطلب؟"

"بعد سے میری مراد وقت گزر جانے سے ہے۔"

"کیسا وقت ہے؟"

وہ پھر خاموش ہو گئی اور کچھ سوچنے لگی۔

خواجہ کے فلیٹ میں میں اندر چائے بنا رہا تھا۔ تازی اپنی مخصوص چار پائی پر لیٹی تھی اور

اس نے اپنے کھڑے زانو پر دوسری ٹانگ کی پنڈلی جا رکھی تھی۔ تکیہ پیٹ پر رکھا تھا اور تکیے پر

دونوں ہاتھوں کی گنگنی ڈالی ہوئی تھی۔ خواجہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

لگنیاں کرسی کے بازوؤں پر تھیں اور پیر ایک دوسرے سے جوڑ رکھے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ

رہا تھا: "اس سے کچھ نہیں ملے گا تازی کچھ بھی نہ مل سکے گا۔"

"مجھے اس سے سب کچھ ملے گا۔ وہ ہمدرد ہے۔ رحم دل ہے۔ مددگار ہے۔ مہربان ہے۔"

"یہ سب صفتیں تو خدا میں موجود ہیں تازی۔" خواجہ نے کہا: "اس سے کبھی کو کیا ملتا ہے؟"

"وہ تم جیسا نہیں۔" تازی نے چمک کر کہا: "وہ انسان ہے۔"

"میں اس جیسا بننے کی کوشش کروں گا۔" خواجہ نے رو کر کہا۔

"اب دقت گزر گیا خواجہ۔" تازی نے ہولے سے کہا: "تم اس جیسے کیسے بن سکو گے؟"

"میں بن جاؤں گا۔ بن جاؤں گا۔ بن جاؤں گا۔ تم مجھے ایک چانس دو۔"

"میں نے تم کو بڑے چانس دیئے لیکن تم وہی رہے جو پہلے تھے۔"

"ایک چانس۔ آخری چانس۔ آخری موقع۔"

"اب بہت مشکل ہے۔"

"حرام زادی لگتی ہے۔ وفا۔" خواجہ غصے سے کرسی سے اٹھا اور اس نے اپنی ہوائی چپل

اٹھا کر تازی کے گال کی طرف تانی۔ پھر وہ دیوانہ وار اس کے کھڑے پاؤں کو چومنے لگا اور زور

زور سے رونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر میں نے آگے بڑھ کر دروازے کی اوٹ میں

سے دیکھا۔ وہ پاگلوں کی طرح تازی کا پاؤں چوم رہا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں ہوائی چپل

تھی۔ تازی تہنس رہی تھی اور سینے سے اس کا سارا بدن مل رہا تھا اور وہ زور زور سے کہہ رہی

تھی: "خدا کے لیے۔" خواجہ اللہ کے واسطے۔ ٹھہر و مجھے گد گدی ہو رہی ہے۔ یہ رازم نکلا جا رہا

ہے۔ اک منٹ میری بات تو سنو۔ میرے تلوں سے تمہاری خوشبو می گڑھکا رہی ہے۔ مجھے

بڑی ہنسی آرہی ہے۔ خدا کے لیے، اللہ رسول کے لیے، پھر اس کی ہنسی بند ہوگئی اور کمرے میں بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

میں چائے کا ٹرے لے کر ان کے کمرے میں گیا، لیکن دروازے سے ہی پلٹ آیا۔ وہ اس حالت میں تھے کہ ابھی چائے نہ پی سکتے تھے۔

۱۶ مئی کو تازہ کی شادی تھی۔ خواجہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اس کے محلے میں گیا اور ہم بڑی دیر تک اس کے گھر سے دور اس شادی کا نظارہ کرتے رہے۔ باہر رنگ برنگ بچے نیلے پیلے کپڑے پہنے کھیل رہے تھے۔ عورتیں آجاری تھیں۔ مرد کڑیاں اور مونڈھے ڈال کر گلی میں بیٹھے تھے۔ ایک طرف دو دیگیں پک رہی تھیں۔ اکا دکا مہمانوں کے رکشے آکر رگ رہے تھے۔ جب بارش آئی تو خواجہ نے کہا: ”آؤ چلیں“

میں نے کہا: ”ابھی دو گھنٹی اور ٹھہرو۔ یہ آخری نظارہ بھی دیکھ لیں۔“

اس نے مجھے ماں کی گالی دے کر کہا: ”اب چل۔ کافی نظارے دیکھ لیے۔ جا کر کھانا بھی کھانا ہے۔“

ہم نے ایک ٹیکسی لی اور کیفے جارج کھانا کھانے چلے گئے۔ موسم کے آثار کچھ اچھے نہیں تھے۔

پھر دن آہستہ آہستہ گزرنے لگے۔ خواجہ اپنے تجربے کے بل پر اور کالے علم کے زور پر مجھ سے کہا کرتا: تم دیکھ لینا، تازہ آئے گی اور ضرور آئے گی۔ وہ مجھے بھلا دے تو بھلا دے، لیکن اس مٹانے کی چادر کو نہ بھلا سکے گی جس کے نیچے ہم دونوں لیٹا کرتے تھے۔

علم کا سہارا بھی بڑا کمزور سہارا ہے۔ ایک تیرک اپنے علم اور تجربے کے زور پر پھرے ہوئے دریا اور بحرے پر کراں پار کر جاتا ہے اور اسی علم اور تجربے کی بنا پر جھیل کے بند پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ کبھی کھل جہنم کھنسنے سے بند دروازے کھلنے لگتے ہیں اور کبھی اسی ورد کے دھنسنے سے دروازوں کے آگے پتھر گرنے لگتے ہیں اور سنگین دیواریں اٹھنے لگتی ہیں۔

پورے سولہ دن بعد تازہ کی خواجہ کے فلیٹ میں آئی۔ اس نے قرمزی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور دوپٹے کو پسے گوٹے کا دو دو اٹھل چوڑا ماسیہ لگا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی بیوقوفی

اور اُسی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے اپنا پرس چار پائی پر لیٹے ہوئے خواجہ کے سر ہانے رکھ دیا اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کُنیاں کرسی کے بازوؤں پر تھیں اور سینڈلوں والے پاؤں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ خواجہ نے اسی طرح لیٹے لیٹے تکیے کے نیچے سے سگریٹ نکالا اور آرام سے سُکا کر بولا: ”کیسی ہوتا زنی؟“

”اچھی ہوں۔“

”اچھی کہ بہت اچھی۔“

”بس ٹھیک ہے۔“

”کیسا ہے تمہارا خاوند؟“

”ٹھیک ہے۔“

”خوب فنٹ فنٹس رہے اتنے دن؟“

”ہاں جی۔“

”بڑے اچھے کپڑے پہن رکھے ہیں۔“

”شکریہ۔“

”میکے کے ہیں یا سُسرال کے؟“

”سُسرال کے۔“

”میرا تو خیال تھا تم جلد آؤ گی۔“

”میرا بھی یہی ارادہ تھا، لیکن الطاف نے دکان سے چھٹی لے رکھی تھی۔“

”الطاف نام بہت اچھا ہے۔“

”ہاں جی۔“

”کتنی عمر ہو گی اس کی؟“

”مجھ سے پچھ سال بڑا ہے۔“

”پھر تو بڑا جوان ہو گا۔“

”ہاں جی۔“

”اؤ:“خواجہ نے ایک طرف ہو کر کہا: ”لیٹ جاؤ“

”نہیں جی شکریہ“

”تم تھک گئی ہوگی“

”نہیں جی کوئی ایسی خاص تھک بھی نہیں“

”پھر بیٹھی لیٹ تو جاؤ:“

”اب میں جلتی ہوں جی:“ اس نے آگے بڑھ کر اپنا پرس اٹھالیا۔ خواجہ نے اس کی کلائی تھام لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ زور لگانے لگی تو خواجہ نے ایک ہی جھٹکے سے اس کو چارپائی پر گرالیا۔ تازی رونے لگی۔ کچھ اس کو اپنے پہلوئی کے عشق کی موت کا غم تھا۔ کچھ اپنے مستقبل کا خوف، کچھ پرانی یادوں کا دکھ، کچھ نئی زندگی میں داخل ہونے کا قلق، کچھ الطاف سے دُوری کا رنج۔ بڑے بڑے موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر تیزی سے پھسلنے لگے۔ خواجہ نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اُسے پرے دھکیل دیا۔ پھر ان دونوں کے درمیان پھینا جھپٹی اور ہاتھ پائی شروع ہو گئی۔ وہ رو رہی تھی، کراہ رہی تھی اور اپنے بڑے ناخن خواجہ کی کلائیوں میں گاڑ رہی تھی۔ خواجہ بائیں ہاتھ اور کانپ رہا تھا اور غصے میں بول رہا تھا: ”ایک مرتبہ بس ایک مرتبہ۔ صرف ایک بار آخری بار“ اور تازی ”نہیں نہیں“ کہہ کر اس سے جان چھڑا رہی تھی۔ پھر میں نے اپنے کمرے میں تازی کو اس کے جھنگل سے نکل جانے کی کھڑاک سُنی۔ اُس کا سر دروازے سے اور اس کا پرس کرسی سے ٹکرایا تھا۔ خواجہ اس کے پیچھے اُبھرا، لیکن وہ دروازہ کھول کر نکل چکی تھی۔ تازی مینشن کی سیڑھیاں تیزی سے اُتر رہی تھی اور خواجہ اسے آوازیں دے رہا تھا: ”تازی! تازی! تازی“ تازی کی آوازیں کھوتی ہوئی سیڑھियों کے درمیان دیوار کے ساتھ جبر لگاتی اور رینگ کی سلاخوں کے درمیان سے بتدریج نیچے گرتی جاتی تھیں۔

میں نے جا کر خواجہ کو دونوں کندھوں سے تھاما اور واپس لا کر چارپائی پر ڈال دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر شرمندگی سے مسکرایا اور سگریٹ سٹکا کر بولا: ”ایسے ہی ایک شام ملگا جو مجھے اس جرمن لڑکی کو دیکھ کر جگا لیا تھی اور اس نے اپنے جھونپڑے میں جا کر خودکشی کر لی تھی“

میں نے کہا: ”خواجہ یہ بھی مجھے ناخوش دکھائی دیتی ہے“
اس نے سگریٹ کا ایک لمبا ساش لگا کر کہا: ”آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔ شادی میں پہلے پہل ہی ہوتا ہے“

اگلے روز سہ پہر کے قریب میں خواجہ کا دروازہ دیر تک بجاتا رہا، لیکن اس نے اندر سے گندمی نہ کھولی۔ میرے دل میں طرح طرح کے دوسرے اُٹھنے لگے اور میں نے خوفزدہ ہو کر دروازہ اور زور سے بجانا شروع کر دیا۔ ساتھ کے فلیٹ سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت نکل کر بولی: ”وہ آج سویرا نکل گیا ہے“
”لیکن دروازہ تو اندر سے بند ہے“ میں نے کہا۔

”اوہ“ دوسرے والے کو تالا لگا کر گیا ہے۔ چھوٹے والے کو تو عورت نے جواب دیا۔
میں نے دیکھا خواجہ کے فلیٹ کا دوسرا چھوٹا دروازہ جو کبھی نہ کھلتا تھا باہر سے تالا بند تھا۔ میں دل ہی دل میں خواجہ کے بارے میں سوچتا اس کے مختلف ٹھکانوں کی کھوج میں سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ تیسرے روز جب ہم کو خواجہ کی پرسٹ مارٹم رپورٹ ملی، تو اس میں لکھا تھا کہ موت نیلا تھو تھا کھانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

سیف الملوک کے پہاڑوں کی گونج زالی ہے۔ بڑی آہستگی سے کسی ہوئی بات بڑی دیر کے بعد ویسی کی ویسی لوٹ آتی ہے۔ ممتی کی بات اپنی مسافت طے کر کے لوٹ رہی تھی۔ بوڑھے کو سب سے بڑا چچکا اس وقت لگتا ہے جب وہ کسی عورت سے ملاپ کا خواہشمند ہو۔ اس کا اٹھارہ کرے اور پھر اس کو صاف انکار کر دیا جائے۔ وہ ایک نوجوان کی طرح اس انکار کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، شور نہیں مچاتا، طے نہیں دیتا۔ چپ چاپ سُن لیتا ہے اور پنی جاتا ہے۔ اس انکار کے بعد وہ اپنے گرد و پیش سے اپنی خوراک سے اپنے لباس سے لا تعلق ہو جاتا ہے اور ایک دن اپنے کپڑے اٹھا کر گھر کے کسی کمرے میں جاتا ہے اور وہاں جا کر خاموشی سے مر جاتا ہے۔

ہم پھر آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھنے لگے اور ہم میں سے ایک ایسا بھی تھا جس نے سولہ سال ایک لڑکی کے ساتھ بے پناہ محبت کی تھی اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی ساری زندگی اس محبت کی دلیلیز پر قربان کر دی تھی۔ اس وقت وہ لیڈر کے ساتھ ساتھ خاموشی سے چل رہا تھا اور اس کے ہر قدم کے

ساتھ سوچ کی زنجیریں بچ رہی تھیں۔ سوچ، یاد، خیال حافظہ صرف ذہن کے کھونٹے سے نہیں بندھے ہوتے۔ ان کی ایک ڈور چلنے سے بھی بندھی ہوتی ہے۔ فلموں میں سوچنے والے آدمی کو آگے پیچھے چلتے دکھاتے ہیں۔ پنجاب کے لوگ گورنر کہتے ہیں کہ فدا کی عقل گڑبڑ میں ہے لیکن حقیقت میں شاید ان کی سادگی دریافت کر چکی ہے کہ عقل کا اور سوچ کا ٹخنوں سے گہرا تعلق ہے۔ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا انسان خاموش اور پُر سکون ہوتا ہے لیکن جب اس کی سوچ کے گرد اس کے شعور اور لا شعور کا عمل الیکٹرون اور پروٹون کا پیڑن بنانے لگتا ہے تو اس کا پاؤں اس کا گھٹنیا پوری ٹانگ آپ سے آپ ہٹنے لگتی ہے اور سارے جسم میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔ یہ ارتعاش اور آگے بڑھنا لازم کار ارتعاش ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ ایک مافی فانی ہوتا ہے اور دوسرا فزیکو میٹری کا۔ انسانوں نے جب سے ٹانگوں کا استعمال کم کر دیا ہے اور چلنے کے عمل کو محدود بنا دیا ہے۔ اس وقت سے ان کی جتنی سوچ میں مکانیکی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ درجہ کی طرح مسائل حل کر دیتے ہیں لیکن دوسرے جانداروں کی طرح مسائل کی فطرت اور ان کی رُوح سے واقف نہیں ہوتے۔ ان کے مسائل کے درمیان ایک رشتہ پیدا نہیں ہوتا آپس میں نیونڈرا بھاجی کا برتاؤ نہیں ہوتا۔ یہی اعداد و شمار تو پیش نہیں کر سکتا لیکن اپنے مشاہدے کی بنا پر ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ لفظ میں سوار ہو کر پندرہویں منزل پر جا کر اپنی محبوبہ سے ملنے والا انسان اس نوجوان سے مختلف ہوتا ہے جو کہ ٹھٹھاپ کر اور اپنے گئے گودے چھوڑ کر محبوبہ کے بالا خانے میں پہنچتا ہے جو اپنی پیش قدمی میں اپنی ٹانگیں استعمال کرتا ہے اور انہیں اپنے ذہن اور اپنی سوچ کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ اسی طرح کاریں سوار ہو کر وقت مقررہ اور مقام مقررہ پر پہنچنے والا عاشق جب اپنی محبوبہ سے ملتا ہے تو اس کے ذہن اور بدن کا عمل اس نوجوان سے مختلف ہوتا ہے جو نہ کہ رے کی کڑوں کے درخول میں بھاگتا ہو یا پرائی پٹی کا چکر کاٹ کر ویران آدے کے پیچھے سے ہو کر کھیت میں ساگ توڑتی محبوبہ سے ملتا ہے۔

قدم اور ذہن کا ساتھ بہت پُرانا ہے اور وہ جو ہم میں سے ایک قدم قدم چڑھائی چڑھ رہا تھا جس کا سر اور کندھے جھکے ہوئے تھے جس کی باہر کو نکل ہوئی فنکمری پر جھولتا ہوا میوریک بچ رہا تھا، بڑی تیزی کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ فرزانہ نے سولہ سال کی دانہ دانہ محبت کو تھیلی پر مسل کر پھونک مار کر کس طرح اڑا دیا۔ اُس سے آنکھیں ملانے تسخر سے ہنسنے اور ہنسنے کی قوت کیے

حاصل کر لی اور اپنی خاموش سنگتی ہوئی محبت کو چٹکی بجا کر پھیل پھری میں کیسے تبدیل کر لیا اور پھر بیچو بیچو گنڈیریاں دو تیریاں دو تیریاں کرتی ہوئی بے وفا عورتوں کے گردہ میں کس طرح شامل ہو گئی۔ جوں جوں اس کے قدم آگے کو بڑھتے اور اُدپر کو اُٹھتے تھے وہ آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف جارہا تھا۔ اس دن کی طرف جب انہوں نے اپنے درمیان اظہار محبت کا ایک کوڈنگل قائم کیا تھا کہ جب ہم میں سے کوئی دوسروں کی موجودگی میں الفت کی شدت سے مرن کنا لے ہو جائے اور اظہار کا کوئی ذریعہ نہ پائے تو وہ تین مرتبہ اپنی آنکھیں کھول کر پھوٹوں کو آہستگی سے بند کرے اور ٹھنڈی سانس کو اندر ہی جذب کر کے خاموش ہو جائے۔ اس سنگل کے کوئی چھ ماہ بعد ایک اور سنگل دفع ہوا کہ جب فرزانہ رات کو اسے خدا حافظ کہے اور ہمارا دوست پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر اپنے ویران گھر کا رخ اختیار کرے اور اس کی روانگی کے پورے اسی گھنٹے کے بعد فرزانہ اپنے کمرے کی بتی تین مرتبہ بجھائے اور تین مرتبہ روشن کرے اس کے پچانک سے نکلنے پر دونوں اپنی اپنی جگہ دل ہی دل میں یہ مہارنی شروع کر دیتے۔

ماٹھ پر پہنچ کر ہمارا یار مڑتا جیبوں سے ہاتھ نکال کر سینے پر باندھتا اور ٹانگیں باندھ کر روشن کھر کی کی طرف دیکھنے لگتا۔ بتی بجھتی پھر جلتی، پھر بجھتی پھر جلتی، پھر بجھتی اور جلتی۔ یہ واقعہ کو بیٹھوں کے درمیان ٹوٹے ٹوٹوں والی بجز قدیم زمین میں سرکندے کے اس جوجھے کے پاس پیش آتا جو جلا ہوا تھا اور جس کی کالک سرمنی ہو کر آہستہ آہستہ ہم رنگ زمین ہو رہی تھی۔ ہمارا دوست اس جوجھے کے پاس بیٹھ کر خاکستر سے سسے کرتا اور پھر جلتی ہوئی روشنی کی طرف منہ کر کے دو رکعت نفل ادا کرتا۔

سلام پھیر کر ہلکا ہلکا سا اٹھتا اور سیٹی بجاتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو جاتا۔

سردیوں کی ایک شام اس نے ایک نوجوان کو دیکھا جو فرزانہ کے گھرانے کے ساتھ آتش دان کے پاس بیٹھا تھا اور فرزانہ اس کو مانٹا چھیل کر دے رہی تھی۔ وہ ایک ایک پچانک لیتا صوفے پر ساتھ پڑی ہوئی پرتح سے نمک مرچ چھوٹا اور گورہی سی منہ میں رکھ لیتا۔ فرزانہ نے تین پچانکیں چھیل کر ہمارے دوست کو بھی دیں جس نے انہیں اسی پرتح سے لتھیر کر کھایا اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ فرزانہ اور اس کے گھر والے اس نوجوان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے اور وہ ہنس ہنس کر جواب دیتا رہا۔ ہمارے دوست نے جب یہ صورت حال دیکھی تو ایک لمبی سی جمائی لے کر فرزانہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ تین مرتبہ اپنی آنکھیں کھولیں اور بند کیں۔ فرزانہ نے مالٹوں کے

لفافے کی گردن مرد زکلفا فیتا پی پر رکھا۔ پتھ اس نوجوان کے پہلو سے اٹھا کر لفافے کے پاس رکھی اور جو اب تین مرتبہ آنکھیں کھولیں اور بند کیں۔ اس عمل میں آج پہلی مرتبہ کوئی پندرہ سیکنڈ کی دیر ہوئی، لیکن ہمارے دوست کا دل خوشی سے مفرح ہو گیا اور اس نے فرزانہ کے ہنسنے کو وہ لطیفہ سنا شروع کیا جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ لطیفے کے خاتمے پر گھر کے سب لوگ کھلبکھلا کر ہنسنے لگے۔ لیکن اس نوجوان نے مسکراتے پر اکتفا کی۔ فرزانہ بھی ہنسی لیکن اتنا زیادہ نہیں جس قدر اسے ہنسا چاہیے تھا۔ ہمارا دوست پھر دردناک ہو گیا۔ باتوں کا سلسلہ سیاست سے نکلا، نیش کے گرد گھوما اور پھر مقامی لوگوں کی زندگیوں پر محدود ہو گیا۔ اس اثنائیں رات کے دس بج گئے۔ فرزانہ کی امی نے رائے دی کہ اب سونا چاہیے۔ آپا نے کہا ابھی غموٹھی دیر اور بیٹھا جائے۔ فرزانہ نے کہا آپا ٹھیک کہتی ہیں پانچ منٹ اور بیٹھا جائے۔ مالٹے والے نوجوان نے کہا پانچ منٹ زیادہ ہیں تین منٹ اور بیٹھا جائے کیوں کہ کل مجھے انٹرویو دینے جانا ہے۔

فرزانہ نے کہا تین منٹ ٹھیک ہیں۔

ہمارے دوست نے کہا: مجھے تو اجازت دیجیے مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔

اس جلدی پر سب لوگ قہقہہ مار کر ہنسنے اور مالٹے والے نے کہا: تین منٹ جلد پہنچ کر آپ کیا کر لیں گے؟

ہمارے دوست نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ فرزانہ کا ہنسنی اور اس کی آپا بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ دونوں اسے پچانک تک چھوٹے آئے اور جب وہ اسے شب بخیر کہہ کر پچانک سے نکلا تو اس کی مہارانی اپنی رفتار بھول گئی۔ ساتھ گتے گتے وہ جلے ہوئے بوجھے کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے پلیٹ کر روشن کھڑکی کی طرف منہ کیا ہاتھ سینے پر باندھے اور انتظار کرنے لگا۔ بانو سے اور ترانو سے کے درمیانی وقفے میں بتی بجھی۔ پھر جلی بھرنی بجھی اور جلی بجھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور جلدی جلدی دور کست نفل ادا کر کے تیزی سے گھر کی طرف جاگنا شروع کر دیا۔

مالٹے والا انٹرویو دینے آیا تو پھر وہیں رہ گیا۔ ایک مہینہ دو مہینے اوپر کئی اور ان گنت دن۔ اس عرصے میں فرزانہ بڑی خوبصورت ہو گئی۔ اس کے کپڑوں سے اچھی اچھی خوشبو آنے لگی۔ اس کا قد پہلے سے لمبا ہو گیا اور وہ جو ایک گڑھا سا اس کے گال میں تھا وہ اور گہرا ہو گیا۔ اس عرصے

میں وہ ہمارے دوست کے ساتھ اور توجہ سے اور التفات سے پیش آنے لگی اور محبت کے اظہار میں پہلے سے مندر ہو گئی۔

ایک دن ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے اس نے ہمارے دوست کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور صوفے کے پیچھے کھڑے ہو کر کہنے لگی: تم اس طرح سے منہ کیوں رہتے ہو؟

”رہتا ہوں میری مرضی“ اس نے جمل کر کہا۔

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی؟“ اس نے ہنس کر کہا۔

”یہی تو بات ہے“ اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

اس پر فرزانہ قہقہہ مار کر ہنسی اور ہمارے دوست کے سر پر ہلکا سا ٹھوکا مار کر کہنے لگی: تم بالکل کا کے ہو۔ چھوٹے سے کا کے۔

”ہاں نہیں کا کا ہوں، لیکن تمہیں اس سے کیا؟“

وہ یہ بے ہودہ جواب سن کر اور زور سے ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

”ہنسنے جاؤ، ہنسنے جاؤ، ہمارے دوست نے سر جھٹکا کر کہا: اب تم نے ہنسا ہی ہے؟“

فرزانہ اس کے سامنے آکر رکوع میں کھڑی ہو گئی اور ہنستے ہوئے بولی: بھائی صاحب ہنسا کوئی جرم ہے؟“

”نہیں جرم کیوں ہونے لگا۔ بڑی نیکی ہے، لیکن پہلے تو ایسی ہنسی میں نے تمہارے چہرے پر کبھی نہ دیکھی تھی۔“

”پہلے تم نے میرا چہرہ ہی کب دیکھا تھا؟“

”دیکھا تھا دیکھا کیوں نہیں تھا۔ سو مرتبہ دیکھا تھا۔“

”تو میں ہنستی نہیں تھی۔“

”ہنستی تھی، لیکن اس طرح سے نہیں ہنستی تھی۔“

”پہلے کیسے ہنستی تھی بھلا؟“

”اتو کے پنچوں کی طرح حرامزادوں کی طرح۔“

”تو توجہ توجہ، گالیاں۔“ اس نے باری باری دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا اور دوپٹہ منہ میں خوس

لگتا۔ اس کے منہ کی آواز کافی بلند ہو گئی تو مسعود نے کہا: ”ہوا کیا؟“ اس نے اس طرح ہنستے ہوئے کہا۔

مفسق نے کہا: الحمد للہ ہوتی ہے، خدا سے خوش رکھے۔“

ہم سب کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ پھر مسکرایا اور ہنسنے لگا۔

مفتی نے کہا: ٹھیک ہے ٹھیک ہے یا اس کو کہنے دو۔ کم از کم ایک چیز تو سیکھ لی ہے اس نے اپنی گل بیاری سے۔“

”لیکن حد کیا ہوئی؟“ مسعود نے پوچھا۔

”اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی؟ مفتی نے کہا۔

”حد ہو گئی یار! اس نے اپنے آپ سے کہا: ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں؟“

”کیا کیا اس نے؟“ مسعود مراجار ہاتھا۔

”توبہ، توبہ! اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔“ چالاکی، صاف چالاکی، سُدھی چالاکی۔“

129

اس نے کہا: میرے پاس کوئی ثبوت نہیں، لیکن میں خدا کو برحق سمجھتا ہوں۔“

ہم نے کہا: خدا کا تصور تو تمہیں تمہارے والدین نے دیا ہے، تمہارے معاشرے نے دیا ہے۔“

اس نے کہا: یہ تصور میرے اندر نے دیا ہے، میرے وجود نے دیا ہے۔“

ہم نے کہا: تمہیں اندر سے کوئی آواز آتی ہے؟“

اس نے کہا: بالکل نہیں۔

ہم نے کہا: ”پھر؟“

کہنے لگا: مجھ نہ اندر سے آواز آتی ہے نہ باہر سے نہ زمین سے نہ آسمان سے، لیکن آتی ہے۔

ہم نے کہا: یہ پھر آتی کہاں سے ہے؟

اس نے کہا: ”فرزانہ سے آتی ہے، اس کی ہنسی سے آتی ہے، اس کی رفتار سے آتی ہے۔“

یہ کیا کہتی ہے؟ ہم نے پوچھا۔

”کچھ نہیں“ اس نے کہا۔ کتنا کیا ہے۔ وہی کستی ہے جو میں سُنتا ہوں۔“

ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا: اس سالے کے جو تے ماروے

اس نے ہمارے چہروں کو ایک ایک کر کے دیکھا اور پھر رونے لگا۔ ہم میں سے کسی

س کو چپ کرانے کی کوشش نہ کی۔ روتے روتے اس کی جھلمی بندھ گئی اور پھر وہ خود ہی

ہو گیا۔ اسو پو پو کر مسکرایا اور مسعود سے کہنے لگا: یار مجھے ایک گلاس پانی تو پلائے مسعود ایک

پانی لے آیا اور ہم اسے پانی پیتے دینے لگے۔ پھر اس نے ہنس کر کہا: یار صد ہو گئی۔ اور

سپاہی پر رلھ دیا۔ ذرا سا بھگ کر اس لے فرسٹ پر اپنے جو لے سیدھے کیے اور پھر بنے

میں بیٹھا ہے اور وہ لوگ تاش کھیل رہے تھے اور یہ ان کے لیے پلیٹ میں بکٹ ڈال کر لے جا رہی ہے اور وہ لوگ چائے پی رہے ہیں اور میں جیسے اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہوں۔

اور اس نے سائے بکٹ لے جا کر مالٹے والے کو دے دیے مسعود نے جلدی سے کہا۔
 مکہ لعنت تم پر مسعود مفتی نے تالی بجا کر کہا: ادکم بحسب اہلنا نہیں یہ کہہ رہا ہے، وہ ہنگامی سے آئی اند اس کے آگے پلیٹ کر کے بولی: لو بکٹ کھاؤ، کیوں بھیڑی کھانا اس نے یہ قوم بڑی چالاک ہوتی ہے جب دونوں ہاتھ بندھے ہوں۔ رستی سے یا ہتھکڑی سے یا صابن کے جھاگ سے پھر عورت ضرور کچھ نہ کچھ افر کرتی ہے۔ کیوں مہنی؟ اور جو سنانے ہوتے ہیں میرے جیسے وہ صابن سمیت بکٹ اٹھا لیتے ہیں اور جو میری ہوتے ہیں اس جیسے فیس ٹی ڈنٹس وہ انکار ہی ہو جاتے ہیں، حالانکہ اس رستے میں پھسلنے سے نہیں گھبرانا چاہیے۔ کون صابن تھا؟

ہمارا دوست پھر مہنا اور سر جھٹک کر بولا: حد کر دی یا اس نے۔
 مفتی نے کہا: مسعود جی ہمارے پرنے بزرگ سن لائیت صابن زیادہ پسند کرتے تھے میں اس صابن پر ایک کتاب کھ سکتا ہوں۔ بڑے بڑے واقعات مجھے یاد ہیں۔
 مسعود نے کہا: پہلے اس کی بات تو سن لو مفتی جی۔

سن لی سن لی، مفتی نے سر ہلا کر کہا: سمجھ لی۔ اب اس میں رہ گیا ہے۔
 اس نے ہمیں جھلکا کر اپنے آپ سے کہنا شروع کیا: حد ہو گئی یا۔ میں رنگ کے پاس کھڑا ہاتھ دھو رہا تھا اور میرے دونوں ہاتھ صابن سے لٹھرے ہوئے تھے۔ وہ بکٹوں کی پلیٹ لے کر آہنگی سے میرے پاس آئی اور میرے بائیں گال کو زور سے چوم کر بولی: یہ کیا سٹری ہوئی شکل بنا رکھی ہے۔ اور پھر تیزی سے پلیٹ لے کر چائے پینے والوں کے پاس چلی گئی۔

مسعود نے زمین سے اپنی چوٹی اٹھا کر کہا: اس حرام زادے کے جوتے مارو ابھی رو رہا تھا سورا۔
 اس نے پھر اپنے آپ سے کہنا شروع کیا: حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ کبھی ایسی بات ہوئی ہی نہ تھی۔ کبھی اس کی توقع ہی نہ تھی۔ یہ اس نے کیوں کیا میرے ساتھ ایسی چالاک کیوں کی؟
 مسدھی چالاک۔

پھر اس کا چہرہ غموم ہو گیا اور فرزانہ کی بے وفائی کا دھواں اس کے گال پر پھیلنے لگا۔
 جب مفتی نے اس حادثے پر تنقید کی تو مسعود نے اپنی چوٹی پھر فرش پر رکھ دی۔ تھوڑی دیر غموشی

رہی پھر وہ کہنے لگا: اس نے میرا دل کھٹا کر دیا یاد۔

اب کیا ارادہ ہے؟ مفتی نے آہنگی سے پوچھا۔

آج شام پھر اس کے یہاں جا رہا ہوں۔ اس نے آہنگی سے جواب دیا۔

جب انسان کا دل کھٹا جاتا ہے تو وہ دل کھٹا کرنے والے کی یاد کا سوڈا منٹ ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہے۔ تنہائی میں بھی یہ گولیاں چوستا ہے اور دوسروں کے ساتھ مل کر بھی ان سے رنگ کرواتا رہتا ہے۔ سوڈا منٹ کی یہ سپلائی ایک طویل مدت تک ختم نہیں ہوتی اور بے دغا لوگوں کی دل کھٹا دینے والی باتیں سننا تاہو یہ انسان معدے اور دودھ میں السر لے کر چپ چاپ یہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔

جیل سیف الملوک کا کوئی اثر آثار نہ تھا اور ہم آہنگی سے چلے جا رہے تھے۔ وہ ہم سب سے آگے تھا اور تقریباً اس کے ساتھ ہی لیڈر پھر میں اور میرے ساتھ عماد مسعود اعظمی اور مفتی ذرا پیچھے تھے۔ میں نے دیکھا اس کے ساتھ پُرانی یادیں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کی ٹانگوں سے سوچنے کا عمل جاری تھا۔ میں نے کہا: دیکھو عماد اس سالے کی ٹانگوں سے اب بھی یاد کی بیڑیاں بندھی ہیں اور ان کی آواز یہاں تک آرہی ہے۔

”اُف شاہ جی، عماد پورے زور سے چلایا۔ میں ابھی یہی بات یہی فقرہ کہنے کے لیے منہ کھول رہا تھا کہ آپ بول پڑے۔ صرف بیڑیوں کی جگہ میں شیکڑ کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔
 پھر اس نے پلٹ کر کہا: مفتی جی دو دھنوں میں ایک خیال ایک ہی وقت میں کیسے آجاتا ہے؟

اعظمی نے کہا: صبح ہو تو اس کو شاعری میں تو اڑکتے ہیں، نارنگی ہو تو سرقہ۔ ویسے اس طرح سے کبھی ہوا نہیں وہاں بات ہے۔

”ہوتا ہے ہوتا ہے کیوں نہیں؟ مسعود نے دھوکے سے کہا: ٹیلی بیجی کا نام نہیں سنا یہی تو وہ چیز ہوتی ہے جس سے خیال ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے۔

مفتی نے کپتان کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا: اُتار دیا اُتار دمجھے۔ پھر جا ہلوں نے ایسی بات شروع کر دی جس کے بارے میں ال کا نام کو کو نہیں جانتے۔

کپتان نے مفتی کو اپنی بیٹی سے اُتار کر نیچے کھڑا کر دیا اور کافی دیر تک مفتی کا ازار بند اس

کی ٹانگوں کے درمیان جھولتا رہا۔ اس نے ہم کو ٹیلی بیٹھی اور سائیکو کا میسر پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دے ڈالا اور پیر سائیکوجی کی اصطلاحات میں الجھا دیا۔ مسعود نے کہا مفتی یا رہتاری سائیکوجی بھی گشتی عورت کی طرح ہے۔ کبھی کسی کی بغل گرم کرتی ہے، کبھی کسی کا دل لٹھکتی ہے۔ قابو میں کسی کے نہیں آتی۔

مفتی نے کہا: یہ علم ہی گشتی ہے کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ اب تک تحلیل نفسی ہی کا کوئی حتمی اور آخری فیصلہ نہیں ہوا۔

• ریشہ خطنی کا فیصلہ البتہ ہو گیا ہے، عظمیٰ اپنے مخصوص انداز میں بولا اور عماد چیر کر کہنے لگا: یہں کو لفظوں کے الٹ پھیر کا چسکا ہے مطلب چاہے نکلے نہ نکلے۔

• وکیوں مطلب کیوں نہیں نکلتا؟ عظمیٰ سنجیدہ ہو کر بولا: فرائیڈ کا سارا فلسفہ ریشہ خطنی سے تعلق رکھتا ہے۔ کیوں مفتی جی؟

مفتی نے عظمیٰ کو ایک مہذب سی گالی دے کر کہا: سالانہ ٹیک بکواس کرتا ہے۔

ہم پھر چلنے لگے تو کوہستانی زمین پر بیٹھ گیا اور مفتی نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا: جان بابا! ابھی میں چند قدم چل سکتا ہوں حکومت کرو۔

اب پہاڑ پر راستہ تنگ ہو گیا تھا اور دونوں طرف اُگی ہوئی جھاڑیوں کی تسمیں بدل گئی تھیں۔ سب کی شاخیں مختلف تھیں، پتے مختلف تھے، پھول مختلف تھے اور ان کا جرم نیچے رو جانے والی جھاڑیوں سے مختلف تھا۔ ہم میں سے ہر ایک تھک چکا تھا، لیکن زبان سے کوئی بھی اقرار نہ کرتا تھا۔ پاؤں تو راستے پر ٹھیک پڑتے تھے، لیکن ٹانگوں میں سکت نہیں رہی تھی۔

ہم اپنی قوت کے بل پر نہیں، بلکہ قوتِ ارادی کے بل پر چل رہے تھے۔ قوتِ ارادی کے بل پر چلنے والے منزل تک تو پہنچ جاتے ہیں لیکن ان کی شکلیں اور شخصیتیں انسانوں کی سی نہیں رہتیں۔ نفع مند اور کامیاب لوگوں کی شکلیں بل ڈاگوں کی سی ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں لال چہرہ بھر کم اور بازو مضبوط ہوتے ہیں اور ان کی زبانیں ہر وقت ان کے منہ سے باہر لٹکا کرتی ہیں۔ او میں تھک کر سو جانے والے خرگوش بڑے نزل ہوتے ہیں۔ وہ منزل تک تو نہیں پہنچ سکتے، لیکن ان کی پوسٹیں بڑی نرم، کان بے حد ٹھنڈے اور آنکھیں بڑی شانت ہوتی ہیں۔ وہ ماما تباہ کے ربکا شوہر تے ہیں جنہوں نے خواہش کو مار کر اپنے آپ سے صلح کر لی ہوتی ہے اور ان کے اندر

سینز فائز ہو چکا ہوتا ہے۔

ہمارے درمیان ایک ایسا ساتھی بھی تھا جو آج سے کئی سال پہلے جب نیا نیا آزاد کثیر ریڈیو پر ملازم ہو کر آیا تھا تو نوجوان تھا اور تازہ تازہ کالج سے برآمد ہوا تھا۔ اس کا چہرہ آتے کی طرح سُرخ تھا اور ویسی ہی خوشنور لگتا تھا۔ اس کے بال بنانے اور کپڑے پہننے کا انداز ہم سب سے بڑا تھا۔ وہ ہم سب سے پہلے ریڈیو سٹیشن جایا کرتا تھا اور رات کو سب سے بعد میں ٹونا کرتا تھا۔ پہاڑی سے اُترتے ہوئے وہ ایک خاص قسم کی سیٹی بجایا کرتا جس کا میوزک باغوں اور بہاروں والا سے ملتا جلتا تھا۔ ہم نے ابتدا میں اس سے دوستی کرنے کی کوشش کی اور اس نے ہماری پیش قدمی کا جواب محبت اور خوش خلقی سے دیا بھی اور عین ممکن تھا وہ صرف ہمارے جوگا ہو کر رہ جاتا بھی کہ اچانک اس پر ایک حملہ ہوا۔ اندھیری رات کی لیٹا برف کا شجون گوریلے کا حملہ۔ پہاڑی اوٹ سے ایک عورت گھرے سبز رنگ کا لانگ کوٹ اور جگیا ڈوٹے سر کے گرد لپٹے نور ہوئی اور اس سے چمٹ گئی۔ کچی تازہ بھر بھری برف میں دونوں گرے اور نیچے ٹپک، پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا سکرپٹ لکھ رہا تھا اور باہر شدید برفباری ہو رہی تھی۔ مٹی کی دھبے سے سگریٹ بار بار سلگانی پڑتی تھی اور ماچس ختم ہو گئی تھی۔ میں نے فلیٹین والے کو آواز دی کہ ہاٹ سیٹ چائے اور ایک ماچس بھیجو۔ لڑکا تھا اناڑی چائے کا ٹرے ایک ہاتھ پر اٹھا کر کئیں سے میرے کمرے کو یوں چلا جیسے تار پر لیڈی چلا کرتی ہے۔ پاؤں پھیلا اور گرم گرم چائے دانی برف پر گرمی اور میرے دیکھتے دیکھتے کئی فٹ برف کے اندر دھنس گئی۔ لڑکے نے اس کو نکالنے کی احمقانہ کوشش کی تو ارد گرد سے بھر بھری برف کا ایک ڈھیر وہاں پھسل آیا۔ کئیں والے نے آواز دے کر کہا: رہنے دے اب اس سال چائے دانی کو اور واپس تشریف لے آ۔ اب یہ گرمیوں میں نکلے گی۔ ہمارا ساتھی اور سبز کوٹ والی جب برف پر گرے ہوں گے تو اپنی حدت کی وجہ سے کئی گز اندر دھنس گئے ہوں گے۔ اُس وقت ہم نے نہیں دیکھا صرف مفتی نے دیکھا تھا اور چونکہ وہ ہم سب میں سے دانا اور عمر میں زیادہ تھا اس لیے کئیں کے لونڈے کی طرح اس جوڑے کو برف سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا اور احمقانہ کوشش میں اس نے ہمارے دوست کو اس کے ساتھ اگلی گرمیوں تک کے لیے دفن کر دیا۔

وہ خاتون ہمارے دوست سے کوئی بارہ برس بڑی تھی۔ لمبا قد خوبصورت چہرہ بڑی بڑی

ہنکھیں دُسر ابدن اور پختہ ارادہ۔ ہمارا غزال رعناس شیرنی کے ساتھ کلیلیں بھرے کا عادی ہو گیا تھا اور اس کے بچوں پر اپنی متوتختی رگز رگز کر لب لعلیں میں رنگ بھرتا رہتا تھا۔ یہ بات شیش پر اتنی عام ہوئی کہ پاٹ صاف کرنے والے بعد ابھی ہر وقت مزے سے اتنی کا تذکرہ کیا کرتے اور ہم کو غسل خانوں میں جاتے ہوئے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔

ایک شام مشوہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: از تالیس اغشاریہ چار میٹر پر ہم آزاد شیر بیڈو سے بول رہے ہیں۔ شام کے ساڑھے سات بجے ہیں، جمیلہ اختر سے ایک لوگ گیت نیٹے پھر اس نے فیڈ کھولا، لیکن کوئی آواز نہیں۔ وہ کنٹرول روم کی طرف بھاگا۔ کوئی نہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جمیلہ اختر موجود ہے۔ اشارہ نہیں آیا۔ ایک منٹ گزر گیا۔ سارے شیش پر پھر قتل پنج گئی، شیش بانی ڈسک فیڈ آن کر دی گئی۔ ہم ادھر ادھر بھاگے کوئی اثر آ رہا ہے سامتی کا معلوم نہ ہو، مفتی پریشان تھا، مسعود خوفزدہ تھا، نمک پڑا تھا اور بیچے سے شیش ڈائریکٹر کے فون پر فون آ رہے تھے۔

جمیلہ چھوٹی پیازمی کے پیچھے نجاست گرا کر آ رہا تھا اور سلور کا گندہ پاٹ، بجا بجا کر گاہا تھا۔
”اوہناں پریتاں دی عمر، ہرچی پانی شیر دی جودہ دایندیاں نی، مفتی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ تو کوہر ہیں؟“

”تو نے ہاتھ کے اشارے سے کہا: ادھر۔“

”دونوں مفتی نے پوچھا۔“

”ہاں جی دونوں۔“

”ان کو بلا کر لاؤ جلدی سے۔“

”مشکل ہے مفتی جی۔“ تو نے ہنس کر کہا: شیرنی نے ہرن کو بچوں میں پکڑا ہوا ہے اور اس کی گردن سے خون چاٹ رہی ہے۔“

پھر یہ معاملات حد سے بڑھ گئے اور اس خاتون کے خاوند اور ہمارے دوست کے درمیان ڈوئیل فائیت کرنے کی نوبت آگئی۔ دونوں نے پہلے اپنی اپنی دلیلوں کی تلواریں نکالیں پھر چمکیوں کے خنجر جیکے۔ پھر چیلنج کے پستول چلے اور آخری فیصلہ ہوا کہ معاملہ خاتون پر چھوڑ دیا جائے اس خاتون نے بڑے مشفقانہ انداز میں اپنی ہرنی کی متوتختی چائی اور اسے کہا کہ پہلے اپنے گھروالوں کو جاکر رضی کرے۔ ہمارا دوست ہوا کے گھوڑے پر سوار گھر پہنچا۔ اپنی والدہ سے تمام قصہ بیان کیا اس کے

سامنے گھٹنے ٹیک کر دامن پھیلایا اور ماتا کی ساری بھیک اس میں ڈالنے پر زور لگانے لگا۔ ماں کا دل پتھے کے لیے محنت سے لبریز ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے محنت یگر کو سینے سے پٹایا اور اس کے ساتھ تل کر روئے لگیں۔ جب دونوں ماں بیٹا آدھی رات تک اپنے آنسوؤں کا خزانہ ختم کر چکے تو ماں نے اپنے دوپٹے سے بیٹے کے چہرے پر سونے ہوئے آنسوؤں کے نشان صاف کیے اور آہستگی سے کہا: میں وعدہ کرتی ہوں کہ تیرا ساتھ دوں گی اور تیری شادی میں شامل ہوں گی۔ بیٹا بیک لفظ کے بغیر بسکیاں بھرتا ہوا ماں کی گود میں سو گیا۔ اگلے دن اس کی ماں نے حسب وعدہ اپنی بھانجی سے اس کا نکاح چھوڑ دیا جو ایف اے کے آخری سال میں تھی۔ ہمارا سامتی اپنی دُہن کو ساتھ لے کر پہاڑ پر واپس آ گیا اور ہم نئے شادی شدہ جوڑے کے لیے مکان تلاش کرنے لگے۔ سب سے اچھا اور سستے کرائے کا مکان جو ملا وہ اس خاتون نے ڈھونڈا تھا جو سبز رنگ کا کوٹ پہنتی تھی اور سر پر جوگیا رنگ کا دوپٹہ لپیٹی تھی۔

مرد کا کام عورت کو سمجھنا نہیں اُس کو محسوس کرنا اُس کی حفاظت کرنا اور اُس سے محبت کرنا ہے۔ عورت کو اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ مرد اُس کو سمجھنے لگا ہے یا اُس کے جذبات کو جانچنے کا راز پانگیا ہے تو وہ فوراً تڑپ کر جان دے دے گی۔ آپ عورت کے ساتھ کتنی بھی عقل و دانش کی بات کریں۔ کیسے بھی دلائل کیوں نہ دیں۔ اگر اس کی مرضی نہیں ہے وہ تو اس منطق کو کبھی نہیں سمجھے گی۔ اس کے ذہن کے اندر اپنی منطق کا ایک ڈرائنگ روم ہوتا ہے جسے اس نے اپنی مرضی سے سجایا ہوتا ہے وہ اسے روشن کرنے کے لیے باہر کی روشنی کی محتاج نہیں ہوتی اسی لیے وہ کسی عقل و دانش اور دلائل کے معاملے میں مانگنے کی روشنی پر ایمان نہیں رکھتی۔ اس نے جو فیصلہ کر لیا ہوتا ہے وہی اس مسئلے کا واحد آخری حل ہوتا ہے۔

ایک بڑے سے پتھر پر پاؤں رکھ کر تسمہ باندھتے ہوئے ہمارے اس دوست نے مڑ کر دیکھا اور کہا: دوستو اگلے مہینے ایک ایک ہفتہ اپنی مصروفیات سے نکال کر رکنا تمہارے بھتیجے کی شادی ہے۔“

”شادی؟ میں نے حیرانی سے پوچھا: اتنا بڑا ہو گیا؟“

”وہ زور سے ہنسا اور پیچھے کو لپک گیا۔“

”سُنئے ہر مفتی جی۔“ اس نے سر ہلا کر کہا: شاہ جی ابھی تک اپنے آپ کو جوان سمجھ رہے ہیں۔“

میں کچھ کھینا سا ہو گیا اور بات ٹالنے کی غرض سے بولا: کہاں ہو رہی ہے شادی؟
 ”آپ کے لاہور میں۔ گلبرگ تھری کے کنائے ماڈل ٹاؤن کی طرف۔“
 ”کون لوگ ہیں؟ میں نے پوچھا۔“

”اس سالے کو کیا پتہ ہے کون لوگ ہیں؟ مسعود نے خوٹیا کر کہا: اس نے لڑائی تلاش کر کے دی ہے ہرے کوٹ والی نے۔“

”اس کے ساتھ اب بھی مراسم ہیں؟ میں نے پوچھا۔“

”نہیں شاہ جی۔ ہمارے دوست نے سکون کی ایک ٹنڈی سانس بھر کر کہا: وہ تو بکا سیر فائر ہو چکا!“

پھر کافی دیر تک خاموشی رہی۔ اندر اور باہر چین ہی چین لگھا ملا۔ راستے کے ارد گرد پھولوں کی بہتات ہو گئی تھی۔ یہ پھول سیپ کے پن کی طرح چھوٹے اور شکل و صورت سے لوہنگ کے قریب تھے۔ کوئی نیلا تھا، کوئی گلابی، کوئی سفید، کوئی اودا، ہمیں ایک پن چکی والے نے بتایا تھا کہ اوپر تم کو چھوٹے چھوٹے پھول ملیں گے انہیں توڑنا ست وہ شہزادی بدیع الجہاں کا بارنگھار ہیں۔ اگر ان میں سے دو پھول بھی کم ہو جائیں تو اس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ سنگھار کے معاملے میں عورت کو پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اگر اس کے پاس کوئی چیز کم ہو جائے تو وہ زندہ تو رہتی ہے لیکن چھٹی چھٹی ڈیڑھی بھٹی سی جیسے اپنا بچ آدمی محبت اور خوش اخلاقی سے ملتا ہے لیکن اس کی خوش اخلاقی کے اندر خوف اور شرمندگی کا تو نہ بچ رہا ہوتا ہے اور وہ نہ مسکرانے والی بات پر بھی مسکاتا رہتا ہے عمر نے پیچھے مڑ کر دیکھا، گردن گھمائی اور پھر ایک زور کی ہانک لگا کر کہا: ”اے یہ اعلیٰ کدھر مر گیا؟ ہم سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک بڑے سے پتھر پر اعلیٰ مرا ہوا بیٹھا تھا اور اس کی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں سفیدی ہو گئی تھیں۔ مسعود نے کہا: اٹھو یا اس طرح بیٹھنے لگے تو یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو گا۔“

”میں نے راستہ ختم کر دیا۔“ اعلیٰ نے منہ ہماری طرف کر کے جواب دیا: اب میں خلوت کے ساتھ بیٹھا ہوں اور میرا اس کی کمپنی سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”تیری خلوت کی ایسی تھی۔“ عمر جھڑک کر بولا: اس کو ساتھ لانا تھا تو ہمارے ساتھ کیوں آئے تھے؟

”جد ہو گئی۔“ اعلیٰ نے آنکھیں بند کر کے چہرہ آسمان کی طرف اٹھالیا اور کہنے لگا: کمال کے تانہ سالار ہو۔ ہمارے ساتھ ہمارے حرم کو آنے سے روکتے ہو۔ اس کا کچھ بار تم لوگوں پر نہیں ہے ہم اس کا خیمہ لگاتے ہیں اس کی پاسبانی خود کرتے ہیں سارے مصارف خود برداشت کرتے ہیں۔ پھر تم ہم کو اس کی محبت سے جدا کیوں کرتے ہو؟

”یہ کس کی محبت کا ذکر ہو رہا ہے؟“ مفتی نے اپنے کو ہستائی کو روک کر پوچھا۔

”کچھ نہیں یا مفتی جی محبت کا ذکر ہو رہا ہے اور بھائی لوگ ناراض ہوتے ہیں۔“ اعلیٰ کی آنکھیں ویسے ہی بند تھیں۔

”چلو چلو لیڈر بولا۔“ چلو دفع کو اس کو مرنے دو ختم ہونے دو ویرانی میں گناہی میں مرجائے گا تو کوئی اس کو پوچھنے بھی نہیں آئے گا۔ چلو میرے شیر و شاباش۔“

”مفتی نے کہا: اور اگر تمہارے دل میں یہ خیال آئے کہ میرے مرجانے کے بعد کیا ہو گا تو سوچو کہ تم سے پہلے جو مر گئے ان کے چلے جانے کے بعد کیا ہوا؟“

”واہ مفتی واہ۔“ مسعود نے سر ہل کر کہا اور اس کا سر لوہست کے ڈوڈے کی طرح دیر تک ہلاتا رہا۔

”یہ فقرہ مفتی جی کا نہیں۔“ عماد آہستگی سے بولا۔ ذوالنون مصری کا ہے کیوں جی؟

لیکن مفتی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور میں اپنی موت کے غم میں ڈو کہے اس قدر بھر گیا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ یعنی مرنے کے بعد کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ریڈیو سٹیشن لاہور کا نیار ریڈیو سٹیشن اسی طرح چلتا رہے گا اور اس کی پہلی دوسری اور تیسری تلاش کی ابتدا اخلاق احمد دہلوی عزیز الرحمن اور سرین محمود اسی طرح کرتے رہیں گے۔ اپنے انی فغوس انداز میں اسی خاص لمبے میں وہی کپڑے پہنے ہوئے۔ کتنے ظلم کی بات ہے وہ ریڈیو سٹیشن کی ریڈیو میں پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے نہیں لگ جائیں گے اور میری کمی محسوس نہیں کریں گے۔ ضرور کریں گے میرے دل نے کہا اور مجھے تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ باہر کے لوگوں کے باسے میں تو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، لیکن لاہور کے لوگ اس کی کو ضرور محسوس کریں گے شدت سے کریں گے اور پھر دیر تک کرتے رہیں گے۔ شاید کئی سالوں تک بہت ممکن ہے ساری عمر۔

آخر میرا مرنے کا وقت ہو جانا اور اس جہاں سے چلے جانا کوئی معمولی بات تھوڑی سی ہوگی۔ ایک عام ادیب اور فن کار مرنے کا وقت ہے تو ایک ستانا سا چھاجاتا ہے۔ میں تو پھر کئی حلقوں کا محبوب ہوں۔ قارئین کا محبوب، سامعین کا محبوب، ناظرین کا محبوب۔ یہ سب لوگ میرے بغیر کس طرح سے زندہ رہ سکیں گے اور راتوں کو سونے سے پہلے آہیں بھرے بغیر اپنے اپنے بستر حجاز کو اور اپنے تئیکے سیدھے کر کے آرام سے کیسے سو جایا کریں گے بھلا؟

پھر مجھے آہستہ آہستہ اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ مجھے یاد بھی نہ رہا کہ میں چل رہا ہوں یا کھڑا ہوں بیٹھا ہوں یا پتھر سے ٹیک لگا کر سوچ رہا ہوں گھر میں ہوں یا راستے پر ہوں۔ سفر ہے یا حضر ہے۔ وجود منٹ گیا اور اہمیت کا بٹن ایسا دورہ گیا۔ بہت بڑا بٹن تاجہ رنگ اور پیتل کی دھات کا ٹرکب، براسو سے چمکا ہوا، دھوپ میں چمکتا ہوا۔ برگد کے کئی سو سالہ پیڑ کے نیچے جرنیلی بڑک سے میل سو میل دُور درختوں کے ایک وسیع جھنڈ کے پاس۔

ابھی مجھے اس جہاں سے گزے دو گھنٹے بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ خبر سب سے پہلے ریڈیو سٹیشن پہنچے گی۔ شام کا وقت ہوگا اور سٹیشن کے اندر اور باہر بڑی خاموشی ہوگی۔ پروگرام سٹاف کے لوگ جا چکے ہوں گے۔ ٹرانسمیشن ڈیوٹی کا سٹاف سٹوڈیو کی طرف مصروف عمل ہوگا۔ چودھری بشیر کسی ضروری کام سے دفتر آئے ہوں گے یا نہیں آئے ہوں گے، لیکن اکرم بٹ اپنے کمرے میں موجود ہوگا اور اس کے لیے یہ خبر کافی تکلیف دہ ہوگی۔ وہ اپنے ان تمام دوستوں کو فون کرے گا اور ہر ایک سے ایک ہی بات کہے گا کہ ”ناہ ہے اشفاق صاحب ہمارے ساتھ کیا نظم کر گئے۔“ اور پھر اس کے بعد اسے وہ دن ایک ایک کر کے یاد آتے جائیں گے جب ہم پُرانے سٹیشن پر گیلے راج کینٹن میں سٹوڈیو میں اپنے اپنے کمروں میں برآمدوں میں لان پر ڈی سی پی کے اندر ریہرسل سے پہلے اور ریہرسل کے بعد بیٹھا کرتے تھے، ملا کرتے تھے، بولا کرتے تھے اور محبتیں کیا کرتے تھے اور ہمارے اندر کمال محبت کے باوجود دُوری کا احساس رہا کرتا تھا۔

پھر ڈیوٹی روم میں راولپنڈی سے مسعود کا فون آئے گا اور چننا اسی بھاگا بھاگا اکرم بٹ کو بلا کر لے جائے گا اور ان دونوں کے درمیان بڑی درد بھری باتیں ہوں گی۔ مسعود چونکہ مجھے پہلے سے جانتا ہے اور ہماری دوستی کے سالوں کا وقفہ طویل ہے اس لیے ایک سینئر کی حیثیت سے

وہ اکرم بٹ پر حاوی ہے۔ گلا وہ مری اور آواز کو شیر اور راولپنڈی کے قیام کی باتیں زیادہ کرے گا اور اکرم بٹ اس کا ماتحت ہونے کی حیثیت سے اور دوسرے اس کے مقابلے میں مجھے کم مدت کے لیے جاننے کی وجہ سے دبا دبا سا رہے گا اور بس جی مسعود صاحب بس جی... حد کر گئے خان صاحب... مگر توڑ گئے وغیرہ ہی کہتا رہے گا۔ پھر ان دونوں کے درمیان شام سو آٹھ بجے خصوصی پروگرام کی بات ہوگی اور اکرم کہے گا تین نے بند و بست کرنا شروع کر دیا ہے گاڑی ابھی آتی ہے اور میں لوگوں کو جمع کرتا ہوں۔ کتنا وقت رکھیں؟ پندرہ منٹ کافی ہیں یا مسعود کہے گا۔

”ناں جی پندرہ منٹ تو کچھ بھی نہیں مسعود صاحب خان صاحب ادیب بھی تھے بڑا ڈکاسٹر بھی تھے، سرکاری ملازم بھی تھے پیارے دوست بھی تھے، پندرہ منٹ تو بہت کم ہیں۔“ تو پھر سوچ لو ہم تو یہاں پندرہ منٹ کا پروگرام ہی کر رہے ہیں۔ تین منٹ کا چمک شہاب صاحب کا ہے، وہ ہم نے ریکارڈ کر لیا ہے۔ ساڑھے آٹھ منٹ کی تقریر مفتی صاحب کی ہے۔ بڑے انوکھے انداز میں اپنے غم کا اظہار کیا ہے انہوں نے۔ تین ساڑھے تین منٹ میرے ہیں۔ باقی وقت عمر اور کلیم نے لیا ہے۔“

کلیم کون جی؟

۱۰ ادیار عطا حسین کلیم، اس کے ساتھ بھی بڑے تعلقات تھے اشفاق کے۔
”ہم تو پھر آدھ گھنٹہ ملیں گے مسعود صاحب۔ لاہور سٹیشن کا بڑا ستون تھا ملحقین شاہ اس کے لیے تو آدھ گھنٹہ بھی ناکافی ہے۔“

”ٹھیک ہے دیکھ لو۔ زید اے سجاری سے زیادہ ٹائم نہ مل جائے، ورنہ اعتراض ہوگا ڈکاسٹر کی ٹھیک نہیں ہوتی۔“

”وہ تو سب جانتا ہوں مسعود صاحب، لیکن ہمارا بھی تو دل ہے۔ یہاں لوگ ان کی عزت ہی نہیں کرتے تھے ان سے محبت بھی کرتے تھے۔“

”کیا کہنے یاد اس کے، اب ایسے لوگ نہیں ملیں گے۔ نظامی صاحب گئے، محمد حسین چلا گیا، اب یہ بھی دھوکا دے گیا۔ ویسے یاد اکرم بٹ ہمارے ساتھ کے لوگ جا رہے ہیں، ایک، ایک کر کے۔“

ہاں سرب اندر گھنٹی سی بجنے لگی ہے اور دوسری بات یہ ہے... مسعود صاحب کہ...

۱۰۔ اچھا میں بھول نہ جاؤں متلے پاس اس کی آواز کا کوئی ٹیپ تو ہو گا؟

۱۱۔ لعنت ہو جی مسعود صاحب ان نئے نئے پردہ ڈیوسروں پر سائے ٹیپ اسی پر کر دیتے

ہیں۔ ان لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ کوئی چیز کس وقت کے لیے سنبھال کر رکھنی ہے۔ میرے پاس ایک ذاتی ٹیپ ہے جس میں اشفاق صاحب کی آواز محفوظ ہے۔ کوئی دسکشن تھی۔ ہماری ثقافت قسم کی۔ اس میں کافی بولے ہیں اور اچھا چمک ہے۔

”تو پھر کم کبھی لائونز پر ریکارڈ کرو؟“

”آپ ٹرانس کرپشن سے لیں مسعود صاحب ان کے پاس خان صاحب کا دو گھنٹے کا

پروگرام محفوظ ہے۔ ایک افانڈر پڑھا ہے انہوں نے اپنی آوازیں۔ اور میری اپلیکیشن کو ایسے نہیں پھینک دینا مسعود صاحب میں نے ایک کاپی ڈائریکٹ اسی لیے آپ کے نام بھیجی ہے۔

”وہ بھی ہو جائے گا میاں یہ کوئی وقت ہے تم بس ایک پروگرام کر دو اچھا سائیڈ کارڈ

ہماریا دیتا تھا اس کے لیے اتنا بھی نہ کر سکے تو پھر لعنت ہے ہم پر۔“

”آپ بے فکر رہیں جی ایک مرتبہ تو لوگوں کے آنسو نکل آئیں گے۔“

”شاباش لاہور شیش کی روایت قائم رہنی چاہیے... اچھا بھئی۔“

”ایک منٹ سر۔ مسعود صاحب... ہیلو... ہیلو... ہاں جی... نیوز میں اشفاق

صاحب کی خبر آ رہی ہے یا نہیں۔“

”آ رہی ہے، آئی کیوں نہیں تھی۔ یہ اس کا حق ہے نیشنل نیوز بٹن میں آئے گی۔“

جی ایم اثر اس کا یاد ہے۔ اس نے بڑی اچھی سٹوری بنائی ہے، بہت رو رہا تھا بیچارہ۔“

خان صاحب تو اس کے شاگرد بھی رہے ہیں شاید۔“

”شاگرد کیا وہ بھی ٹھیک ہے، لیکن بڑے گھرے دوست تھے۔ تبی نہایت قریب۔“

اچھا بھئی۔“

۱۰۔ اچھا نرندا حافظ۔“

پھر کرم بٹ کو ریاض محمود کو ظہیر صدیقی کو اور تقدیر ملک کو پروگرام تیار کرنے کی بھوسٹی

پڑے گی۔ جب وقت کم ہو اور پروگرام زیادہ فینڈ کرنا ہو تو ہمیشہ مشکل پڑ جائیگا کرتی ہے میں جانتا ہوں وہ کافی پریشان ہوں گے اور لوگوں کی بے وقت موت پر ہم اسی طرح پریشان ہو کر کرتے تھے صوفی تبسم بیچاے سخن آباد سے آجائیں گے فیض صاحب اگر یہاں ہوئے تو وہ بھی چند جملے کہنے کے لیے ضرور آئیں گے۔ ندیم قاسمی چونکہ سخن آباد ہی میں رہتے ہیں اس لیے صوفی صاحب کر لانے والی گاڑی انہیں بھی ساتھ ہی لیتی آئے گی۔ اسے حمید بھی سن آباد رہتا ہے، لیکن جب وہ یہ خبر سنے گا تو دم سے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا اور وہ بھی گفتگو کرنے پر لعنت بھیجتا ہوئے آنے سے انکار کر دے گا اور پھر وہ اور ریحانہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر ان دنوں کو یاد کرنے لگیں گے جب تدریس اور میں پہلی مرتبہ ان کے گھر پرائی میوہ منڈی کے قریب گئے تھے۔ بانو نے ریحانہ سے ان چھوٹی چھوٹی پیالیوں کی بڑی تعریف کی تھی جن میں اسے حمید نے ہمیں کشمیری چائے پلائی تھی اور اسے حمید نے المارمی سے ساری پیالیاں نکال کر انہیں اخباری کاغذوں میں لپیٹ کر بانو تدریس کے حوالے کر دی تھیں اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا بس بس اب بولیں نہ بالکل اور بانو نے بھرائی ہوئی آوازیں شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

آفتاب احمد کو جب ٹیلی فون پر یہ دلدوز خبر ملے گی تو وہ جی بھر کے رونے لگا اور چہرہ بھر روتا ہی رہے گا۔ اس شام ضرور کوئی اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے گھر چھوڑنے جائے گا۔ پتہ نہیں آفتاب کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ بات بے بات رونے لگتا ہے اور اس کی آنکھیں ہر وقت بھری رہتی ہیں۔ پھر میرا گزر جانا تو اس کے لیے قیامت سے کم نہ ہو گا۔ محمد حسین کے فوت ہونے پر اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی اور دوسرے بہت سے لوگوں کی آرزو ہو گی کہ کوئی دی پر جو پروگرام ہو وہ قومی رابطے کے ذریعے دکھایا جائے، لیکن دوسرے لوگوں کو اس میں تامل ہو گا۔ اصل میں وہ اس تامل میں حق بجانب ہوں گے۔ ایک علاقائی ادیب یا علاقائی ٹی وی شخصیت کو دوسروں پر بھٹونا مناسب بھی نہیں۔ اس سے ایک پریسی ڈینٹ قائم ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرے علاقوں کے لوگ تعاضا کریں گے کہ اشفاق نیشنل ہو گیا تھا، اس لیے اس کا پروگرام جائز طور پر قومی رابطے کے ذریعے دکھایا جانا چاہیے۔ دوسرے لوگ جو ان سے اتفاق نہیں

کریں گے اپنی دیل میں شدت اختیار نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ ہمارے یہاں مرے ہوئے آدمی کو شدت سے گنہگار کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ آخر فیصلہ یہ ہو گا کہ نو بجے والی خبروں کی تصویریں جھک میں ذرا سا حقہ اس پروگرام کا بھی دکھادیا جائے جو لاہور ٹی وی نے میری یاد میں کیا تھا۔ یہ فیصلہ ہونے کے بعد بھی میرے حامی باہر لان میں اندر کوری ڈور میں کافی دیر تک یہ کہتے پھریں گے۔ یہ سب اس... حرامی کی شرارت ہے۔ جب وقت پڑتا تھا تو کیا دست بستہ سکرپٹ لینے اور ڈرامہ لکھوانے چلا جایا کرتا تھا اور اب انکار ہی ہو گیا ہے۔

اُردو بورڈ کے ملازمین بھی یہ خبر سُن سکتے ہیں آجائیں گے۔ رہائی کا فیصلہ کا اور سلطان صاحب کا بُرا حال ہو گا۔ شریف دین غم زدہ ہو گا۔ لیکن اس کو فکر ہو گی کہ یہ خبر تمام اخباروں میں نمایاں جگہ پر لگ جائے۔ اس کے پاس چونکہ میری پاسپورٹ ساز کی بہت تصویریں مختلف پوزوں میں ہیں اس لیے وہ دفتر پیش کر اپنی الماری سے مختلف تصویریں کالے گا اور ان کی پشت پر اپنی نختی لکھائی میں اخباروں کے نام لکھے گا۔ اُردو اور انگریزی میں ساتھ ساتھ لکھا جائے گا مضمون بنا کر انہیں نفاست سے ٹائپ کرے گا اور اپنے پتے سے کشالے کر پیسے یہ حافضی کے گھر جائے گا اور پھر وہ دونوں اخباروں کے دفاتروں کے چکر لگائیں گے۔

امجد حسین کو فکر ہو گی کہ یہ خبر جو کھٹے کے اندر چھوٹی تصویر کے ساتھ فرنٹ پیج پر آئے۔ اگر ادریس وہاں ہوا تو وہ زور دے گا کہ نیوز کم از کم دو کالمی ہونی چاہیے۔ فور آرٹسٹ اگر اتفاق سے دفتر میں ہی ہوا تو وہ ادریس کی تائید کرے گا۔ شاہجی نیوز تیار کریں گے۔ بائوڈیٹا شریف الدین اور فضل فراہم کریں گے۔ میٹر کمپوز ہو جائے گا۔ لیکن اسلام آباد سے آؤٹ لکٹ کونسل کی ایک خبر آجانے پر مجبوراً میری خبر کو اخبار کے آخر میں دینا پڑے گا۔ آخری وقت میں میک اپ کے وقت پھر شکل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ قیسری دنیا کی ایک خبر جو بیک پیج پر کیری اور ہوری ہو گی وہ میرے لیے وقت جگہ پر حق شفع کر دے گی اور امجد حسین جھلا کر اور مجبور ہو کر میری خبر کو اندر قیسرے صفحے پر لے جانے پر مجبور ہو جائے گا۔

رات کو جب ریڈیو پر میرے انتقال کی خبر نشر ہو گی تو پتہ کی جنگ سا بیوال موزک کنڈا۔ عہد کے علی اولک وغیرہ کے لوگ کہیں گے۔ لو جی ایہ وہی ختم ہو گیا۔ بڑا سیانا بنداسی کیا تھینا

داروپ بھر یاسی! اور بڑی بڑیاں یہ خبر سُن کر کہیں گی۔ بابا یاقین شاہ فوت ہو گیا تے ہُن ایہ پروگرام کون کرے گا؟

حیدر علی نبردار کہے گا: ہُن اسیں کی دیے۔ ایہ گورنٹ دے کم ایں جدھی مرضی ڈیوٹی لگا دیوے۔

ٹھیک اسے نبردار کہتے چلے سے اسی رہنے ایں۔ اُنچ بڑا سیانا بابا سی! رات کو جب ٹی وی پر خبر نامہ میں یہ خبر نشر ہو گی تو بڑے لوگوں کو صدمہ ہو گا۔ بہت سے ناظرین آرزو مند ہوں گے کہ میرے کسی پُرانے پروگرام کی ایک جھلک دکھائی جائے۔ خاص طور پر نکھار پروگرام کی جس میں مہمان امانت علی ہے اور میزبان میں ہوں۔ ٹیلی ویژن والوں کی اسس کو آبی پر ناظرین اپنے اپنے گھروں میں نکتہ چینی بھی کریں گے لیکن پھر دوسری باتوں میں الجھ جائیں گے۔ کچھ گھروں میں جہاں کھنے کھانے اور ٹی وی پروگراموں میں شرکت کا کام ہوتا ہے میری موت پر افسوس کا اظہار کیا جائے گا کہ وہ ایک اچھا انسان تھا لیکن اچھا انسان نہیں تھا۔ ٹی وی پر نیوز سٹنڈے کے بعد کچھ لوگ گہری سوچ میں ڈوب جائیں گے کہ دیکھیں اب اُردو بورڈ کی ڈائریکٹری کس کو ملتی ہے۔ ان میں سے چند ایک کی بیویاں کہیں گی: سب اٹھت کی بات تو یہ ہے کہ یہ چانس آپ کو ملنا چاہیے۔ آخر آپ نے ساری عمر اُردو کی خدمت کی ہے اور اس زبان سے محبت کی ہے۔

خاوند غنڈی سانس بھر کر کہے گا۔ بیگم آج کل خدمت اور محبت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ سب کا ٹیکس کی بات ہے۔ اب مرحوم کو اُردو سے کہاں محبت تھی اور اس نے کس طرح سے اس زبان کی خدمت کی تھی یہ تو تعلقات کی بات ہے۔

بیوی کہے گی: لیکن ڈیڑے بڑے اچھے لکھتا تھا اور باتیں بھی بڑی مزیدار کرتا تھا۔ بالکل ٹھیک ہے۔ میاں ایمان داری کے ساتھ جواب دے گا: اس کے ہم بھی معترف ہیں لیکن اس کے لیے اُردو بورڈ کی ڈائریکٹری کہاں تک جائز ہے؟ یہ سوال ہے جو معاشرے کے حاکمان وقت سے پوچھا جانا چاہیے۔ یہ سب دھاندلیاں ہیں بیوی اور اس دور میں عجم لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔

پھر بڑی دیر تک بڑے گھروں میں اُردو بورڈ کی ڈائرکٹری کا ذکر ہوتا رہے گا۔ کچھ ایسے لوگوں کے نام یاد کرنے کی کوششیں ہوں گی جن کے براہ راست حقیقہ پر زادہ سے تعلقات ہوں۔ ایک آدمی ٹیلی فون پئی آئی اسے کے دفتر میں ہو گا کہ صبح پہلے جہاز سے اسلام آباد کے لیے سیٹ مل سکتی ہے یا نہیں۔

اس اک نڈاسی خبر سے گھر میں کھلم کھلا۔ اپنی حلقوں میں محتاط تنقید ہو گی۔ ریڈیو سنسنے والے دیہاتی حلقوں میں غم ہو گا۔ دوستوں کے درمیان آئندہ کی فکر ہو گی۔ علمی حلقوں میں پہلے اور مضبوطی ہو گی۔ اُردو بورڈ کے ملازمین کو تشویش ہو گی پھر صبح ہو گی اور دکانیں کھلنے لگیں گی اور لوگ دفاتروں کو جانے لگیں گے اور بچے مدرسوں کے لیے تیار ہوں گے اور عورتیں منہ دھونے لگیں گی۔

شاہ عالمی میں ایک کرکری مرحنٹ اخبار ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھی دکاندار کے پاس جا کر کہے گا: "یار یہ دیکھا تم نے تھیں شاہ مر گیا۔ بیچارہ۔"

مکب: "ساتھی دکاندار بھونچکا ہو کر پوچھے گا۔"

"تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا؟ یہ دیکھو اس کی تصویر۔ ایک مرتبہ آئے نہیں تھے ہماری دکان پر سلور کی چمچی خریدنے وہ اور اس کی بیوی۔"

"وہ اس کی بیوی تھی نیلے سوٹ والی۔"

ہاں وہ بھی ڈرامے لکھتی ہے۔ اس نے نیلے وٹران پر گھوڑے والا ڈرامہ لکھا تھا۔"

"وہ تو اس کا ڈرامہ تھا تھیں شاہ کا اپنا۔ اس کی بیوی کا دوسرا تھا جس میں ایک آدمی خفیہ طور پر دوسری شادی کر لیتا ہے اور پانچ چھ سال تک اس کے بیوی بچوں کو علم ہی نہیں ہوتا۔"

بڑا نظم و انضام! ابھی تو جوان ہی تھا پچاس سال کا بھی نہیں تھا۔"

"پاکستان میں اتنی عمر ہی ہوتی ہے شیخ صاحب! پچاس سال کا آدمی دوسرے کنڈے پر لگ جاتا ہے۔ کوئی قسمت والا ہی دس سال اُپر گزارتا ہے۔"

"پہلے زمانے میں عمریں کافی لمبی ہوتی تھیں۔"

"اس زمانے کی خوراکیں بھی تو دیکھو خالص گھی خالص آٹا، دودھ وہی لسی سادہ غذا شیریں میوے دگ بڑا کرتے تھے کیا مر گیا عورتیں؟"

"ولیت کے لوگ تو اب بھی لال سُرخ ہوتے ہیں۔"

"وہاں بے فکری ہے بھاجی۔ کوئی بے ایمانی نہیں! رشوت نہیں! بک بک نہیں سب کام سرکار کرتی ہے۔ لال سُرخ تو آپ ہی ہونا ہوا۔"

"وہ میم پھر نہیں آئی پُرانے سیٹ خریدنے والی۔"

"کمینی ہے سالی آئی تھی ٹوٹی ہوئی پیالی لے کر کہنے لگی۔ تم نے ٹوٹی ہوئی پیالی رکھ دی پیکنگ میں اس کو تبدیل کرو۔"

"تم نے انکار کر دینا تھا۔"

"کوئی دیسی عورت ہوتی تو میں انکار بھی کر دیتا۔ ہمارے ملک کا سوال تھا میں نے کہا لاڈ میم صاحب پیالی تبدیل کر دیتے ہیں۔ پاکستان کے سارے دکاندار ایسے نہیں ہوتے ہم لوگ دیالے ہیں مہمان نوازیں۔"

"بڑے مہمان تھے بھی سبانی کے لڑکے کی شادی پر کوئی ہزار بارہ سو عورتیں بچے ملا کر۔"

"بلیک کی ہی تو برکت ہے شیخ صاحب! ایک ناواں دوسرے عزت! تیسرے تعلقات! ہم نے بلیک نہ کر کے کیا بنالیا۔"

"کچھ نہیں جی کچھ نہیں! ایسے ہی مرجائیں گے دس دس جوڑتے۔"

اس کے چند گفتگوں بعد دوستوں کے درمیان ٹیلی فون پر باتیں ہوں گی۔ مجھے یاد کیا جائے گا۔ ہر کوئی مجھ سے قریب تر ہونے کا دعویٰ کرے گا اور دوسرے کو خفیف کرے گا کہ باوجود مجھے اچھی طرح سے جاننے کے وہ اتنا نزدیک نہیں تھا۔ تانیش کے بال اور پھول جائیں گے۔ آنکھیں اور غاموش ہو جائیں گی۔ زبان بالکل گنگ ہو گی۔ ریاض محمود اپنا زرعی پروگرام ریکارڈ کرنے کے لیے سٹوڈیو میں موجود ہو گا اور انجینئروں کی خوشامد کر رہا ہو گا۔ تھیں شاہ لکھنے والے کا بیسٹ ہان سیٹ چانے میں سے تین پیالیاں نکال کر۔ کے نوٹس گریٹ پی رہے ہوں گے اور اُردو بورڈ کا علم پریشان ہو گا کہ اگلی تنخواہ کے لیے پلے پلوں پر کون دستخط کرے گا۔ پھر ان میں سے دو تین مل کر اکاؤنٹنٹ کے ساتھ بینک جائیں گے اور وہاں سے فام لیں گے ڈرائنگ اور ڈسبرنگ آفیسر کے فٹ ہو جانے کی صورت میں فٹری کے سیکرٹری کے دستخط کیے جائیں اور تنخواہ نکال جائے پھر اُردو

بورڈ کے ملازمین شریف الدین کو شام کی گاڑی سے اسلام آباد روانہ کریں گے تاکہ وہ ڈاکٹر رحیل کے پاس سے سیمنسنگین چلا سکے اور بینک سے تنخواہ ڈرا کی جاسکے۔ بیچاروں کو کافی تردد کرنا پڑے گا، لیکن شریف الدین کی حکمت عملی سے مشکل راہیں آسان ہو جائیں گی اور ان کو وقت پر تنخواہ ملنے کی اُمید بندھ جائے گی۔ اس اُمید بندھنے کے بعد جب انہیں اطمینان ہو جائے گا تو وہ مجھے یاد کریں گے فضل بنی ربانی، محمد علی سلطان صاحب طاہر اور بابو خاں دل کھول کر مجھے یاد کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن اپنے ساتھیوں کے خوف سے کچھ تعریف نہ کر سکیں گے، کیونکہ ان پر مرحوم ڈائریکٹر کے چٹھہ ہونے کا الزام لگ جائے گا اور سننے آنے والے ڈاکٹر سے ان کی شکایت ہو جائے گی کہ یہ پُراٹے ڈائریکٹر کو دل سے چاہتے تھے۔

حیرانی کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے ادیب اور ذہین فن کار اور شوہن بزنس کے ایک کامیاب آرٹسٹ کی موت کے باوجود لاہور کا سارا کاروبار نارمل طریق پر چلتا رہے گا۔ شاہ عالمی چوک سے لے کر میوہسپتال کے چوک تک اسی طرح پھنسا رہے گا۔ کوچن گھوڑوں کو لادنے اور قریبی کوچن کو پینے لے جانے میں گالیاں دیتے رہیں گے۔ ہسپتال کے اندر مریضوں کو کھانا جاتا رہے گا۔ ٹیلی فون بجتا رہے گا۔ بجلی کا بل آتا رہے گا۔ فقیر سوتا رہے گا۔ چوڑے ناکے مارے جاتے رہیں گے۔ استاد پڑھاتے رہیں گے۔ ریکارڈنگ ہوتی رہے گی۔ قوال گاتے رہیں گے۔ رنڈی ناجیتی ہے گی۔ ڈاکو چلتا رہے گا۔ سوئی گیس نکلتی رہے گی۔ انٹریو ہوتی رہیں گی۔ غریبیں کھسی جاتی رہیں گی۔ سونی میں دھاگہ پڑتا رہے گا۔ قتل ہوتا رہے گا۔ زچہ مسکراتی رہے گی۔ بچہ پیدا ہوتا رہے گا۔

برائے رمتھ روڈ کی دکانوں پر نئے مکان بنانے والی بیگمات دینی نوٹیسوں اور نوٹسوں کے نونے دیکھ رہی ہوں گی۔ ان کے پرسوں میں سو سو کے نوٹ ہوں گے ان کے جسم بڑے بڑے اور سینے مرنے موٹے ہوں گے اور ان کے خاندان اپنے اپنے مرکزوں پر روپے بنا رہے ہوں گے۔ کرشن ٹور کی لڑکی نے ساری رات لگا کر باریک باریک لفظوں کی کشیدہ کاری سے ایک محبت نامہ لکھا ہوگا اور ہسٹری کی کتاب میں رکھ کر برقعہ اوڑھ کر اسے پوسٹ کرنے جا رہی ہوگی۔ شادمان کی لڑکی ٹیلیفون پر اپنے محبوب سے گفتگو کر رہی ہوگی اور آپریٹر درمیان میں مٹن رہا ہوگا۔ موچی کے باہر بڑے گھوڑوں کے نعل لگ رہے ہوں گے اور گھوڑا ہسپتال میں نو عمر بچہ مرنے آتے کیے جا رہے ہوں گے۔

خاندانی منصوبہ بندی کی لڑکیاں تاریک محلوں میں جا کر چھپنے اور بڑبڑافت تقسیم کر رہی ہوں گی اور رجسٹر میں اندراج کر رہی ہوں گی۔ ان میں سے کئی ایک کی پچھلے مہینے کی تنخواہ کا بل بابو نے نہیں بنایا ہوگا اور ان کے چھوٹے بھائی کو سکول سے اٹھا کر خرا دیلے کے پاس بٹھا دیا ہوگا۔ بڈھے عرضی نویس کا پیشاب بند ہوگا اور اس کے پوتے اُسے چار پانی پر ڈال کر ہسپتال لائے ہوں گے۔ خزانچی ڈول کی گتھوں میں سوراخ کر کے دھلگے پر رو رہے ہوں گے۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لیے نہیں لڑکیوں سے پوچھ رہی ہوں گی کہ ان کے لیے کون سی تاریخ ٹھیک رہے گی۔ چتہ کاٹنے والے دُعاے حزب البحر پر داہنے ہاتھ کی انگلیاں کھول کر اوپر کی طرف اٹھا رہے ہوں گے۔ لڈو بنانا ہوا حلائی اٹھ کر سامنے والی نالی پر پیشاب کر رہا ہوگا۔ لبرٹی مارکیٹ میں دو نوجوان ایک لڑکی کے پیچھے گھوم رہے ہوں گے۔ دلہنوں کے جہولے آج ایک اجنبی ممک بھی اٹھ رہی ہوگی۔ بچے لگی میں کیڑی کاڑا کھیل رہے ہوں گے اور قریبی مکان میں ایک ماں اپنے بچے کو پیٹ رہی ہوگی جس کا خاندان ایک اور عورت کے ساتھ جہانگیر کے مقبرے کی سیر کر رہا ہوگا۔ یونیورسٹی میں لڑکیاں کھلے پانچوں کی شلواریں پہن کر لڑکوں سے یونین کی باتوں میں مصروف ہوں گی اور سلیتھ سیکڑی لاٹ صاحب کے دفتر میں اپنی رینا ٹرنٹ کے خوف سے یرقانی ہو رہا ہوگا۔ کچھ جہا بل کے ہاتھ روم میں واش کر رہے ہوں گے کچھ چپس کے غسل خانوں میں نہا رہے ہوں گے کچھ مسجدوں کے ستادوں میں پاک ہو رہے ہوں گے۔ کتنے انوس کا مقام ہے کہ ایک ادیب اور فن کار نے ساری عمر چھوٹی چھوٹی کر کے اپنی شہرت اور نیک نامی کا تالاب بھرا ہوگا اور دن رات ایک کر کے لوگوں کے دلوں میں گھر کیا ہوگا اور اس ایک چھوٹے سے حادثے سے وہ سارے دلوں سے نکل گیا ہوگا۔ ہر یاد سے محو ہو گیا ہوگا۔ اس دل سے بھی جس نے اسے جنم دیا ہوگا۔ اس دل سے بھی جس نے اُسے قمع چھایا ہوگا اور اس دل سے بھی جس نے اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے دلی محبت کی تھی۔

تیسرے چوتھے روز اتوار کے دن حلقہ ارباب ذوق ادبی میں میرے لیے ایک قرار داد تعزیت پاس کی جائے گی۔ عین اسی وقت حلقہ ارباب ذوق سیاسی میں بھی ایک قرار داد تعزیت پیش کی جائے گی۔ سب متفقہ طور پر اسے منظور کریں گے، لیکن اس کے آخری فقرے پر بحث

کا آغاز ہو گا کہ حلقہ اربابِ ذوق کا یہ اجلاس حکومت سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ مرحوم کے لواحقین کے لیے کسی ذیلیے کا بندوبست کیا جائے۔ اس پر حاضرین دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ ایک اس کے حق میں ہو گا کہ یہ فقرہ رہنے دیا جائے کیونکہ مرحوم ایک صاحبِ حیثیت ادیب تھا اور اس کی اپنی ذاتی کوٹھی ماڈل ٹاؤن میں موجود ہے۔ پھر کوٹھی کی تفصیلات بیان کی جائیں گی۔ کچھ اسے دو کمال کی بتائیں گے، کچھ تین کمال کی، کچھ دہائی زبان میں کہیں گے کہ اس کی بیوی پڑھی لکھی خاتون ہے وہ لوگ بھی کر سکتی ہے اور کہنے لکھانے کے فن سے بھی آشنا ہے۔ ریڈیو آنے جانے والے ایک ادیب سامعین کو بتائیں گے کہ بالوکی ذاتی آمدنی ریڈیو وی سے دو ہزار سے کم نہیں۔ میرے ایک دور کے رشتہ دار ادیب اعلان کریں گے کہ وہ ایک مالدار گھرانے کا فرد تھا اور اس کا اپنے باپ کی جاہلادیں بڑا حصہ ہے جو اسے باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ پھر کوٹھی صاحب بتائیں گے کہ دشا کو بورڈ سے گریجویٹ بھی ملے گی۔ سیٹ لائف انشورنس کے ایک ادب ڈائریکٹر کو حلقے کی میٹنگوں میں باقاعدگی سے آتے ہیں بتلائیں گے اس نے اپنے تینوں بچوں کی انشورنس بھی کر رکھی تھی۔ گوان کی رقم بیس بیس ہزار سے زائد نہیں۔ طویل بحث کے بعد اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہو گا کہ آخری فقرہ کاٹ دیا جائے؛ چنانچہ آخری فقرہ کٹ جائے گا۔ پھر پھر پھر آٹھ منٹ کے تین مقالے پڑھے جائیں گے اور آخری مضمون میں بیہ ثابت کیا جائے گا کہیں ماضی پنجابی زبان کا ایک ادیب اور شاعر تھا اور مجھے پنجاب سے اور اس کی ثقافت سے بے انتہا پیار تھا۔

یہ سب کچھ ہوجانے کے بعد دن ہفتوں مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہونے لگیں گے اور میری پہلی برسی آج آئے گی۔ یہ کشور نامہید کے لیے آزمائش کی گھڑی ہو گی کیونکہ ہالی کی ڈیس پیبل سے نمک ہو چکی ہو گی اور میری برسی کے روز آل پاکستان ٹیکنیکل سکولز کے مہنہ طلبہ کا تقریری مقابلہ ہو گا۔ کشور کو پاکستان سندھ میں میری برسی نہ مناسکتے کا دل انوس ہو گا اور وہ رات گئے سبک یوسف کامران کی موجودگی میں کف انوس ملتی ہے گی۔ لوگ اس کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کو ایک ایسٹریٹ بنالیں گے اور وہ لوگ جو عمر بھر مجھے جائز طور پر ناپسند کرتے رہے تھے وہی کشور نامہید کے برخلاف دھڑے میں شامل ہوجائیں گے۔ مجھ سے محبت کی بنا پر انیس کشور کو ذلیل کرنے کی غرض

سے پھر ذوالفقار بٹس کی کوششوں سے گلڈ کے بڑے کمرے میں یہ تقریب منائی جائے گی اور عتیق اللہ شکور ہیتل ریاض محمود غلام قادر سلیم افزا مجھ پر مضمون پڑھیں گے۔

کس قدر دکھ کی بات ہے کہ زمانہ ہم جیسے عظیم لوگوں سے مشورہ کیے بغیر ہم کو بھلا دے گا۔ میں ہوا، پولین ہوا، شہنشاہ جہانگیر ہوا، الفرج رونی ہوا، مادر النہر کے علما ہوئے، مصر کا ناصر ہوا، عبدالرحمن چغتائی ہوا کسی کو بھی ہماری ضرورت نہ رہے گی اور اتنے بڑے خلا پانی میں پھینکے ہوئے پتھر کی طرح بھر جائیں گے۔ ہماری اتنی بڑی قربانیوں کا کہ ہم فوت ہوئے اور فوت ہونا کوئی آسان کام نہیں لوگ یہ صلا دیں گے۔ افسوس مانہ کس قدر بے وفا ہے اور کس درجہ فراموش کار ہے۔
"اے مرنا ہے گدھے میں نے اپنے سینے پر لیڈر کی سونٹی کی روک محسوس کی اور آنکھیں کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"کہہ کر چلے جا رہے تھے؟ اس نے کڑک کر پوچھا۔ اگر میں جھاگ کر سوئی آگے نہ کرتا تو اس کھڈ میں جاگرتے۔"

"میں سوچ رہا تھا میں نے خفیف ہو کر پوچھا۔

"کیا سوچ رہے تھے؟ اس نے پوچھا۔

"زندگی اور زندگی کی خوبصورتیوں کے بارے میں۔"

"اور چلے جا رہے تھے موت کی طرف۔"

مسود نے ایک زوردار قہقہہ مارا اور ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا۔

دما دم رواں ہے یم زندگی ہر اک شے سے سیدار یم زندگی

چمک اس کی بھل میں تاسے میں ہے یہ چاندی میں سونے میں پائے میں ہے

پھر جس کو ہستی نے تمنا مضی کو اٹھایا ہوا تھا، وہ اچانک رک گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہم

میں اس کے ساتھ رک گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اس نے اپنی مجبوری ڈاڑھی کو خجالت کے ساتھ

کہا کر کہا: اب تم نیچے آؤ۔

"یہ سال تو مر جائے گا تمہارے نیچے آکر خانہ اعظمی نے ہنس کر کہا: کوئی اور خدمت بتاؤ۔"

اس نے کوئی اور خدمت نہ بتائی تو مضی بولا: ہم شاید اس کا مطلب نہیں سمجھے یہ کچھ اور

”ناں ناں خان“ مفتی نے کہا: پہلے تم اپنا کام ختم کر لو پھر اٹھانا۔
”کام تو ختم ہو گیا صیب: اس نے منہ کر کہا۔

”نہیں یا ابھی کہاں ختم ہوا ہے“ مفتی نے کہا: ابھی تو آدھا ختم ہوا ہے۔
”بیٹھ بیٹھو“ اس نے خشکیاں لہجے میں کہا: ابھی اور اُدپر جانا ہے۔

مفتی ڈر کے مارے کچھ کسے بغیر پھر اس کی بیٹھ پر سوار ہو گیا اور کوہستانی مزے سے دوڑانی کرتا ہوا آہستہ آہستہ چلنے لگا: مفتی اس کی بیٹھ پر سوار تھا اور اس نے نظر میں اُدپر آسمان کی طرف اٹھا رکھی تھیں۔ اعلیٰ نے کہا: کوئی بات نہیں مفتی جی نگاہیں نیچی کر لو۔ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا: مفتی شرمندہ سا ہو گیا اور کھسیانی منہ پر سر مبلانے لگا۔ کوہستانی دونوں ہاتھوں سے مصروف ایک کھڑی شان پر اس طرح چڑھ رہا تھا جیسے تار پر لیڈی چلا کرتی ہے۔ اس کے کندھوں پر مفتی خوف شرمندگی اور اکتاہٹ کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ اب کوہستانی اُسے نیچے اتار ہی دے تو اچھا ہے۔ کئی مرتبہ اُدپر چڑھا ہوا انسان نیچے اُتر سکنے کے خوف سے اور اُدپر چڑھنے لگتا ہے جو اور اُدپر نہیں چڑھ سکتا وہ سر بلندی کے ساتھ چپک کر وقت گزارنے لگتا ہے اور اس کی ساری عمر اسی دشت میں گزرنے لگتی ہے کہ ابھی اسی وقت ایک جھکڑائے گا اور اسے بلندی کے سینے سے چٹے ہوئے پا کر نوچے گا۔ ہوائیں اُچھالے گا اور پھر گرمی اور اندھیری غاروں میں گرا دے گا۔ سر بلندیوں کے ساتھ چپکے ہوئے لوگ جھکڑوں کے خوف سے راتوں کو بھی نہیں سو سکتے ان کی ساری عمر جاگتے رہنے اور چپکے رہنے میں بسر ہو جاتی ہے۔ پست لوگ جو عام طور پر زمین پر رہتے ہیں اور زمینوں پر چلنے میں جھکڑوں سے بڑے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جب میں چھوٹا تھا اور پست تھا اور زمین پر چلتا تھا، اس وقت میری سب سے بڑی گھڑی بگولوں کے پیچھے جاگتا تھا۔ اپنی جوتی میں پیشاب کر کے اگر بگولے کے اندر پھینکیں تو کھنکھناتے سکوں کی بڑی اُوپنی آواز آتی ہے۔ یہ آواز سننے کے لیے ہم بگولوں کے پیچھے میلوں دُور جاگا کرتے تھے اس وقت ہمیں روپے کی طلب نہ تھی۔ اس کی جھنکار سے لطف اندوز ہونے کی آرزو تھی جس طرح موسیقی کا رسیا لفظوں سے آشنا نہیں ہوتا اُسے اور مُر میں ڈوب رہا ہے۔

چاہتا ہے۔

”اور کیا چاہے گا: مسعود قہقہہ مار کر بولا: اب تم نیچے کا مطلب صاف ہے یہ کون سی فارسی بول رہا ہے۔

”کیا بات ہے خان: عماد نے سنجیدگی سے پوچھا تو خان خاموش رہا۔

مفتی نے کہا: ٹھہرو یا میں نیچے ہی اُتر آ ہوں۔ اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ یہ کیا چاہتا ہے۔ مفتی کوہستانی کی بیٹھ پر سے پھسل کر نیچے کھڑا ہوا تو کوہستانی منہ زور پھڑے کی طرح ترائی کی طرف بھاگ گیا اور پچیس تیس فٹ نیچے اُتر کر جھاڑیوں کی ادٹ میں بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔ ”لو بھنی حد ہو گئی“ اعلیٰ نے کہا: یہ سالام میں سے پہلا آدمی ہے جس کو پیشاب کی حاجت ہوئی۔

”واقعی یا ر: لینڈ غمزہ ہو کر بولا: ہم میں سے کسی نے پیشاب ہی نہیں کیا۔ حد ہو گئی۔“ لیکن مفتی جی تو ہر آدھ گھنٹہ بعد پیشاب کیا کرتے ہیں: عماد نے کہا۔

”آج کچھ یاد ہی نہیں رہا: مفتی نے دماغ پر زور دے کر کہا: آج کا دن تو ایسے ہی گزر گیا۔“ ”جل جل۔ بھاگ بھاگ: لینڈ نے چھڑی گھما کر کہا: ابھی جا اپنی سواری کے پیچھے۔“

”نہ نہ خدا کے لیے۔ یہ تیس فٹ نیچے اُتر گیا تو پھر اسے واپس کون لانے گا۔ ایسے ہی چلنے دو جھیل پر پہنچ کر کرائیں گے۔“

”دیے جھیل ابھی کتنی دُور ہے: میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو سب نے ایک زبان ہو کر نعرہ لگایا ہمزودی دُور است!

کوہستانی پیشاب کر کے واپس لوٹ آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کھلا ہوا آزار بند تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ دوڑانی کر رہا تھا۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے وہ دونوں پاؤں چوڑائی کے رخ کھول کر پیروں پر رکھتا تھا تاکہ نجاست سے محفوظ رہے اور اس کے آزار بند میں کوئی چھینٹا نہ لگے۔ کوہستانی کی شلوار پر بکری کے دودھ کے اور اس کے ٹخنے سے رسنے والے خون کے نشان تھے۔ اس کے پیچھے ہوئے پانچ سے جے اس نے گانٹھ دے رکھی تھی بکری کی تین چاندی انگلیاں چمبی ہوئی تھیں غلاطت اور کنگلی سے شلوار کا رنگ ملگھی ہو رہا تھا۔ گھائی سے اُدپر آکر وہ کڑک مرعی کی طرح مفتی کے

مسعود بڑی دیر سے کوہستانی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں بایاں
 کندھا نیچے ٹھکڑا کر کہا: "مفتی جی یہ امر پرستی کا سلسلہ کب سے شروع ہوا ہو گا؟"
 "یہ پرانا سلسلہ ہے جن جی مفتی نے اپنی نگاہیں آسمان سے ہٹائیں اور انہیں مسعود کے چہرے
 پر مرکوز کر کے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے اس کا رخ تبدیل تو کیا۔"

"میں سمجھا نہیں امر پرستی۔ عماد نے کہا۔ اگر یہ شاعری والا تھتہ ہے تو مجھے اس سے کوئی
 خاص دلچسپی نہیں اور اگر اس سے تمہاری مراد لولہیت سے ہے تو میں مفتی جی کا بیان شوق
 سے سننے کے لیے تیار ہوں۔"

"دیکھا دیکھا، اعظمی نے آنکھیں سچا کر کہا: اس انجینئر کی سوچ ملاحظہ فرمائی آپ نے جس
 سرکٹ میں ٹرانسٹرٹ نہ ہوا اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں بھائی کو؟"

"خدا کے لیے" مسعود نے چڑ کر کہا: تو ہر معاملے میں فقرے بازی نہ کیا کر اعظمی؟"

"تو اور کیا بازی کیا کروں؟ اعظمی تڑپ کر بولا۔ اس پر لیڈر زور سے ہنسا اور ہمیں اپنا
 ساتھی نہ پا کر کھٹ سے پہلو بدل گیا۔"

"تو دھر ملے کس سنہ میں آیا تھا مفتی؟ لیڈر نے پوچھا۔"

"۱۹۳۵ء میں۔"

"۲۵ء میں لیڈر نے حیران ہو کر کہا: اس وقت تو میں بھی سکول میں پڑھتا تھا تو نے مجھے
 دیکھا کیوں نہیں؟"

"مفتی نے کہا: وہاں سینکڑوں طالب علم تھے۔ سال بہ سال اور آ جاتے تھے میں کس کس کو
 یاد رکھتا بھلا؟"

"واہ بھئی واہ! لیڈر ناراض ہو کر بولا: میں تو اپنے سکول کا سب سے خوبصورت لڑکا تھا۔"

"مجھے کوئی کیسے بھول سکتا ہے؟"

"مجھے خوبصورت لڑکوں میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ مفتی نے لاپرواہی سے جواب دیا۔"

"مے بھئی" اعظمی نے سر ہلا کر کہا: یہ جو لیڈر نے کھٹ سے پہلو بدلاتھا اور ہم اسے پہلو

بدلنا سمجھ رہے تھے دراصل موضوع کو اپنی طرف گھیر کے لانا تھا۔"

"تم کو کس نے بتایا کہ تم خوبصورت تھے؟ عماد نے سنجیدگی سے پوچھا۔
 "دھرم سالے کے انگریز ایس بی نے۔ لیڈر نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔
 "کیا کہا تھا اُس نے؟"

"وہ مجھ پر عاشق ہو گیا تھا۔"

"لیکن تمہیں کس طرح معلوم ہوا؟"

"اس نے مجھ کو اپنی کوٹھی میں آنے کا اشارہ کیا تھا۔"

"شاید وہ تم سے برآمد سے میں ٹاکی مروانا چاہتا ہو؟"

"بالکل نہیں۔ اس نے مجھے آنکھ بھی ماری تھی۔"

"انگریز لوگ تو آنکھ مارنے کے یونہی عادی ہوتے تھے۔ ان کا آنکھ مارنا دیسی آنکھ مارنا تو نہیں تھا۔
 "وہ ہمارے سکول بھی آیا کرتا تھا؟"

"انگریز کے زمانے میں کوئی بھی گوراکسی وقت بھی سکول کا معائنہ کر سکتا تھا۔"

"وہ سکول کے اندر تھوڑی آتا تھا لیڈر نے چڑ کر کہا: "وہ تو چھٹی کے وقت گیٹ پر کھڑا ہوتا تھا۔"

"لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ تمہارے لیے گیٹ پر کھڑا ہوتا تھا؟"

"وہ اس لیے کہ جب میں سکول سے نکلتا تو ہولے ہولے میرے پیچھے چلنے لگتا۔"

"شاید وہ کسی تفتیش کے سلسلے میں وہاں آتا ہو اور اس کا تم پر شک ہو؟"

"مجھ پر کیا شک ہو سکتا تھا بھلا۔ میں تو اس وقت ساتویں میں پڑھتا تھا۔"

"تم نے خود ہی تو بتایا تھا کہ تمہارے والد مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر تھے۔"

"مسلم لیگ کا ایس پی سے کیا تعلق؟"

"واہ۔ اُس زمانے میں ہر سیاسی آدمی اور اس کے بچے پراگریز افسر کا شک ہوتا تھا۔"

"نہیں نہیں جو موت! لیڈر نے جھلا کر کہا: وہ مجھ پر عاشق تھا۔"

"ادھر، لیکن کچھ تیرہ بھی چلے کہ اس کے عشق کا طریقہ واردات کیا تھا؟"

"بس بس۔ اعظمی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا: زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔"

"میں ہر حال میں لیڈر کے حال پر نگاہ رکھتی ہے اس کے ماضی پر نہیں۔"

مفتی نے بڑے شریفانہ انداز میں کہا: یاد تو ملے گا لیڈر کو انٹروگسٹ کر رہے ہو جب اس نے کہہ دیا ہے کہ انگریز اس پر عاشق تھا تو تم تسلیم کیوں نہیں کر لیتے؟
 ”ہاں ہمارے لیے اس سے بڑا فخر کا مقام اور کون سا ہو سکتا ہے کہ ہمارے لیڈر انگریزوں کے عاشق رہے ہیں۔“ اعظمی نے منہ پکا کر کہہ دیا۔

”دیکھو دیکھو مفتی: مسعود چیتا: یہ اعظمی جان بوجھ کر جمع کا صیغہ استعمال کر رہا ہے۔“
 عماد ابھی تک اس معاملے میں سنجیدہ تھا اور بات کی تہ کو پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے ذرا ٹک کر اپنا چہرہ لیڈر کی طرف پھیرا اور پوچھا: ”اس ڈی ایس پی کا نام کیا تھا؟“
 ”ڈی ایس پی بنیں حرامی ایس پی تھا۔“ لیڈر نے تنک کر کہا۔

”دیکھا دیکھا: اعظمی دکھ بھرے لمبے میں بولا: ”یہ جان بوجھ کر لیڈر کا مرتبہ کم کر رہا ہے۔ یہ اڑانا ایس پی کو ڈی ایس پی بتا کر لیڈر کی بے عزتی کر رہا ہے۔“
 اس پر ہم سب نے یک زبان ہو کر احتجاج کیا تو عماد نے معافی مانگ لی اور خدائی قسم

کھا کر کہا کہ اس کا مقصد لیڈر کی تحقیر کرنا نہیں تھا بلکہ وہ بھول گیا تھا کہ ایس پی تھا یا ڈی ایس پی۔
 مفتی نے کہا: خیر! کوئی بات نہیں۔ ایس پی ہو یا ڈی ایس پی لیکن تھا انگریز اور ایک ویسی نچے کے والدین کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو گا کہ ان کے صاحبزادے پر ایک انگریز عاشق ہے۔

مفتی کی یہ بات سن کر لیڈر کو قدرے سکون ہوا اور وہ سہل و سہرا پر کر کے چلنے لگا۔
 کوہستانی نے ڈھیلہ پر سے پھینک کر ازار بند باندھتے ہوئے کہا: ”یہ انگریز بچا حرامی تھا صیب۔“
 ”اے لو! خان سب سمجھ گیا ہے۔“ اعظمی نے کہا: ”کیوں خان سب کھانا ہاں جو کچھ ہمارے لیڈر کے ساتھ ہوا۔“

”کچھ سمجھا صیب کچھ نہیں سمجھا، لیکن انگریز بچا حرامی تھا۔“
 ”تمہاری اس سے کہاں ملاقات ہوئی؟“ مسعود نے پوچھا۔

”کیس ہی نہیں صیب لیکن وہ بڑا بچا حرامی تھا۔“
 ”لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ عماد نے پوچھا۔

”جیسے میرے والد سے بیابا صیب۔“

”تمہارے والد کو کیسے علم ہوا؟“

”بس ہو گیا صیب۔ علم تو ہو گیا میرے باپ کو سب معلوم تھا۔“

”کیا کرتا تھا تمہارا باپ؟“

”کیا کرے گا صیب۔ کوہستان میں کوئی کام تو ہوتا نہیں۔ پتھر ہی پتھر ہے۔“

”پھر بھی آخر؟“ لیڈر نے حیرت زدہ ہو کر کہا: ”کوئی کام تو کرتا ہو گا۔“

”بس ایسا ہی کام کرتا تھا جیسا ہم کرتا ہے۔“

”تم کیا کرتا ہے؟“

”کچھ نہیں صیب ہم کیا کرے گا۔ ہمارے پاس کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔“

”تم لوگ کھیتی باڑی نہیں کرتے؟“ لیڈر نے پوچھا۔

”کوہستانی نے خشکیوں نگاہوں سے لیڈر کی طرف دیکھا اور پھر چلنے لگا۔“

”عجیب آدمی ہے۔ میری بات کا جواب ہی نہیں۔“ لیڈر شرمندہ ہو کر بولا۔

”آہستہ بات کرو۔“ اعظمی نے کہا: ”اس کے ہاتھ میں ڈھیلہ ہے۔“

وہ تو اس نے کب کا پھینک دیا! مفتی نے اطمینان بھرے لمبے میں جواب دیا اور پھر

کوہستانی کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا: ”کیا عمر ہو گی تمہاری خان؟“

”پتہ نہیں صیب۔ ساڑھ اسی چھ سات سال ہو گی۔“

”شرم کو مفتی! اعظمی نے کہا: ”اپنے سے پانچ سال چھوٹے بچے پر سواری کر رہا ہے۔“

”اُترو۔ اُترو۔ اُترو! ہم سب گیدڑوں کی طرح کورس میں چلانے لگے اور کوہستانی حیران ہو کر

پوچھنے لگا: ”کیا بات ہے صیب ہمارا عمر میں غلطی ہو گیا؟“

”نہیں خان نہیں۔ کوئی غلطی نہیں۔“ مسعود نے کہا: ”تمہاری کوئی غلطی نہیں ہمارا غلطی ہے۔“

”ہم زبردستی تمہاری پیٹھ پر سو رہے، حالانکہ ہم کو تمہارا بوجھ اٹھانا چاہیے۔“

کوہستانی بیچارہ حیران و پریشان راستے میں کھڑا تھا اور مفتی بڑی شرافت کے ساتھ اس کی

پیٹھ سے چسل کر نیچے اُتر رہا تھا مفتی کے اُتر جانے کے بعد لیڈر نے اپنا مریک کوہستانی کی

پیٹھ پر لا دیا اور کہا: یہ اٹھاؤ۔ اس کا بوجھ کم ہے۔

”یعنی اس کی پیٹھ پر کچھ نہ کچھ لا دنا ضرور ہے۔“ اعظمی نے مصنوعی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا اور اپنا کیمرا اس کے کندھے پر لٹکا دیا۔

ہم ابھی دس بارہ قدم ہی اُپر چڑھے ہوں گے کہ مسعود نے بڑی محبت کے ساتھ کہا: ”یار لیڈر! تمہارا ایس پی جوان تھا یا ادھیڑ عمر کا؟“

”جوان ہی تھا۔“ لیڈر نے کہا: ”چالیس پینتالیس کا ہو گا۔“

”پینتالیس برس کا آدمی جوان ہوتا ہے گدھے؟“ عماد نے پوچھا۔

”بھئی وہ انگریز تھا عماد! مفتی جی نے کہا: انگریز تو پینتالیس برس کی عمر میں جوانی چڑھتا ہے۔ وہ تو اس کا پیک پیڑ ہوتا ہے۔“

”نہیں مفتی جی میں نہیں مانتا۔“ مسعود نے کہا: ”انگریز ہو یا دیسی پینتالیس کے بعد اترنے کا سفر شروع کر دیتا ہے۔“

”اس نے پھر انگریز دیکھے ہی نہیں۔“ لیڈر نے فخریہ لہجے میں کہا: ”اس کے گال تو ایسے تھے جیسے پکے ہوئے آڑو۔“

اعظمی جوان سب کی باتیں غور سے سن رہا تھا سر جھٹک کر بولا: ”اس لیڈر کو جو تے مارو سالے کو کیا خوش فہمی سے اپنے صاحب کا ذکر کر رہا ہے، حالانکہ مسعود اس کے ساتھ بڑی صفائی سے ہاتھ کر گیا ہے۔“

”کیا ہاتھ کیا ہے اس نے میرے ساتھ؟“ عمر نے غصے سے پوچھا۔

”مٹا نہیں تم نے۔“ اعظمی نے کہا: ”اس نے ایس پی کو پھر ڈی ایس پی کہا اور جان بوجھ کر کہا۔“

”کیوں مسعود؟“ لیڈر نے ڈانٹ کر پوچھا: ”یہ سچ کہا ہے؟“

”بھئی مجھے یاد نہیں اگر میں نے...“

اعظمی بات کاٹ کر کہا: ”لو ابھی ایک منٹ پہلے کی کسی ہوئی بات یاد نہیں۔ بڑا مکار ہے۔“

بھئی تو خدا کی پناہ کہہ تو اپنے باپ کو حاضر ناظر جان کر کہہ توئے ڈی ایس پی نہیں کہا؟“

”مسعود نے سکر کہا: میں نے جان بوجھ کر نہیں کہا سو امیرے منہ سے ڈی ایس پی نکل گیا ہو تو۔“

اس کی قسم نہیں کھاتا۔

”اور سو اُتیرے منہ سے ایس پی کیوں نہ نکلا؟“ مفتی نے پوچھا۔

”وہ تو اس کے منہ سے کبھی نہیں نکلے گا۔“ اعظمی نے کہا: ”بے عزتی جو مقصود ہے لیڈر کی۔“

اس کو مار لیڈر! اس نے جان بوجھ کر اس کا رتبہ گرایا ہے۔

”اس کا رتبہ کون گرا سکتا ہے؟“ لیڈر نے فخریہ لہجے میں کہا: ”وہ تو آئی جی پولیس ہو کر ریٹائر ہو ا تھا۔“

”آئے ہائے اسے ریٹائر ہوتے بھی دیکھ لیا بوڑھے کو۔“ اعظمی نے شورش چھوڑا۔

”میں نے قہر سے دیکھا۔“ لیڈر نے کہا: ”یہاں آ کر خبر سُنی بھتی پاکستان میں... لیکن وہ بوڑھا کب تھا؟“ اس نے اپنی سوئی زور سے اعظمی کے بازو پر ماری اور ہنس کر پرے ہو گیا۔

عماد نے زور کی ہانپ لگائی اور کہا: ”شاہ جی اب کہاں ہو اس وقت...“

”میں نے کہا: کہیں نہیں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”باہر کے سفر میں تو ہمارے ساتھ ہو شاہ جی! مفتی نے کہا: لیکن اندر کے سفر میں کہاں تک پہنچ گئے ہو؟“

”اندر کے سفر میں۔“ میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا: ”کچھ خاص فوری نہیں اپنے پردوں کے بائے میں سوج رہا تھا۔“

”کس کے بائے میں؟“ اعظمی نے پوچھا۔

”پردوں کے بائے میں۔“ میں نے آہستگی سے جواب دیا: ”جب میں دفتر سے ٹھپٹی لے کر ادھر آ رہا تھا تو میری میز پر تاریخ فیروز شاہی کے پروٹ آرہے تھے۔“

”یہ تاریخ فیروز شاہی کیا چیز ہے؟“ عماد کی تاریخی رگ پھڑکی۔

”میں نے کہا: تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین برنی کی تصنیف ہے اور ہم نے حال ہی میں فارسی سے اس کا ارد ترجمہ کروایا ہے۔ یہ تاریخ بلبن کے عہد حکومت سے جو ۱۲۹۹ء سے شروع ہوتا ہے سلطان فیروز شاہ کے ابتدائی دور تک یعنی ۱۳۵۸ء تک کے زمانے پر محیط ہے۔ گویا یہ بانو سے سال کی مدت ہے جس کے حالات اور واقعات کی ضیاء الدین برنی ایک ہم عصر کی

جینیت سے گواہی دیتا ہے۔

”میں نے تو نہیں دیکھی یہ تاریخ۔ عماد نے سر ہلا کر کہا۔ حالانکہ پُرانی سب تاریخیں میری نظر سے گزر چکی ہیں۔“

”آپ نے غور نہیں فرمایا۔ اعظمی نے کہا۔ شاہ صاحب بتا رہے تھے کہ یہ تاریخ فارسی زبان میں ہے اور فارسی بڑے بڑے حکیموں کے قابو میں نہیں آتی۔ آپ تو پھر سلطنتِ خداو کے ایک خدا داد قسم کے انجینئر ہیں۔“

”لیکن اس وقت اور ایسے خوشگوار موسم میں پردوں کا یاد آنا کوئی صحت مند بات نہیں۔“ مسعود نے کہا۔

”میں نے کہا۔ اصل میں آپ ابھی جو باتیں کر رہے تھے امر پرستی اور ڈی ایس پی وغیرہ کی ان سے میرا خیال ادھر منتقل ہو گیا ہے۔“

”دیکھا دیکھا۔ اعظمی چلایا۔ شاہ صاحب بھی اس کو ڈی ایس پی بتلا رہے ہیں۔“

”ان سب کو بکنے دوا اعظمی۔ لیڈر نے کہا۔ یہ جلتے ہیں۔“

”لیکن میں سمجھا نہیں۔“ مفتی نے اپنا چڑا ہوا دامن جھٹک کر کہا۔ ہماری گفتگو سے تمہارے پردوں کا تعلق کیسے پیدا ہو گیا؟

”میں نے کہا۔“ مفتی جی جب پردت ریڈر کی طرف سے پردت میری میز پر پہنچے تو ان پر جا بجا سُرخ نشان لگے تھے اور سارے صفحے گولوں کا ٹوں اور تیروں سے آٹے ہوئے تھے میں نے پرس کو اس کے تساہل پر سرزنش کی غرض سے ایک نوٹ لکھنا چاہا اور ان پردوں کو بغور دیکھنے لگا۔ تاریخ فیروز شاہی کا یہ باب سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے دورِ حکومت سے تعلق رکھتا تھا۔ ”کیا بات تھی قطب الدین کی۔ لیڈر نے سر ہلا کر کہا۔ یہ اس کی لاٹھ تو اس عظیم سجد کا ایک مینار تھی۔ وہ جو بنانے والا تھا۔ اگر خدا کو منظور ہوتا۔۔۔“

لیکن عماد نے اس کی بات نہ سنی تھی ہی میں کاٹ دی اور چڑ کر بولا۔ ”اوکھ۔ یہ قطب الدین ایک کا ذکر نہیں ہو رہا۔ قطب الدین مبارک شاہ کا ذکر ہے جو علاؤ الدین خلجی کے بعد ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تھا۔“

عماد کی یہ بات سن کر سب خاموش ہو گئے۔ کیونکہ علاؤ الدین خلجی اور اس کے بعد کے دور کی پلٹس منٹ ان کے ذہنوں میں نہ ہو رہی تھی۔

”ہاں جی۔“ عماد نے کہا۔ قطب الدین مبارک شاہ کے دور کی کیا خصوصیت تھی؟

”کچھ نہیں۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔ اس کے بعد کا دور مسلمانانِ ہند کے لیے ایک عبرت کا دور تھا اور یہ وہ وقت تھا کہ اگر تائیدِ غیبی شامل حال نہ ہوتی تو اس وقت برصغیر میں ایک بھی مسلمان نہ ہوتا اور یہ جو پاکستان ہے جو کافران اور اس پہاڑ پر جو ہمارے وجود جھیل کی طرت والے وال ہیں اور جو اذانیں سنائی دیتی ہیں اور جو درود و سلام محبوب پر بھیجا جاتا ہے۔ ان سب کا کوئی وجود نہ ہوتا اور اگر برصغیر میں دیپال پور نہ ہوتا تو نہ یہاں اسلام ہوتا۔ نہ پاکستان ہوتا نہ مسلمان ہوتے۔“

”یہ اپنا دیپال پور منگمری والا؟“ مفتی جی نے پوچھا۔

”ہاں جی۔“ میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ اس قصبے کو حیرتِ جانے یہ برصغیر میں اسلام کی کل کی حیثیت رکھتا ہے جیسے اولیادوں میں قطب الاقطاب ہوتا ہے۔“

”یہ بات کچھ صوفیائے رنگ کی ہو گئی۔“ اعظمی نے کہا۔ تمہارے لیے غور کا مقام ہے مفتی۔“

”مفتی نے کہا۔ بکو اس مت کر اگئے۔“

”میں نے کہا۔ اُس عہد کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت گھومتا رہتا ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں قصرِ ہزار ستون جو سلطان قطب الدین مبارک شاہ کا محل تھا اس کا ایک دربان ہوں۔ میرے ہاتھ میں نیزہ و سر پر خود بازو پر سلطان کا چرمی نشان اور گلے میں اس کی غلامی کا پٹہ ہے۔ میں قصرِ ہزار ستون کے اندر باہر آزادی سے گھوم سکتا ہوں۔ مجھے دارالحکومت دہلی کے کوچہ و بازار کی ایک ایک خبر ہے اور قصرِ ہزار ستون کے اندر ہونے والی بات کا علم ہے۔ میں قصر کے اندر کی عورتوں اور قصر کے باہر کی سازشوں سے بخوبی واقف ہوں۔“

اعظمی نے کئی توراوی نمبر ایک ہوا۔ اب راوی نمبر دو بولے۔

”بس اب بکو اس بند کر۔ سب نے یک زبان ہر کر اعظمی کو ٹوکا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گئے۔“

”ہاں شاہ جی۔“ عماد کا تجسس اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔

”میں نے کہا۔ مجھے ضیاء الدین برنی کے اصل الفاظ تو یاد نہیں لیکن میرے حافظے پر اس کی

عبارت کا ہر پیر اگر اہم مرتبہ ہے اور میں اپنی فوٹو گراف میوری سے متن کی چٹتی ہوئی عبارتیں آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔ یہ باب مجھے کئی ہفتے تک ہانٹ کرتا رہا ہے۔

”اب آگے بھی چلو۔ مسعود نے چڑ کر کہا۔ ہمیں بغیر واقعہ کے ہی ہانٹ کر رہے ہو۔“

میں نے کہا: جب سلطان قطب الدین تخت پر بیٹھا تو ہوا پرستی سے غلوب ہو کر عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا۔ اس نے تخت نشینی کے دن ہی حکم دیا کہ سلطان علاؤ الدین کے زمانے کے تمام قیدیوں کو جن کی تعداد سترہ اٹھارہ ہزار تھی رہا کر دیا جائے۔ اپنی تخت نشینی کے شکرانے کے طور پر اس نے سارے لشکریوں کو چھ ماہ کی تنخواہ انعام کے طریقے پر دی اور ملوک اور اُمرا کی تنخواہیں بڑھا دیں۔ بہت سے علاقے اور زمین جو علاؤ الدین کے زمانے میں شاہی جاگیر میں داخل ہو گئی تھیں قطب الدین نے مالکوں کو واپس کر دیں۔ اب گلیوں اور کوچوں میں گھروں کے اندر اور باہر سونا اور چاندی دکھائی دینے لگے اور لوگوں کو اس خوف اور ہراس سے نجات مل گئی کہ یہ کروادریہ نہ کہو، یہ کروادریہ نہ کھو، یہ کھاؤ اور یہ نہ کھاؤ۔ اس طرح بچو اور اس طرح سے نہ بچو، چنانچہ مختلف تقریبات عیش و عشرت اور شاہد و شراب اور غلام اور لونڈے از سر نو نظر آنے لگے۔ زمانے کا کارڈ بار بدل گیا۔ اکثر لوگوں نے توبہ تو زدی، نیکی اور پارسائی کو خیر باد کہہ دیا۔ عبادات کو خیر باد کہہ دیا۔ عبادات میں کمی آگئی۔ ہر کچے اور ہر بازار میں نئے نئے لونڈے نظر آنے لگے۔ سب خوب رو اور نازک اندام گانے والے دودھ دوسرے سمت کھڑے رہ گئے۔ اس وقت کم عمر غلام خوبصورت خواجہ سرا اور حین کنیز کی قیمت ہزار اور دو ہزار تک پہنچ گئی۔

چونکہ علاؤ الدین غلجی سخت گیر آدمی تھا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر موت کی سزا دے دیا کرتا تھا، اس لیے اس کے عہد میں اونچے اونچے عہدوں والے اور اعلیٰ مرتبوں والے آنکھیں ڈالے پر بھی نہ رڑکتے تھے۔ غریب آرام کی زندگی بسر کرتے تھے اور صاحب حیثیت ہر وقت خوفزدہ رہتے تھے۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ پر علاؤ الدین غلجی کے مزاج کا ایسا ردِ عمل ہوا کہ اس نے ہر شخص کو ہر طرح کی آزادی عطا کر دی۔ اس کی اس چھوٹ کا سب سے پہلا مظاہر اثر تاجروں اور سوداگروں پر ہوا۔ اب وہ اپنا سامان اپنی مرضی کے مطابق فروخت کرنے لگے اور دکانی اور دھوکہ دہی سے لوگوں کو حسبِ مراد لوٹنے لگے۔ رشوت، رُسوخ اور خیانت کے دروازے کھل گئے۔ معصوموں کی کمی کی وجہ سے مزدوروں کی زندگی اچھی گزرنے لگی اور ان کے پاس دولت کے انبار

جمع ہونے شروع ہو گئے۔ وہ ہندو جو کھیتوں سے گری پڑی بالیاں اکٹھی کر کے اپنا پیٹ پالا کرتے تھے کبھی ٹھیک سے کپڑے نہ پہنتے تھے۔ زمین پر سوتے تھے۔ اب باریک کپڑے پہننے لگے اور تیر کمان سجا کر گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ مسلمانوں میں فسق و فجور پیدا ہو گیا اور ہندوؤں میں تقویٰ اور سرکشی کا مادہ پیدا ہونے لگا۔

برنی لکھتا ہے کہ سلطان قطب الدین کو اپنی چار سال اور چار ماہ کی مدت حکومت میں شراب پینے، گانا سننے، عیش و عشرت میں وقت گزارنے اور نفس پرستی کی داد دینے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔ اگر اس زمانے میں مغلوں کا لشکر آجاتا یا ملک کے کسی بڑے حصے میں بغاوت ہوتی یا کوئی اور فتنہ کھڑا ہوتا، تو اس کی غفلت بے خبری عیاشی اور بے پروائی دار الحکومت دہلی میں کیا رنگ لاتی۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اس کے عہد میں نہ مملک قوط پڑا، نہ مغلوں کے حملے کی مصیبت آئی، نہ کوئی آسمانی بلاناہل ہوئی، نہ کوئی بغاوت یا سرکشی یا عظیم فتنہ برپا ہوا۔

اس کے عہد میں گجرات اور دیوگیر میں بغاوت کا ایک شدید طوفان اُٹھا لیکن اس طوفان کے ایک ہی دن میں فرو ہو جانے کی وجہ سے اس میں خود سری اور بے مہری کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔ دیوگیر اور گجرات میں بغاوت کے سرغزوں کی بیخ کنی کے بعد سلطان جب دلی پہنچا تو جو انی حکومت مال اور دولت، باعق گھوڑوں اور ہوا پرستی اور شراب کی مستیوں پر فتن و فحش، ضبط و نظم، استقامت اور امارت، قدیم کی اطاعت و فرمانبرداری نے اس کو مزید بے باک والا پروا ظالم اور جاہل بنا دیا۔ وہ اپنے معتزوں اور قریب رہنے والوں سے فحش کلامی کرتا ان کو گالیاں دیتا اور بھرے دربار میں ان کی تذلیل کرتا۔ اس کے گرد خام طبع نو دلتے، ناتجربہ کار مغزور اور ظالم نوجوان عسکروں اور مشیروں کے روپ میں جمع ہو گئے۔ شرم و حیا اس کی آنکھوں سے جاتی رہی۔ وہ عورتوں کے کپڑے اور زیورات پہن کر جمع میں آجاتا اور لوگوں سے ٹھٹھول کرتا۔ عین الملک ملتان کی وجہ اس کے عہد کا امیر الامرا تھا اور ملک قزلبگ کو جو چودہ عہدے رکھتا تھا مسخری کرتا اور فاحشہ عورتوں سے ان کو گندمی گالیاں دلاتا۔ امرا اور شرفنا کی محفلوں کے لیے اس نے گجرات سے توبہ نامی ایک مسخرے کو بلا رکھا تھا جو بھری محفل میں آکر ملکوں اور دوسرے امیروں کو بیوی اور ماں کی گالیاں دیتا تھا۔ یہ مسخرہ اپنے پیشاب کی جگہ کو آگے کر کے آجاتا اور امرا کے کپڑوں پر پیشاب کر دیتا اور ہوا خارج کرتا۔ بعض اوقات بالکل برہنہ ہو کر مجمع عام میں آجاتا اور فحش کلامی شروع کر دیتا۔“

”قصہ خواں نہ بھی چلے“ اعظمی نے کہا۔ ”تو بھی قصہ ہمارے ساتھ چلتا رہے گا۔ دیکھو ناں قصہ خوانی بازار سارا دن چلتا رہتا ہے حالانکہ کوئی بھی قصہ خواں وہاں موجود نہیں ہوتا“

”لیکن بجائیو“ مسعود نے اپنے مخصوص لمبے میں کہا۔ ”مسافت لمبی ہے اور وقت کم ہے اور میں واپس بھی لوٹنا ہے“

”منا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں“ لیڈر کرکٹ کر بولا۔ ”ابھی تھوڑی دیر رکو۔ پھر میں لیٹ خود ہی نکال لوں گا“

اس لیٹ نکالنے کے خوف سے سب کے چہرے لٹک گئے۔

مسعود پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ عمار نے اپنے لیے ایک پتھر ڈھونڈ لیا۔ اعظمی نے چٹان کے ساتھ ٹیک لگائی۔ مفتی اور اس کی سواری راستے میں چوڑی مار کر بیٹھ گئی۔ لیڈر اور میں کریں جوڑ کر ایک اور پتھر پر بیٹھ گئے اور عمار نے اپنے بوٹ کی ٹو پر پھڑی مارتے ہوئے کہا:

”شاہ جی دیپالپور میں آپ کی زمین تو نہیں؟“

میں نے کہا: ”نہیں“

”تو پھر آپ اس قصبے کی اتنی تعریف کیوں کر رہے ہیں؟“

”میں اس کی تاریخی اہمیت کا ذکر کر رہا ہوں بھائی جی۔ اس وقت کے قصبے کی تعریف نہیں کر رہا“

”یعنی تاریخی اعتبار سے یہ دہلی، سورت، دکن، سامانہ، کھننوتی اور بنگالہ سے بھی اہم ہے؟“

”بات ہوئی ناں“ اعظمی چمک کر بولا۔ ”تاریخی مطالعہ اس کو کہتے ہیں۔ تم سالا لوگ اکیلے دیپالپور کو لیے بیٹھے ہو“

”اصل میں یہ ذات کا خاص سکریٹ رائٹر ہے، اشفاق احمد، مسعود ہنس کر بولا۔ ”اور جان بوجھ کر مقامی قصبوں کو شریف الاصل اور اعلیٰ درجے کے ثقافتی مراکز پر ترجیح دے رہا ہے۔ یہ بڑا متعصب ہے“

”متعصب بھی ہے مفتی بھی“ مفتی نے نگوہ زوں سے کھلتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیپالپور کے باجرے سے چڑیاں اڑانے والی غلیل لے کر ہندوستان کا لشکر فتح کرنا چاہتا ہے“

استنے میں ایک امریکن عورت بریڈر اور سکریٹ پیسے پہاڑی کی ادٹ سے نمودار ہوئی۔ وہ جھیل دیکھ کر واپس آ رہی تھی اور اس نے اپنا پیلا سویٹر کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ جب وہ ہمارے قریب سے گزرتی تو ہم سب گھوم کر اس کی برہنہ کمر دیکھنے لگے۔ ڈھلوان کی وجہ سے اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے تھے اور وہ بریکیں لگا لگا کر چل رہی تھی۔ اس بریک بندی کی وجہ سے اس کی دونوں کھمبوں میں باری باری بھتور بنتے تھے اور باری باری پُر ہو رہے تھے۔

ہم نے دیکھا لیڈر ایک جھاڑی کے قریب سے پیچھے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مسعود نے اُدبھی آواز میں کہا: ”اولیڈر“

تو عمار نے قہقہہ مار کر ہانک لگائی۔ ”اٹے تو بہ نامی مخرے اتنی دُور پیٹاب کر لے کیوں جا رہا ہے؟“

ہم لیڈر کے انتظار میں کچھ دیر وہاں رُکے رہے۔ اعظمی پتھروں کے پیچھے اور چٹانوں کی دراڑوں میں جنگلی پھول تلاش کرتا رہا اور مسعود ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر اپنی رانوں پر ٹکیاں مارتا رہا۔ مسعود جب چلتا ہے تو ایک طرف کو جھولا کھاتا ہے۔ اوائل شباب ہی سے اس کا سینئر آؤٹ ہے اور اس کے مائی ماڈر بڑی خطرناک گھاسیں پڑ گئی ہیں۔ یوں تو اس کی صحت ہم سب سے اچھی ہے۔ اکہرا بدن، کھنچا ہوا چہرہ، مضبوط رگ دریشتے، لیکن ہم سب اندر ہی اندر جانتے ہیں کہ جس دن اس کا مائی راڈ کھل گیا وہ ہمارے درمیان نہیں رہے گا اور پھر ہم کو اگلا سفر اس کے بغیر ہی کرنا ہوگا۔ اسی طرح آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے سارے ساتھی اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گے اور ہمارے بعد صرف راستے اُھر راستوں کے جنگلی پھول رہ جائیں گے۔

جب لیڈر اپنی چھڑی گھاتا ہوا واپس آ گیا تو ہم سب اس کے خوف سے آگے چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس نے اپنا ہاتھ بوا میں بند کر کے کہا: ”ابھی کچھ دیر یہاں قیام کریں گے اور پھر آگے چلیں گے“

”یہ کیوں؟“ مفتی نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا۔

”اس لیے کہ ابھی اس کو اسی کا قصہ ختم نہیں ہوا“

”عمار نے کہا: قصہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا“

”خاموش“ لیڈ نے کڑک کر کہا: ”ہمیں قصہ سننے دو۔ ہاں بھی“

میں نے کہا: ”ہاں بھی کیا؟“

لیڈ نے کہا: ”وہیں سے بیان کر جہاں تم نے یہ قصہ ابھی چھوڑا تھا“

”بھلا کس کا قصہ تھا لیڈر؟“ اٹھلی نے شرارت سے پوچھا تو لیڈر کا چہرہ سخت سے سرخ

ہو گیا۔ اس نے قمر کو دنگا ہوں سے اٹھلی کو دیکھا اور کہا: ”قطب الدین مبارک شاہ کا، غلجی خاندان

کے آخری بادشاہ کا“ اس کے بعد تعلق بادشاہوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ وہی تعلق بادشاہ

تھے جنہوں نے اپنے دور میں ...“

”بس بس بس“ تمنا نے تقریر کاٹ کر کہا: ”ہم تاریخ میں بھی تمہاری لیڈری کے قائل

ہو گئے، لیکن اس وقت ایک دوسرا معاملہ درپیش ہے اس سے فرٹ لینے دو ...“

ہاں شاہ جی:

میں نے ایک تابع فرمان، اصل اور شریف مصاحب کی طرح کنا شروع کیا۔ دوستوں

یوں تو بہت سے بادشاہوں کی زندگیاں فتنے و فحش اور لہو و لعب میں گزریں اور ان کے مظالم

سے لستوں کے درو دیوار خون ناحق سے رنگین ہوتے رہے اور اس کے باوجود ان کے عہد

کی دستوں میں کمی نہ ہوئی اور ان کے ادوار کئی کئی سالوں پر محیط رہے، لیکن مردان درویش

اور قربان الہی کی بے ادبی کرنے والے بادشاہوں کے اوقات ان پر جلد ہی تنگ ہو گئے

اور تاریخ کے اوراق ان پر بڑی تیزی کے ساتھ سمٹ گئے سلطان قطب الدین مبارک شاہ

پر جب فضل ایزدی کے دروازے بند ہوئے تو اُس نے اچانک حضرت نظام الدینؒ کو لیا اور

بڑا بھلا کنا شروع کر دیا۔ وہ اعلانِ نہ ان کی مخالفت کرتا اور دربار سے منسلک مملوک کو منع کرتا

کہ شیخ کی زیارت کے لیے ہرگز نہ جایا کریں۔ بارہامستی کی حالت میں انتہائی بے باکی اور

بے شرمی کے ساتھ کہا کرتا کہ جو بھی نظام الدینؒ کو لیا اور کاسر کاٹ کر ہمارے حضور میں لائے گا

اُس کو سونے کے ہزار تنگے دوں گا اور اُس کا مرتبہ بلند کروں گا۔ ایک مرتبہ کسی بزرگ کے سوئم

پر سلطان قطب الدین کا حضرت نظام الدینؒ کو لیا اور اُس سے آئنا سامنا بھی ہوا، لیکن اُس نے

نہ صرف شیخ کا واجبی احترام کرنے سے استرا کیا بلکہ اُن کے سلام تک کا جواب نہ دیا اور

سب کے سامنے عدم التفاتی کا مظاہرہ کیا۔

خسرو خاں جو سلطان کی ناک کا بال اور اُس کی آنکھ کا تار تھا دراصل ایک مرتد تھا اور ہندو

سے مسلمانوں کے خاتمے اور غلامی خاندان کو تاراج کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ ایک برادرو

پنچ تھا اور اس کا خاندان اور قبیلہ بہت وسیع تھا۔

”برادرو کیا؟“ لیڈ نے پوچھا۔

میں نے کہا: ”مجھے اس قوم اور نسل کے بارے میں پوری تفصیلات دستیاب نہیں ہوئیں

لیکن جہاں تک معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ یہ قوم ساؤتھ انڈیا میں بستی تھی۔ اور کول، دراوڑ

اور بھیلوں سے ذرا اونچے رہتے کی تھی۔ ان کا عام مندروں میں داخلہ ممنوع نہ تھا اور یہ اسلئے

پایہ کے ہندوؤں اور ہندوؤں کے ساتھ واجبی سائیل جول رکھ سکتی تھی۔ کا ماسو ترائیں جنوبی

ہندوستان کے جن لوگوں کا مذکور ہے کہ وہ جنسی اور جسمانی لذت فراہم کرنے میں اپنا ثانی نہیں

شاید وہ اسی قوم برادرو سے تعلق رکھتے تھے۔ گجرات، معبر اور دیوگیر میں شاہی مراعات حاصل

کرنے کے لیے اس قوم کے لوگ بظاہر مسلمان ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے نام بھی تبدیل کر

لیے تھے۔ خسرو خاں کا اپنا نام حسن تھا۔ اس کے ماموں راندھول نے اپنا نام حاتم الدین رکھا ہوا

تھا اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے ظفر خاں نائب گجرات کے قتل کے بعد اُس کو گجرات

کا حاکم بنا دیا تھا۔ ضیاء الدین برٹنی لکھتا ہے کہ خسرو خاں کا یہ ماموں ایک غمیث اور بدکردار برادرو

پنچ تھا جو طاقت کے نشے میں بڑا مزہ زور اور بے حد بے باک ہو گیا تھا اور مسلمانوں کو ملیا میٹ

کرنے کے لیے یہ ولدا زنا مرتد ہو گیا تھا۔

”اُس نے گجرات میں اپنے عزیز دلوں اور رشتہ داروں کو جمع کیا اور گجرات کے سب مشہور

برادروں کو اپنے ساتھ کر کے عکرم بناوت بلند کیا اور فتنہ بپا کر دیا، لیکن امرا نے گجرات قوت و شوکت

اور حشمت و خندم رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کو گرفتار کر کے قید کر لیا اور سلطان قطب الدین کے پاس

بھیج دیا۔ سلطان قطب الدین جو اس کے بھانجے خسرو خاں پر دل و جان سے فریفتہ تھا اور اُس کی

ایک ایک لپک اور ایک ایک منک پر مرمز جاتا تھا راندھول کو حکومتِ غلامی کے خلاف عکرم

بناوت بلند کرنے پر یہ سزا دی کہ اُس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا اور اُس کی رہائی کے احکام صادر

فرمادیے اور اُس کو اپنی درگاہ کا مقرب بنالیا۔ گجرات کے امرا نے جب یہ سنا تو وہ ڈگنے اور سلطان کی طرف سے اُن کے دلوں میں خوف اور نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔

”جُل جُل وقت گزرتا گیا سلطان قطب الدین خسرو خاں کی آتش عشق میں اور دیوانہ ہوتا گیا۔ وہ ہر وقت اُس کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا اور اُس کے ایک ایک نحرے پر جھپم بھڑم جاتا۔ غلوت کے لمحوں میں خسرو خاں اپنے ایک مخالف کا ذکر سلطان سے کر کے یا تو اُسے قتل کروا دیتا یا علاقہ بدر کروا دیتا۔ مخالفین کو اس طرح ختم کرنے کے بعد خسرو خاں اپنی ساری قوت کے ساتھ بنا دت کے کام میں لگ گیا۔ گو اُس نے کچھ علانی سرکاروں کو جو سلطان سے ذاتی رنجش رکھتے تھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ پھر بھی اُس کو اپنے گرد ایک ایسے حصار کی ضرورت تھی جو اُس کی قوم کے سرفروش جانا زوں پر مشتمل ہو، چنانچہ ایک دن اُس نے سلطان سے دست بستہ عرض کی کہ میں خداوند کریم کی حکومت ہی میں بلا بڑھا ہوں اور حضور کے زیر سایہ زندگی گزار رہا ہوں تمام ملوک و امرا کے عزیز و اقارب اور خاندان دلی میں موجود ہیں لیکن میرا کوئی نہیں اگر اجازت ہو تو میں اپنے ماموں کو بہل والی اور گجرات کے علاقوں میں بھیج دوں کہ میرے چند عزیزوں اور رشتہ داروں کو عنایاتِ سلطانی کی اُمید دلا کر یہاں لے آئے۔ اُن کی بستی بسا دی جائے اور میں جب سلطان سے اجازت پاؤں تو کبھی کبھار اُن کو جا کر مل آیا کروں۔ سلطان قطب الدین نے مستی اور شہوت کی حالت میں اُس کو دل و جان سے اس بات کی اجازت دے دی۔ اس ترکیب سے اُس نے مشہور مشہور برادروں کو گجرات سے اپنے پاس بلوایا اور اُن کو روپے، گھوڑے، آلاتِ حرب، جاگیریں اور خلعتیں عطا کرنے لگا اور اُن کی قوت اور شوکت میں اضافہ کرتا رہا۔

”اُن دنوں میں خسرو خاں بنا دت کے سلسلہ وار منصوبے بناتا رہا اور اُس کے برادر رشتہ دار اُن منصوبوں میں برابر کے شریک ہوتے رہے۔ پہلے انہوں نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ جب سلطان شکار کی غرض سے سرساد کے مقام پر جائے تو برادر لوگ اس کے ہم رکاب چلیں اور اُس کی حضور کی کا دم بھرتے جائیں۔ شکار گاہ میں عین اُس وقت جب شکار پر رنڈ ڈالا جائے تو سلطان کو قتل کر دیا جائے، لیکن چند دوسرے باغیوں نے اپنے ساتھیوں کو منع کر دیا کہ اگر ہم نے سلطان

کو شکار گاہ میں قتل کر دیا تو ممکن ہے سارا لشکر فوراً اکٹھا ہو جائے اور ہم میں سے ہر ایک کو شکار کے میدان میں ہی قتل کر دیا جائے۔ پھر ایک غوغا ہوا اور ہمارے خلاف جنگ شروع ہو جائے۔ ایسی حالت میں وہ برادر لوگ کہاں جا سکیں گے جن کو گجرات سے بلایا ہے۔ وہ تو سارے تہ تیغ ہو جائیں گے اور ہماری سازش دھری رو جائے گی؛ چنانچہ یہی طے پایا کہ سلطان کو اُس کے محلِ قہر ہزارستون کی بالائی منزل میں قتل کیا جائے اور اُسی محل میں پناہ لی جائے۔ بلوک کو اُن کے گھروں سے بلایا جائے اگر وہ ہمارا ساتھ دیں تو خوب نہیں تو انہیں بھی وہیں قتل کر دیا جائے۔

سلطان سرساد کی شکار گاہ سے جلدی واپس آگیا اور شہر میں اگر پھر عیش و عشرت میں غرق ہو گیا۔ ایک روز خسرو خاں نے ایسی حالت میں جو اُس کے اور سلطان کے درمیان گزرا کرتی تھی سلطان سے کہا کہ میں ساری رات آپ کے پاس گزار کر صبح کے وقت جاتا ہوں۔ اس وقت محل کے دروازوں میں قفل لگے ہوتے ہیں؛ چنانچہ میرے وہ عزیز جو اپنا وطن چھوڑ کر میری خاطر یہاں آ گئے ہیں نہ تو میرے پاس آ سکتے ہیں اور نہ مجھ سے مل سکتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ قطعی دروازے کی کئی میرے آدمیوں کو دے دی جائے تاکہ جب بھی میرے عزیز و اقارب چاہیں اس دروازے سے محل میں داخل ہو کر میرے پاس پہنچ جائیں۔ سلطان نے جو مستی کی وجہ سے مدہوش اور غافل تھا حکم دے دیا کہ قطعی دروازے کی چابیاں خسرو خاں کے رشتہ داروں کو دے دی جائیں تاکہ وہ جب چاہیں اپنے عزیز سے ملاقات کر لیا کریں اور ان کے درمیان کوئی رشتہ حائل نہ ہو۔

سلطان کے اس حکم کے بعد ہر شب، ایک پہر یا دو پہر رات گزرنے پر تین چار سو ہتھیار بند برادر محل کے قطعی دروازے سے داخل ہوتے اور ادھر ادھر گھومتے رہتے۔ محل کے پہرے داران ہتھیار بند برادر کو قہر ہزارستون میں اس طرح گھومتے پھرتے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئے۔ پھر اُن میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ آج یا کل خسرو خاں بنا دت کر دے گا، لیکن سلطان کی بد مزاجی اور جبروت کے سامنے کھل کر بات کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ تجربہ کار اور دانشمند بڑے بزرگ آپس میں کہتے تھے کہ جس طرح سلطان جلال الدین کو دولت کی ہوس اور روپے کے لالچے اندھا کر دیا تھا اس طرح سلطان قطب الدین کو شہوت کے غلبے اور مستی

اوبے بخیری نے اندھا کر دیا ہے۔ کسی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سلطان قطب الدین سے کہتا کہ خسرو خاں کی بنادوت کا منصوبہ لگے تک پہنچ گیا ہے۔ ان برادوں میں سے جو ہرات، ہتھیار بند، جوکر محل کے اندر آتے ہیں کسی ایک کو پکڑا کر تحقیق کر لے تاکہ وہ خسرو خاں کے ارادوں کا حال تیرے سامنے بیان کر دے۔ محل کے تمام بزرگ خسرو خاں کی بنادوت سے متعلق مشورے سننے تھے اور برادوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور اندر ہی اندر غصہ کھاتے تھے، لیکن سلطان کے بے حمود برتاؤ سے ڈرتے تھے کیونکہ اس میں اپنی جان کا زیاں تھا۔

آخر ایک روز سلطان کے محل کے کلید بردار قاضی ضیاء الدین نے دل کڑا کر سلطان سے صاف صاف اور کھل کر کہہ دیا کہ خسرو خاں کے گھر میں ہر روز رات کے وقت برادو لوگ جمع ہوتے ہیں اور ہتھیاروں سے لیس اور مستعد رہتے ہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ خسرو خاں بنادوت کی فکر میں ہے اور حضور کی جان کے درپے ہے۔ میں چونکہ ایک اعتبار سے سلطان عالی کا اُستاد بھی ہوں کہ میں نے آپ کو خطاطی سکھائی ہے اور پھر میں بادشاہ کے کرم پر اعتماد رکھتا ہوں اس لیے میں جو کچھ سنتا اور دیکھتا ہوں، عرض کر دیتا ہوں۔ اگر خداوند عالم اس معاملے کی تفتیش کریں کہ اس کا تعلق خداوند عالم کی جان سے ہے تو حضور کی حکومت کو کیا نقصان پہنچے گا اور خسرو خاں کی محبت میں کیا کمی آجائے گی۔ اگر تفتیش کے بعد کچھ نہ نکلے اور ہم غلاموں کا وہم غلط ثابت ہو تو خسرو خاں پر سلطان کو ہزار گنا زیادہ اعتماد ہو جانا چاہیے اور اگر تفتیش سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو سلطان کی جان محفوظ رہ جائے گی اور ہمیں اپنی ننگ صلائی پر فخر ہوگا۔

”قاضی ضیاء الدین کلید بردار کی یہ بات سن کر سلطان قطب الدین سخت خفا ہوا اور اس کو بُرا بھلا کنسا شروع کر دیا۔ عین اُسی وقت خسرو خاں بھی وہاں پہنچ گیا اور بد نصیب سلطان نے جو ملحق تک خواہشات نفسانی میں ڈوبا ہوا تھا، قاضی ضیاء الدین کی ایک بات خسرو خاں کو سُنا دی اور قاضی کو ذلیل و دُرا کر کے وہاں سے چلتا کیا۔ ضیاء الدین برتنی لکھتا ہے کہ بدکردار خسرو خاں، مردوں کے نیچے لیٹنے والا اور ناجوان مردوں کی اولاد پر باتیں سن کر رونے اور ٹپسے بہانے لگا اور فرضی آہ و بکا کرنے لگا۔ اُس نے سلطان سے کہا کہ چونکہ خداوند عالم مجھ پر حد درجہ

مہربان ہیں اور دوسرے لوگ اور امراء سے میرا مرتبہ بلند کر دیا ہے اس لیے سب بزرگان مملکت اور مقررین درگا و سلطانی مجھ سے چلنے لگے ہیں اور میری جان کے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ مجھ کو قتل کروا دیں۔ سلطان قطب الدین پر اُس نازک بدن برادو پہنچے کے ناز آمیز گریہ و زاری سے شہوت کا تازہ جنون سوار ہو گیا۔ اُس نے اُس کو بغل میں لے کر بیٹھایا۔ چند لمحوں کے بعد اُس کے لبوں کے لیے اور نیچے گرا لیا اور پھر کیا جو کچھ کیا۔ اس اثنا میں جب کہ جان پر بازی لگا نا آسان ہو جاتا ہے، سلطان نے اُس سے کہا کہ اگر سارا جہان زیر و زبر ہو جائے اور میرے سارے مقررین یک زبان ہو کر تیرے خلاف مجھ سے کہیں تب بھی میں تجھ پر ایسا عاشق اور دیوانہ ہوا ہوں کہ تیرے ایک بال پر اُن سب کو قربان کر دوں گا تو اطمینان رکھ کہ کوئی شخص بھی ہوا، میں تیرے متعلق اُس کی باتوں کو تنکے برابر بھی اہمیت نہیں دوں گا۔

جب ایک چوتھائی شب گزری اور پہلے پہر کا گھنٹہ بج گیا اور غیر نوبتی لوگ و امراء محل سے چلے گئے تو کلید بردار قاضی ضیاء الدین حسب معمول محل کے اندر گشت لگا کر جو کچھ برادوں اور ہر پیر کے نوبی حمودہ داروں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اُس وقت قصر کی بالائی عمارت میں سلطان کے خلوت خانے میں خسرو خاں کا ماموں راندھول جو چند برادوں کے ساتھ چھپا ہوا تھا گشت کرتے ہوئے قاضی ضیاء الدین کے پاس گیا اور بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ اُس کی خدمت میں پان کا ایک بیڑہ پیش کیا۔ جس وقت قاضی، راندھول سے پان کا بیڑہ لینے میں مشغول تھا عین اُسی لمحے ”جاسر یا“ نامی ایک برادو نے قاضی ضیاء الدین کے قریب پہنچ کر ایک تیغ اپنی چادر کے نیچے سے کھینچا اور قاضی پر مارا جس سے وہ ویں ٹھنڈا ہو گیا۔ قاضی ضیاء الدین کے قتل سے قصر ہزارستون میں شور و غوغا پیدا ہو گیا۔

اب ہزارستون برادوں سے بھر گیا تھا اور محل کی زیریں منزل پر قدم قدم پر دست بستہ لڑائی ہو رہی تھی۔ مارنے والوں اور مرنے والوں کی لکاروں اور فغانوں سے ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ جب اس شور و غوغا کی آواز قصر ہزارستون کی بالائی منزل پر پہنچی تو سلطان نے خسرو خاں سے پوچھا کہ یہ کیسا شور ہے جو نیچے ہو رہا ہے۔ اُس نے رخصت نے اپنے آپ کو بادشاہ کے بازوؤں سے نکالا اور باہر جا کر منڈیر سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ عین اُس کی سازش اور اُس

لے بساے ہوئے وسوساں کے مطابق کام ہو رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک وہاں کھڑا اپنے بھائی بندوں اور اپنے قبیلے کے آدمیوں کو چوکیداروں اور پہرہ داروں پر ٹوٹے ہوئے اور انہیں قتل کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ منڈرے سے پلٹ کر وہ واپس سلطان کے خلوت کدے میں آیا اور دنس کر کہنے لگا۔ ”بڑا دلچسپ کمبل ہے۔ خاصہ کے گھوڑے کھل گئے ہیں اور صحن میں بھاگ رہے ہیں۔ اب لکارا در شاہی امپبل کے کارندے اُن کو پکڑنے کے لیے اُن کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور خسرو خاں مچا رہے ہیں۔“ سلطان نے اُس کی یہ بات سُن کر پھر اپنی آغوش واکردی اور خسرو خاں کو اُس میں لپیٹ لیا۔

عین اُسی وقت جاہر یا چند اور برادروں کی معیت میں ہزارستون کی بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ اُنہوں نے خلوت خانے کے محافظین خاص ابراہیم اور اسحاق کو گلہاڑی کے وارے موقع پر ہی ٹھکانے لگا دیا اور نعرے مارنے لگے۔ اُن لوگوں کے غلبے سے سلطان سمجھ گیا کہ بغاوت ہو گئی ہے۔ وہ اٹھ کر صحن کی طرف بھاگنے لگا تو خسرو خاں مفعول نے اُس کو بالوں سے پکڑ کر اس کے جبہ مشکیں کو اپنے ہاتھوں پر لپیٹ لیا۔ سلطان نے اُس کو نیچے گرا لیا اور اُس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا، لیکن اُس عزمزدارے زیرِ شپ نے سلطان کے بال کسی صورت بھی نہ چھوڑے اور نیچے لیٹا لیٹا جاہر یا اور اپنے ماموں راندھول کو آوازیں دینے لگا۔ جاہر یا نے فوراً گلہاڑا سلطان کے سینے پر مارا اور اُس کے بال پکڑ کر اُسے برہنہ خسرو خاں سے جدا کر لیا۔ پھر اُس نے سلطان کو زمین پر گرادیا اور جلدی سے اُس کا سر کاٹ لیا۔

بہت سے لوگ قہر ہزارستون کی زریں اور بالائی منزلوں میں اور اُس کی چھت پر برادروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ محل کی بالائی منزل میں تمام برادروں کو بھر گئے۔ چوکیدار اور محافظ یا تو مارے گئے یا بھاگ گئے۔ برادروں نے چاروں طرف ڈیلوٹ روشن کر دیئے۔ قطب الدین مبارک شاہ کے دھڑ کو بالائی منزل سے نیچے پھینک دیا۔ لوگوں نے اُس کو دیکھا اور پہچان لیا۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ کو قتل کرنے کے بعد خسرو کا ماموں راندھول، جاہر یا اور خسرو خاں بالوں سلطان قطب الدین کے صحن میں گھس گئے اور وہاں شاہزادیوں اور عروں کے ساتھ وہ وہ کچھ کیا جس کے سنانے کی تاب نہیں۔ اب محل کے اندر اور باہر ہر جگہ

برادروں کا غلبہ تھا۔ اُنہوں نے بہت سی مشعلیں اور بڑے بڑے چراغ روشن کیے اور اُسی وقت دربار مرتب کیا۔ اُس آدھی رات کے وقت اُنہوں نے ملک عین الدین ملتان، ملک وحید الدین قریشی، ملک فخر الدین جونا، ملک بہار الدین دیر وغیرہ کو اُن کے گھروں سے طلب کیا۔ یہاں پہنچ کر میں تھوڑی دیر کے لیے رُکا اور لیڈر کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”ملک فخر الدین جونا کا نام یاد رکھنا۔“

”کیوں؟ اُس نے مجھ سے پوچھا۔“

”اس لیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ بھی اہم مقام رکھتا ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ لیڈر نے تنک کر کہا۔ ”ہم نے آج تک اُس کا نام نہیں سنا۔“ دراصل لیڈر کو سلطان قطب الدین کے قتل کا گمراہ رخ تھا اور اُس کے مُنہ سے نازل بات نہ نکلتی تھی۔

عماد نے اپنی تھوڑی چھڑی پر سے اٹھا کر کہا۔ ”یار عمر یہ ملک فخر الدین جونا وہی آدمی ہے جس کو تاریخ محمد تغلق کے نام سے جانتی ہے۔“

”وہی جس نے تانبہ کے سکوں کو سونے کے سکوں کی ضرب سے چلایا تھا؟“ اعلیٰ نے کہا۔

”یعنی کرنسی نوٹوں کا تصور رکھ لیا تھا۔“

”جس نے دتی کے بجائے دکن کو اپنا دار الحکومت بنایا تھا۔“

”جس نے چین پر حملہ کیا تھا۔“

”وہ بادشاہ ہوا۔“

”اچھا چلو چلو۔ آگے چلو۔“ لیڈر نے رکھائی سے کہا۔ پھر کیا جوا؟

میں نے کہا پھر منیا۔ الدین برنی لکھتا ہے کہ جب اُن سرداروں کو آدھی رات کے وقت برادروں کو اُن کے گھروں سے نکال لائے اور قہر ہزارستون کی بالائی منزل میں اپنا دربار منعقد کیا تو اندر اور باہر سب جھٹے مندوؤں اور برادروں سے بھر گئے تھے اور خسرو خاں نے مکمل غلبہ اور قوت حاصل کر لی تھی۔

جب صبح ہوئی اور آفتاب نکل آیا تو خسرو خاں نے ناصر الدین کا لقب اختیار کیا اور قطب الدین مبارک شاہ کے تخت پر رونق افروز ہوا۔ اُس ملعون اور مابول نے تخت پر بیٹھتے

ہی حکم دیا کہ سلطان قطب الدین کے اُن چند غلاموں کو جن کے ساتھ سلطان کو خصوصیت تھی اور جو عظیم املا میں شمار ہوتے تھے گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے چنانچہ اُسی روز اُن میں سے بعض کو تو اُن کے گھروں میں ہی قتل کر دیا گیا اور بعض کو محل میں لا کر اُن کی گردنیں اُٹا دی گئیں۔ ان مسلمان املا کے بال بچوں، بیویوں اور بیٹیوں کو ہندوؤں اور برادوں کو بخش دیا گیا۔ قاضی ضیاء الدین کا گھر مع مال و اسباب اور اہل خانہ کے اُس نے اپنے ماموں راندھول کے حوالے کر دیا اور قطب الدین مبارک شاہ کی کمک کو خسرو خاں نے اپنے گھر میں رکھ لیا۔

تخت نشینی کے پانچ روز کے اندر ہی ان ذلیل اور کینے لوگوں نے محل میں بُت پرستی شروع کر دی۔ جاہریا کو جس نے سلطان قطب الدین کو قتل کیا تھا موتیوں اور جواہرات سے سجا دیا اور اس کا گھر شاہی خانوادہ کی حرموں سے بھر دیا گندی بٹلیوں والے بدلوں اور برادوں نے مسلمان عورتوں اور کینزوں کو اپنے تصرف میں لاسے لگے اور غلام و زیادتی کی آگ کے شعلے آسمان تک پہنچنے لگے ہندو اور برادو لوگ جن کا غلبہ ہو چکا تھا دربار میں قرآن شریف کے نسخوں کو گریبوں کے طور پر استعمال کرتے تھے اور محرابوں میں بُت رکھ کر اُن کی پرستش کرتے تھے اس زیرِ خُشب کے جلوس کے بعد ہندوؤں اور برادوں کے غلبے کی وجہ سے کفر و کافری کا رواج بڑھنے لگا ہندوؤں اور برادوں کو طاقت و درہنہ کے لیے اور ان کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے خسرو خاں بابوں نے حکم دیا کہ غزانے کے دروازے کھول دیئے جائیں اور بے دریغ رو پیہ تقسیم کیا جائے۔

اس بے دین برادو پچھ کو اب لوگ ناصر الدین کہتے تھے۔ مسجدوں میں منبروں پر اُس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور محال میں سکے بھی اُسی کے نام کے تیار کیے جاتے تھے۔ اپنے دُو حکومت میں خسرو خاں اور اُس کے برادو قبیلے کو غلامیوں اور قطبیوں کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہ تھا؛ چنانچہ اس گمراہی اور تباہی کے دور میں جب کہ ہندوؤں کے غلبے سے کھر کا رواج بڑھ گیا تھا اور برادوں کی قوت اور شوکت میں اضافہ ہو رہا تھا ہندو آسمان سے یا تیں کرنے لگے تھے وہ خوشیاں مناتے تھے اور یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ دہلی پھر ہندوؤں کی ہو جائے گی اور ہندوستان سے مسلمانوں کا جنازہ ہمیشہ ہمیش کے لیے نکل جائے گا۔

خسرو خاں کی بادشاہی اور اُس کے ہندو اور برادو جویوں کے غلبے کے دوران دہلی اور

ملکت کے دوسرے علاقوں میں مسلمان تین گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ اُن لوگوں کا تھا، جو حرصِ طمع، ہوسِ زرا اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے خسرو خاں اور اُس کی حکومت کے ساتھ جُڑ گئے تھے۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جو حکومت سے یا ان ذلیل اور کینے متوسلوں سے کوئی وسیع یا انعام وغیرہ تو نہیں لیتے تھے، لیکن تجارت اور معرفت کی وجہ سے اُن کے پاس کافی دولت جمع ہو گئی تھی اور وہ اس دولت سے کسی بھی صورت میں ہٹا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ گودہ دل سے اُن ملعونوں کے ساتھ نہیں تھے، تاہم وہ اُن کے خلاف کوئی بات بھی نہیں کرتے تھے۔ تیسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جو تعداد میں تو بہت کم تھے، لیکن جذبہ اسلامی کے پیش نظر ہر وقت رنجیدہ اور طول رہتے تھے۔ یہ لوگ پانی تک باجی طرح سے نہیں پیتے تھے۔ اُن کو نیند بھی ٹھیک طور پر نہیں آتی تھی اور وہ دنیا کے اس خطہ سے غلامانِ محمد کا وجود مٹ جانے کے خوف سے ہر دم کلبہتے رہتے تھے۔

یہ ایک ایسا عہد تھا کہ جس کی نظیر مسلمانوں نے اُس سے پہلے اور کہیں نہیں دیکھی تھی۔ مسلسل دباؤ اور حالات کی نامساعدت سے مسلمان آہستہ آہستہ مرتد ہو رہے تھے اور جو سختی سے اپنے دین پر قائم تھے اُن کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا گندے بدلوں اور دُور دراز سے یورش کر کے آنے والے ہندو ہتھیار سجا کر بازاروں میں گھومنا کرتے اور مسلمان اُن کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے کوچہ و بازار کی دیواروں کے ساتھ ساتھ لگ کر چلتے اور انہیں وقت بے وقت سلام کرتے رہتے۔ اپنے ہی دین کا تسخّر اڑانے کے لیے انہوں نے خود بہت سے لطیفے گھڑ لیے تھے جو وہ برادوں اور ہندوؤں کی محفلوں میں سُنا کر اُن سے داد حاصل کرتے اور اُن کی بگاڑت پر فخر کرتے۔

اُس ابتلا کے دور میں ملک فخر الدین جو ناکو بہت ہوئی اور اُس کی رگ حمیت حرکت میں آئی۔ ملک فخر الدین جو نے اپنے دلی نعمتوں اور مریموں کا انتقام لینے کی ٹھانی اور اللہ کا نام لے کر خطرے کے سمندر میں کود گیا۔ ملک جو ناکا والد ملک عیاض الدین دیپالپور کا حاکم تھا اور اپنے مالک قطب الدین مبارک شاہ کا وفا شعار خادم تھا۔ پنجاب کا پہلا بادشاہ تھا جو بعد میں شہنشاہ ہندوستان بن کر سریرِ آرائے سلطنت دلی ہوا۔...

میری اس بات پر میرے ساتھی ایک ساتھ لی کر کرکڑائے اور سیف الملوک کے راستے پر سوسے ہوئے ایمل مرغول کی صدائیں ایک ساتھ گونجیں۔

”کچھ عقل کی بات کرو شاہجی“ عماد نے وثوق سے کہا: ”تعلق خاندان کا یہ فرد پنجاب کا رکھو سے ہو گیا۔“

”مارا اس کو؟ مسعود نے خوش ہو کر کہا؟ اس نے پہلا واقعہ بھی ایسا ہی من گھڑت سنایا ہوگا۔“

”غیاث الدین تعلق پنجاب کا کیسے ہو گیا تیرا باپ؟ لیڈر نے کوک کر کہا۔ میں نے کہا: تم سب لوگ اپنی جگہ پر ٹھیک ہو اور شاید مجھ سے زیادہ ٹھیک ہو، لیکن میں ایک انسان کی فائزیشن میں اُس کے دوھیال اور نخیال اور اُس کے ماحول کو برابر کی اہمیت دیتا ہوں۔ غیاث الدین کا باپ سلطان بلبن کا ایک غلام تھا جس نے پنجاب کی ایک جائی سے شادی کی تھی۔“

”کس سے؟“ عماد نے پوچھا۔ ”سامیوال کی ایک جٹی سے۔“ میں نے کہا: غیاث الدین اُس جٹی کے بطن سے پیدا ہوا اور اپنی ماں کے زیر سایہ سامیوال کے علاقے ہی میں پرورش پاتا رہا۔ بعد میں یہی ہونہار اور شیر دل جوان دیپالپور کا حاکم مقرر ہوا جہاں بلبن نے بابا فرید کی خدمت میں اپنی بیٹی کا رشتہ پیش کیا وہاں اُسی خاندان سے کی طرف سے نوجوان غیاث کو دیپالپور کی حکومت بھی عطا کی گئی۔ کسی تاریخ میں اس کی طرف اشارہ ہے؟ عماد نے پوچھا۔

”میں اپنے پلٹے سے نہیں کہتا۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا: لالہ سجان رائے کی۔“

”خلاصۃ التواریخ“ کی بات کر رہا ہوں۔“ اعظمی نے کہا: ناں بھائی۔ مجھے پریشان نہ کرو۔ باوجود اس کے کہ میں پنجاب کی اُس ماں کی عزت کرتا ہوں اور غیاث الدین کی جائی والدہ کو سلام کرتا ہوں۔ پھر بھی تم لوگ اپنا بادشاہ رنجیت سنگھ ہی کو مانو۔ ہندوستان کے طویل القدر شہنشاہوں کی صف میں قدم نہ رکھو۔“

”ممنی نے کہا۔ ESTATE اور LEGACY سسٹم تو بدلتے رہتے ہیں۔ بدلتے رہے

ہیں۔ اصل بات تو ECOLOGY ہے۔ اگر وہ جھاپلا بڑھا پنجاب میں تو بس پنجاب کا ہوا۔“

اس پر سب نے کہا: لو اب ممنی بھی پنجابی شدن ازم کا شکار ہو گیا۔“

ہم سب ہنسنے لگے تو عماد نے کہا: اس بات کا فیصلہ تو کسی بڑھے کھے آدمی سے پھر کبھی کروالیں گے۔ اب تم آگے چلو شاہجی۔“

میں نے کہا: ”بس نماز عصر کا وقت تھا۔ دھوپ میں تمازت تھی۔ ملک فخر الدین جو نا اشد پر بھروسہ کر کے اپنے چند غلاموں کے ساتھ برق رفتار گھوڑوں پر سوار ہوا اور اپنے والد کی ملکیت کی طرف دیپالپور کو چل نکلا۔ مغرب کے وقت خسرو خاں کو اُس کے فرار کی خبر ملی تو اُس نے ایک بھاری جمعیت اُس کے تعاقب میں روانہ کی، لیکن ملک جو نا دنوں کی منزل میں گھنٹوں میں طے کرتا اپنے باپ کی حدود ملکیت میں پہنچ گیا۔ بیٹے کے صحیح سلامت پہنچنے پر غازی ملک غیاث الدین نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ صدقات تقسیم کیے اور بیل شادمانی بچوائے۔“

دوسرے روز جب غازی ملک غیاث الدین کو خبر ملی کہ خسرو خاں کا مرتد بھائی اور اُس کے بخواہ ایک بڑا لشکر لے کر دیپالپور حملہ کرنے آ رہے ہیں تو اُس نے بھی اپنے قیام و فساد ساقیوں اور ملک حلال قبیعین کو ساتھ لے کر اس لشکر سے ٹکرائے کا ارادہ باندھا۔ وہ دیپالپور سے نکل کر قصبہ دیلی سے گزرا اور دیپالپور کے دشمن کے سامنے آ گیا۔ پہلے ہی حملے میں سلطان غیاث الدین نے اُن کا فر نعمتوں کے لشکر کو شکست دے دی خسرو خاں کے مرتد بھائی کا چتر اور دُور باش اور وہ تمام غزانہ اور ہاتھی گھوڑے غیاث الدین کے قبضے میں آ گئے جو خسرو خاں نے ایک جبری لشکر کی معیت میں روانہ کیے تھے۔

اُن لوگوں کی شکست اور غازی ملک کی فتح کا حال سُن کر خسرو خاں اور اُس کے ساتھیوں کا خون خشک ہو گیا۔ برادوں کے دل ٹوٹ گئے اور کافر نعمتوں کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ اس فتح کے بعد غازی ملک ایک ہفتہ تک اُسی میدان میں مقیم رہا اور اپنی فوج کو آراستہ کرتا رہا۔ پھر اُس نے دلی کی طرف کوچ کرنے سے پہلے ملک بہرام ایبہ ملک مغلی عین الملک شہابی ملتانی امیر سیوستان اور ملک یک لکھی امیر سامانہ کو ملک کے لیے خط لکھے اور انہیں دین برحق اور اسلام کا واسطہ دے کر کہا کہ وہ اس آڑے وقت میں اُس کی مدد کریں۔ اُن میں سے ملک بہرام ایبہ غازی

ملک کا خط ملتے ہی اس کے پاس پہنچنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ ملک مغلی امیر ملتان نے جواب میں لکھا کہ وہ سلطان دہلی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ غیاث الدین کو بھی اُس نے ہی رائے دی کہ وہ خسرو خاں پر حملہ کرنے سے باز رہے۔ ملک محمد شاہ پسر امیر سیستان نے لشکر تیار نہ ہونے کا بہانہ کر دیا اور سامانہ کے حاکم ملک یک لکھی نے غازی ملک کا وہ خط سیدھا خسرو خاں کے پاس دلی پہنچا دیا۔

اپنے ایمان و اعتقاد پر بھروسہ کر کے دیپال پور کا یہ تعلق جاٹ ایکلاہی دلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ جمعہ کے دن غازی ملک غیاث الدین اندر پت کے حوالی سے وفاداروں کی جماعت ساتھ لے کر خسرو خاں کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ خسرو خاں بھی اپنے ہندوؤں برادروں اور موقع پرست مسلمان حواریوں کے ساتھ اپنی فرود گاہ سے روانہ ہوا۔ ہر اوت کے میدان میں دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابلے میں آکر صف آرا ہوئے۔ دونوں کے ہر اوتوں میں جھڑپ ہوئی جس میں غازی ملک کو فتح نصیب ہوئی۔ نماز بھر کے وقت تک دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے ٹٹے رہے اور خوب گھسان کی جنگ ہوئی۔ پھر غازی ملک نے اللہ کا نام لے کر اور سبز پھر پڑھ کر ہوا میں لہر کر خسرو خاں کے قلب لشکر پر حملہ کر دیا۔ زن صفت خسرو خاں مردوں کے حملے کی تاب نہ لا کر جھڑوں کی طرح بھاگا۔ اس کی مصیبت منتشر ہو گئی اور لشکر نے شکست کھائی۔ وہ لشکر سے بھاگ کر تلپت کی طرف بھاگ گیا اور بھرات گئے شادی خاں کے خطیرہ میں جا چھپا۔ لوگ اُسے پکڑ کر لے آئے اور اُس کی گردن اُڑا دی گئی۔

غازی ملک فتح و نصرت کے شادیا نے بجاتا دلی میں داخل ہوا۔ قصر ہزارستون میں اُس نے امیروں اور سرداروں کی ایک مجلس آراستہ کی اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے تخت کے پہلو میں دست بستہ کھڑے ہو کر بولا: میں اُن لوگوں میں سے ایک ہوں جن کو سلطان علاؤ الدین اور سلطان قطب الدین نے بلند مرتبے پر پہنچایا ہے۔ اس جذبہ ملک حلالی کی وجہ سے میں نے اپنی جان بازی پر لگائی اور اپنے ولی نعمت کے دشمنوں اور تباہ کرنے والوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ اب تم لوگ جو علانی اور قطعی حکومت کے اراکین اور بزرگان میں سے ہو یہاں ہمارے ولی نعمتوں کے خاندان میں سے کوئی زندہ بچا ہو تو اُس کو اسی وقت لاؤ اور

تخت پر بٹھا دو۔ میں اپنے مولیٰ کے سامنے کربستہ ہو کر کھڑا ہوں گا اور اُس کی خدمت بجا لاؤں گا۔ اگر دشمنوں نے ان دونوں خاندانوں کا کلیتہاً صفایا کر دیا ہے تو تم جس کو تخت کا مسزوار اور بادشاہی کے لائق سمجھتے ہو اس کے متعلق طے کر لو اور اس کو تخت پر بٹھا دو۔ میں بھی اس کی اطاعت کروں گا اور اس کے حکم سے سر نہیں پھیروں گا۔ میں نے جو تیغ زنی کر کے اپنے مرہیوں کا انتقام لیا ہے اور اسلام کی نصرت کے لیے جو کام کیا ہے یہ حکومت کے لالچ کی وجہ سے اور تخت حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا آپ لوگ اس وقت جس کو منتخب کریں گے، میں اُس کے سامنے عقیدت کے سینے پر ہاتھ رکھ کر نیاز مندی کے سڑک بٹکا دوں گا۔

اُن سب بزرگوں نے جو دیاں موجود تھے ایک زبان ہو کر کہا کہ سلطان علاؤ الدین اور سلطان قطب الدین کی اولاد میں سے اس وقت کوئی بھی زندہ باقی نہیں بچا جو اس تخت پر بیٹھ سکتا۔ تو کہ غازی ملک ہے ہم پر تیرے بہت سے حقوق ہیں کئی سال سے تو مغلوں کے حملے روکنے کے لیے دیوار بنا ہوا ہے۔ تیری ہی وجہ سے ہندوستان پر مغلوں کی آمد کا راستہ بند ہے۔ اس موقع پر بھی تو نے وہ کام کیا ہے کہ تیری ملک حلالی کا ذکر تاریخوں میں لکھا جائے گا۔ تو ہی وہ مسلمان ہے جس نے حکومت کو ہندوؤں اور برادوں کے غلبے سے چھڑایا ہے۔ ہم سب لوگ بلکہ اس ملک کے تمام مسلمان تیرے اس احسان کے لیے ممنون ہیں ہم سب لوگ جو یہاں پر جمع ہیں بادشاہی کے لائق اور حکمرانی کا مسزوار تیرے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتے۔ عقل و دانش نیز استحقاق و دیانت کی بنا پر تیرے سوا نیابت تخت کے لیے کسی اور کو مناسب نہیں سمجھتے، چنانچہ ارباب حل و عقد نے متفق ہو کر غازی ملک کا ہاتھ پکڑا اور اُس کو تخت پر بٹھا دیا۔

فضائیں بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر لیڈر نے پوچھا: ”یہ دیپال پور ہے کس طرف؟“ میں نے کہا اگر تم لاہور سے بس میں سوار ہو کر ساہیوال کی طرف جاؤ تو راستے میں اداکار آتا ہے۔ اداکارہ شر سے دودھانی میل پہلے یا شاید اس سے بھی کم ایک اڈہ ہے جہاں بہت سی لاریاں اور رٹک کھڑے ہوتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بے شمار ہوٹل ہیں۔ یہاں سے بائیں جانب کو ایک چھوٹی ٹیسی سڑک جاتی ہے اور یہ دیپال پور کا راستہ ہے۔“

اس ساری داستان کا مسودہ کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ وہ ہم سب کو چھوڑ کر بٹا اور جلدی جلدی واپسی کے راستے پر چلنے لگا۔

”مسعود مسعود، رگو، ٹھو، دیکھو، مسعود، ہم سب کی آوازیں یکے بعد دیگرے فضا میں گونجنے لگیں۔ لیڈر اُس کے پیچھے بھاگا اور چند ہی قدموں پر اُسے جا لیا۔

”کمال جا رہے ہو؟ لیڈر نے حیران ہو کر پوچھا۔
”کیس نہیں،“ مسعود نے رُکے بغیر جواب دیا، ”میرا رومال شاید وہاں پیچھے گر گیا ہے۔ اُسے دیکھنے جا رہا ہوں۔“

مسعود اپنے رومال کی تلاش میں کافی دُور نیچے کو چلا گیا اور ہم سب اس کے انتظار میں کھڑے رہے۔ جب وہ واپس لوٹا تو اُس کے پاس اُس کا رومال نہیں تھا۔ ہماری طرف آتے ہوئے ابھی بھی وہ زمین کی طرف دیکھتا چلا آ رہا تھا اور اُس کا خیال تھا کہ لٹھے کا وہ چھیترا اُسے کیس نہ کیس مل جائے گا جو اس کی بیوی نے پُرانے غلاف سے پھاڑ کر بنایا تھا۔

تلاش کا عمل بھی غیب ہے۔ لوگ نیلے آسمان پر عید کا چاند تلاش کرتے ہیں۔ قدموں کا نشان دیکھ کر چوڑا کھوج لگاتے ہیں۔ کلائی ہاتھ میں لے کر حصے کے اندر حدت تلاش کرتے ہیں، کھنڈرات دیکھ کر پُرانے لوگوں کا چلن ڈھونڈتے ہیں۔ شادی کے لیے اچھی نسل تلاش کرتے ہیں۔ خوش وقتی کے لیے اچھا جسم تلاش کرتے ہیں۔ جب بچہ گھر نہیں پہنچتا تو ماں اُس کو تلاش کرنے کے لیے دیوانہ وار راہوں اور شاہراہوں پر نکل جاتی ہے۔ جب اُمی بچے کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی بیوی کے کھانوں میں ماں کے پکوانوں کی بُو باس تلاش کرتا ہے۔ جب نوجوان اُداس اور تنہا ہوتا ہے وہ جیون ساتھی تلاش کرتا ہے اور جب اُسے زندگی کا ساتھی مل جاتا ہے تو وہ اُسے گھر چھوڑ کر دُوروں کے جیون ساتھیوں کا نظارہ کرنے باہر نکل جاتا ہے۔

کچھ آدمیوں کو خبر ہوتی ہے کہ وہ تلاش کرنے جا رہے ہیں جیسے مسعود کو علم تھا کہ اُس کا رومال گر گیا ہے اور وہ اُس کی تلاش میں جا رہا ہے یا میجر لیئر کو علم تھا کہ وہ کرگنا تلاش کر رہا ہے۔۔۔
آئیسویں صدی کے اوائل میں کینی بہادر کا ایک میجر ڈیرہ دون میں تعینات تھا جو اپنی شرافت، نجابت، کم سخن اور دھیمے مزاج کی وجہ سے گوروں اور دیسیوں میں یکساں طور پر ہر واعر و عزیز تھا اس

میجر لیئر کے تین بچے اور دوسرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی ایک بیوی بھی جو گھر سوار سی کی بہت شوقین تھی۔ اس کے بچکے پر طرح طرح کے گھوڑے بندھے تھے۔ وہاں کچھ اسی قسم کے گھر سوار بھی مختلف سرورٹ کوارٹروں میں جمع ہوتے تھے۔ ان میں بھاگا گھر سوار، سندھی عرب، شہسوار، یاغتا، سوار، مغل چابک سوار اور بقی اور ساندل کے بیٹے سوار بھی قسم کے لوگ ہوتے۔ میم صاحب اُن لوگوں سے بہت متاثر تھے اور ان کے ساتھ گھنٹوں گھوڑوں کی باتیں کیا کرتیں۔

میجر لیئر بہت ہی شریف قسم کا فوجی آدمی تھا۔ اپنے باپ کے متبع میں وہ فوج میں داخل ہوا۔ دوسرے برٹش آفیسروں کی ہمیشہ عزت کرتا رہا۔ شام کو کلب میں سو ڈانور کی پٹیا کالے لوگوں سے انسانیت کے ساتھ پیش آتا۔ اُدھار لیتا تو رقم وقت پر لوٹا دیتا۔ خوشی کے موقع پر خوش غنی کے موقع پر ایک جھرجھری اور اتوار کے روز گرجے۔ ملکہ کا نمک حلال اور کنگم سیس کا عقیدت مند لیکن اس میں اپنے دوسرے فوجی افسروں کے مقابلے میں ایک پیچ زیادہ کم ہوا تھا۔ یہ کہ میجر لیئر ایک تقریبی محقق بھی تھا۔ اس کو الول جلول ڈائریاں لکھنے اور بیودہ قسم کی تحقیق کرنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے بھائیوں وہ ایک عالم تھا جو علم اور عمل کے میدان میں ہفت خوال ملے کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اس شوق نے اس کو پُرانے مسودوں اور منطوطوں کا خریدار بنا دیا تھا اور وہ قدیم مسودوں کی تلاش میں ادھر ادھر گھومتا بھی رہتا تھا۔ اس کے مسودوں کا بہترین پلار، سکم کا ایک کباڑیا تھا جو یادہ گوئی اور چرب زبانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے کردار سے اور اُس کی گفتگو سے متاثر ہو کر میجر لیئر کئی کباڑیے کا یار بن گیا۔ دونوں میں سے ایک کو جب بھی موقع ملتا وہ دوسرے کے پاس پہنچ جاتا۔ چائے کا دُور چلتا، ساپنوں اور جوگیوں کی باتیں شروع ہو جاتیں اور پھر یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ کئی کئی دنوں پر محیط ہو جاتا۔

ایک مرتبہ سکم کے کباڑیے نے میجر لیئر کو بتایا کہ اس کے یہاں تربت کا ایک بنجارا آیا ہوا ہے جو ملنے کی چیز ہے۔ میجر صاحب فوراً تیار ہو گئے۔ دونوں کے درمیان بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور میجر صاحب اس کی داستان کی کافی میں کریم بن کر گھٹنے رہے۔ اچانک بنجارے نے کہا: ”میجر صاحب ہمارے ادھر نیپال اور تربت کی اندرونی گمراہیوں میں کرگدلوں کا ایک بہت بڑا غول ہے جو چرنے چگنے کے لیے صرف رات کے وقت پہاڑوں کی ڈھلان

پرتا ہے اور پھر غاروں میں گم ہو جاتا ہے۔

”کس کا غول؟“ میجر نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کرگدانوں کا ریور میجر صاحب۔ یونی کارن کا۔“

”گوٹھڑا جس کے ماتھے میں ایک بل دار سینک ہوتا ہے۔“ میجر نے پوچھا۔

”دہی۔ دہی۔“ بنجائے نے کہا۔ بالکل وہی۔ اُن کا ایک غول تبت کی ترائیوں میں

گھوم رہا ہے۔“

”لیکن کرگدانا کی کوئی وجودی حقیقت تو نہیں۔“ میجر نے کہا۔ یہ تو مایہ تاجی ہے، تصویری وجود

ہے، دیوالائی کمائیوں کا جانور ہے۔“

”بس۔“ بنجائے نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ تم گوے لوگوں کا علم نہیں تو آخر تم ہو جاتا ہے۔

میں جو کہہ رہا ہوں چشم دید گواہ کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ میں نے اس غول کو کئی مرتبہ دیکھا ہے اگر

انسان کے پاس اچھا سا پھندہ ہو اور تم لوگ ایسی ایجادوں کے بڑے ماہر ہو تو پھر کئی کرگدانے بڑی

آسانی کے ساتھ پکڑے جاسکتے ہیں۔“

میجر لیشی تبتی بنجائے کی یہ بات سُن کر واپس چھاؤنی آگیا۔ اتنے ہی سیدھے پہلے اپنا استعفیٰ

کرنے کو پیش کیا۔ پھر بنگلے پر جا کر بیوی بچوں کو خدا حافظ کہا۔ یاروں دوستوں سے وداع ہوا اور

بنجائے کے ساتھ سوار ہو کر شمالی پہاڑوں میں کرگدانوں کی تلاش میں نکل گیا۔ پورے سات سال

میک میجر کرگدانوں کے غول کی تلاش میں رہا اور تبتی بنجارا اُس کی راہنمائی کرتا رہا۔ اس عرصے میں

وہ بالکل تلاش ہو گیا۔ مجھوک پیاس سے ہڈیوں کا ڈھانچہ سارہ گیا۔ پریدہ رنگ دریدہ لباس جہاں

بھی جا کر ہوتا لوگ دیوانہ دیوانہ کہہ کر اس کے قریب سے بھاگ جاتے۔ تبت کے فوجی گاؤں

میں اس کی کہانیاں مشہور ہو گئیں، لیکن اس نے تلاش کی مہم جاری رکھی۔ سات سال بعد اُس

کا ساتھی فزٹ ہو گیا تو میجر لیشی اس دُنیا میں اکیلا رہ گیا۔ پھر بھی اس نے کرگدانوں کے ریور کی تلاش

نہ چھوڑی اور تین سال اور تک پہاڑوں کے وامنوں اور سلسلہ کوہ کی غاروں میں اُنہیں تلاش

کرتا رہا۔

جب اُس کی حالت بالکل غیر ہو گئی اور رُوح اور جسم کا رشتہ داغی سارہ گیا تو وہ پایادہ

واپس ڈیرہ دولن پہنچا۔ اب یہاں نہ اُس کا گھر تھا نہ بیوی بچے، نہ بیٹن بھتی نہ اُس کے ساتھی، نہ

کوئی واقف کار نہ کسی سے جان پہچان۔ سکیم کا کابلیا عرصہ ہوا مچکا تھا۔ میجر لیشی راگتا پینتا دیورہ گری

کرتا پایادہ کلکتہ پہنچا اور مسالچی کی حیثیت سے ایک جہاز کے باورچی خانے میں ملازم ہو گیا۔ یہ جہاز

انگلستان جا رہا تھا۔ کوئی ایک مہینہ مسالچی کی نوکری کرنے کے بعد اس نے جہاز پر ہی حجامت بنانے

کا کام سیکھا اور پھر مسافروں کی جماعتیں بنانے لگا۔

جب وہ لندن پہنچا تو اُس نے کنگھی قینچی اور اُسٹر خرید اور برائٹن میں لوگوں کی جماعتیں

بنانے لگا۔ آٹھ سال تک لوگوں کی جماعتیں بنانے اور خط کرنے کے بعد اس نے بال بڑھانے کا ایک

لوشن بنایا جو وہ ہر گاہک کو زبردستی دیا کرتا۔ ایسی پرسکون اور ہموار زندگی گزارنے کے بعد مسٹر لیشی

ایک دن فوت ہو گیا اور مٹنے کے لوگوں نے اپنے نانی کو عزت و آبرو کے ساتھ دفن کر دیا۔

لیکن ایک تلاش ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کو اُس کا علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ تلاش کر رہا ہے یا

اس کو کسی چیز کی چنتا ہے یا وہ کوئی رستہ ڈھونڈ رہا ہے یا اُسے کسی شے کی تلاش ہے۔ پھر بھی

یہ عمل جاری رہتا ہے اور مرتے دم تک اس کو اس بات کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ اس قدر بے چین

کیوں ہے، خالی کیوں ہے، اس کی روح کے اندر ایک تھر تھری سی کیوں رہتی ہے؟

”اُس کو بلا لاؤ جو ابھی ہمارے درمیان بیٹھا تھا۔“

”اُن سے کہنا کہ ابھی ذرا ٹھہریں۔“

”اور وہ جو لالان کی پیلی ڈھوپ میں لیٹا تھا؟“

”کیوں میاں چرواہے کبھی کوئی اس کھنڈر کے اندر بھی گیا ہے؟“

”وہ جس کے ماتھے پر زخم کا گہرا نشان تھا۔ ہاتھ میں شادی کی دو کیریں تھیں۔ منہ سے کسی اور منہ

کی نوا آ رہی تھی۔ وہ کون تھا؟“

”IS THERE ANYBODY THERE?“

”چہ کم کہ فطرت من بہ مقام در نازد۔“

”جب اول فنا ہے تو آخر فنا ہے، تو پھر حالت متوسط کا کیا اعتبار؟“

”PRONTO ! SCUSI-DI-CHI-PARLI ?“

”اور وہ جو شاید ابھی جا سے درمیان موجود تھا وہ کہہ رہا تھا کیا؟“

ایک شام ہم لاہور ریڈیو سٹیشن کے ٹوٹے ہوئے صوفے پر بیٹھے تھے تو کسی نے امانت علی خان سے پوچھا: خان صاحب آپ کیوں گاتے ہیں؟ تو امانت نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہوا میں لہرا کر بولا: واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، کوئی سوال ہے، کوئی سوچنے کی بات ہے، کوئی مسئلہ ہے، سیدھی بات ہے کہ میں ۱۰۰ اور پھر وہ رک گیا، دس پندرہ سیکنڈ تک خاموش رہا پھر ہنس کر کہنے لگا: پتہ نہیں کیوں گاتا ہوں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے متعلق حد ہو گئی... ہاں سچ یاد رہتی بناؤ کہ میں کیوں گاتا ہوں گانا مجھے کیوں اچھا لگتا ہے، روٹ پر مٹ کیوں اچھا نہیں لگتا۔

پھر ہم سب خاموش ہو گئے اور اپنی اپنی جگہ غور کرنے لگے، لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہمارے درمیان ایک پُرانا دھڑا بنا اور پڑھا لکھا فلسفی بھی تھا، اُس نے نگلی اور اٹھا کر کہا: ”یہ تلاش کا مسئلہ ہے آرٹسٹ کے اندر جستجو ہوتی ہے حقیقت کی جستجو، اپنی تلاش، حق کی تلاش، کھوئے ہوئے کی تلاش، نہ کھوئے ہوئے کی جستجو، وہ کجوج میں گاتا ہے تصویریں بناتا ہے، سنگتراشی کرتا ہے، شعر لکھتا ہے، قص کرتا ہے اور دُور نکل جاتا ہے۔“

”لیکن مجھے تو کسی کی تلاش نہیں“ امانت نے کہا۔ ”میں نے کسی کو نہیں کھویا، مجھے تو کسی کی جستجو نہیں، پھر نہیں کیوں گاتا ہوں؟ اور ہم سب نے سوچا کہ چونکہ اس نے گانا کیا ہے اس لیے گاتا ہے اور چونکہ اس کے گھرانے کی ریت یہی ہے اس لیے وہ اس ریت کو نجات دہا ہے، لیکن ہم سب غلط سمجھتے تھے۔“

چونکہ ابھی تک کوئی ایسا آلہ وضع نہیں ہوا جو انسان کے اندر کو ماپ سکے اور اس کی گہرائی کو آنکھ سکے، اس لیے ہم نے ایک غلط فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے میں خود آرٹسٹ بھی شریک تھا بلکہ پیش پیش تھا۔

میرے حساب سے آرٹسٹ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہوتا ہے، وہ بھی اپنے نفع اور نقصان کو سمجھتا ہے، اپنی بہتری کے پروگرام بناتا ہے، اپنی مادی ترقی میں دلچسپی لیتا ہے، وہ بھی حسابی کتابی ہوتا ہے، حصولِ زر کی خواہش رکھتا ہے، اپنے ذہن کے اندر ایسے پٹرول پمپ اور

ایسے باغ لگاتا رہتا ہے جس سے گھر بیٹھے معقول آمدن ہوتی ہے، کنڑیاں اور عمارتیں اٹھاتا ہے جن سے کرایہ ملتا رہے، بس میں سفر کرتے ہوئے کئی دفعہ پکار کر کہتا ہے: ”یار تم نے میرے پندرہ پیسے واپس کرنے میں کئی فلاں لگا لبا سفر کر کے سستی چیز خریدنے جاتا ہے۔ گھر والوں کے مقابلے میں اپنی ذات کو ترجیح دیتا ہے، ہماری طرح سے خوش اطوار ہوتا ہے اور بڑے سلیقے کے ساتھ کینین کرتا ہے۔“

حسد، بغض، عناد، کینہ، بغیبت، طعنہ اس کے اجزائے زندگی ہوتے ہیں، لیکن اس کے اندر کا ایک میٹر ان ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ یہ میٹر اس کے دل کے نیچے جگر کے پاس یا پھر اپنڈیکس کے قریب ہوتا ہے، بائیس اور اس کی اسے مطلق خبر نہیں ہوتی، نہ وہ اس کی فنکشن سے آشنا ہے نہ اس کی موجودگی کا علم رکھتا ہے۔ عین اسی طرح جس طرح ہم کو یاد نہیں رہتا کہ ہمارے اندر گڑھے لگے ہیں اور وہ کچھ کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح آرٹسٹ کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اندر ایک میٹر لگا ہے اور وہ اپنا کام کر رہا ہے۔

جس طرح ماہرین طبقات الارض گگر کاؤنٹر سے زمین کے اندر معدنیات تلاش کرتے ہیں اسی طرح آرٹسٹ کے اندر کا میٹر کسی انہونی شے کو کسی انکھے رنگ کو کسی بے نام مٹر کو تلاش کرتا رہتا ہے اور اس کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ اس کے اندر تلاش کا عمل جاری ہے، جیسے ہمارے اندر تقطیر کے عوامل کی ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوتی، لیکن یہ عمل جاری ہوتے ہیں، اسی کاؤن کان خبر نہ ہونے کی وجہ سے امانت علی نے بھی بڑی مصومیت کے ساتھ کہہ دیا کہ اس کو تو کسی کی تلاش نہیں کسی کی جستجو نہیں۔

چھ سات سال اور ہر کی بات ہے۔ ریاض محمود کے کمرے میں امانت علی سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ خاموش کچھ گواہا ہوا اور کچھ خوش سا تھا۔

ریاض نے کہا: ”کیا بات ہے خاں صاحب کچھ ہماری دید نہیں کر رہے ہو، کیا ناراضی ہے یا ہم سے کوئی خطا ہو گئی ہے؟“

امانت نے ذرا سی پریشانی، تھوڑی سی غمزدگی اور ہلکی سی پریشان مسکراہٹ کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: ”ایک عجیب سا واقعہ ہو گیا، اشتقاق صاحب، میں کراچی گیا ہوا تھا ایک کنسرٹ کے سلسلے میں وہاں خوب نفل جی، بڑی داد ملی، پھر چند صاحب لوگوں نے

ایک سونوشت کی فرمائش کی۔ رات گئے تک میں غولیں گاتا رہا، خوب سماں بندھا بڑا لطفت آیا وقت ٹھہر گیا، میرے اندر ایک عجیب عاجزانہ سا کتر پیدا ہو گیا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا... اُدھر سے تو میں کانوں کو ہاتھ لگاؤں لیکن اندر سے مجھے خوشی ہو کہ اور کوئی اس طرح سے غزل نہیں گا سکتا۔ یہ بڑی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ بابا آدم کو بھی اسی طرح کی ندامت ہوئی ہوگی اور ساتھ خوشی بھی کہ منور محل کھا کر دکھایا آدمی فرشتوں سے اُدھر سا ہو جاتا ہے جیسے فرشتے اسے پھر سجدہ کر رہے ہوں اور وہ شرمندگی سے ندامت سے اور خجالت سے اُن کے آگے ہاتھ باندھ کر رونے لگ جاتے میری آواز میں رونے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

اسی محل میں ایک خاتون بھی گھرے گئی رنگ کی قیمتی سی ساڑھی پہنے اُس کی کمر میں ریڑھ کی ہڈی بہت گہری تھی بڑی خوبصورت کمر تھی ریاض صاحب! میں نے تو پہلے کبھی عورت کی کمر کے بلے میں اس طرح سوچا ہی نہ تھا۔ بڑی کوئی اُدھنی قسم کی خاتون تھی اُدھنی ناک والی، گنگو کرتی تھی اور موڑی اٹھا کر بیٹھی تھی، میرا خیال ہے کہ وہ غزلوں کے مشکل شعر سمجھتی تھی نہیں تھی، وہ ایسی خوبصورت اور اتنی طرحدار تھی اشفاق صاحب کہ میرا دل چاہنے لگا کہ میں اس سے کوئی بات کروں اور وہ مجھے میرے سوال کا لمبا جواب دے، کافی لمبا دیر تک نہ ختم ہونے والا، لیکن اس نے میری طرف کوئی توجہ دی منہ سے بیٹھی نگرینہ ہی رہی۔ پھر کوئی ڈیڑھ پونے دو بجے ہوں گے رات کے... ہم محل سے باہر نکل کر چلنے لگے، تو وہ میرے قریب آکر بولی: آپ کس ٹھہرے ہوئے ہیں امانت صاحب؟

”ہم! میں تو اس گھر آگیا اور ذرا سوچ کر بولا یہی جی ہوٹل میں اور ہم لوگ کہاں ٹھہریں گے“ اس نے اسی طرح ناک اُدھر اٹھا کر کہا۔ آپ میرے ساتھ گھر چلنے آرام سے سوئیے اور صبح کا ناشتہ کر کے آجائیے۔ مجھے ٹیک سے یاد نہیں ریاض صاحب کہ میں نے اس کی بات کا جواب دیا یا نہیں لیکن میرے اندر ایک خوبصورت تنہائی سی بھی اُدھر میں اس کے ساتھ کام میں سوار ہو گیا عجیب سی کام تھی۔ اس کے اندر کئی میٹر مختلف رنگوں کے چل رہے تھے میل بتانے والی سوئی نہیں تھی، پارہ سا اُدھر کو چڑھتا تھا۔ اسی طرح کی اور بلا تیرکٹی گھڑیاں سوئیاں تھیں۔ کوئی آدھ گھنٹہ مسلمان ہو کر کو چاہتے ہم اس کے بچکے پر پہن گئے۔ ڈاڈا تو دسے کے دونوں طرف پام کے بڑے بڑے درخت

تھے۔ برآمدے کے ستونوں پر سبز سلیس چڑھی تھیں۔ دریا نی محراب میں مینا کا بھرہ لٹک رہا تھا اور مینا سو رہی تھی۔ پھر ہم ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ ادھیڑ گھر کا ایک ملازم برف گلاس اُدھر چھوٹی بڑی بوتلیں ایک ٹرالی میں رکھ کر لے آیا، اس نے بور کے ایک گلاس میں ہلکی کافی کے رنگ کی شرا ڈالی اور چاندی کی چمچی سے برف کے ٹکڑے پکڑ کر اس میں چھوڑ دیے۔

پھر کہنے لگی: آپ کون ہیں امانت صاحب؟

میں نے جلدی سے کہا: ”ہم جی پیٹالے کے رہنے والے ہیں اور ہمارا گھر ان پیٹالے کی گائیکی کا گھرانہ ہے اور میرے دادا ہمارا ج کے دربار میں کرنل کا رتبہ رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے زمانے میں... لیکن وہ مکرانے لگی اور منس کر بولی میں نے پوچھا تھا آپ کون ہیں؟“

”میں تو جی شرمندہ سا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اب اس کو کیا باتوں کہ میں کون ہوں اور کس جانب تو مجھے خود بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں کون ہوں... ایک خاموشی سی چھا گئی...“

اس رات میں نے بہشت دیکھا ریاض صاحب! مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ بہشت کیا ہوتا ہے، بس کتابوں میں پڑھا تھا اور بزرگوں سے سنا تھا، لیکن اصل بہشت اشفاق صاحب آپ میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ جس طرح جس آدمی نے کبھی رلے دند نہیں دیکھا اس کو اپنے علم کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ رلے دند کیا ہوگا، لیکن اصل رلے دند اور ہی طرح کا ہوتا ہے۔ کتاب والے اور علم والے رلے دند سے مختلف۔ اسی طرح اصل بہشت اور ہے اور کتابوں کا بہشت اور۔

صبح جب بابا ناستہ لایا تو ہم ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھے تھے۔ جب وہ مجھے اپنی کار میں ڈال کر ہوٹل کے لیے چلی تو مینا جاگ چکی تھی اور صبح سے پر کرید رہی تھی۔ اس نے سارے راستے کوئی بات نہ کی اور مجھے ہوٹل پر اتار دیا حافظ کہ کھلی گئی۔ جاتی ہوئی کار میں میں نے اتنی چیز اس کا پرس اور پرس کے پاس پڑی ہوئی سگریٹوں کی ڈبی دیکھی تھی۔

”تم نے اس کا پتہ نوٹ نہیں کیا امانت؟“ ریاض نے ہنکلا کر پوچھا۔

”کیا جناب کیوں نہیں؟ یہ دیکھو، یہ دیکھو نوٹ بک میں درج ہے، فون نمبر بھی ہے“

”بس پھر تو مزے ہیں“ ریاض نے کہا۔

”لیکن خوفِ سماجی ہے ریاضِ بجائی اور اس خوف کی مجھے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی“
یہ وہ زمانہ تھا جب امانت نے بڑے خوبصورت کڑھے ہوئے ریشمی کُرتے پہنے شروع کیے۔
گریبان کے آگے بل کھاتے ڈورے اور آستینوں کے پاس ڈولتے ہوئے چمکن لیکن یہ ساری
آرائش اور یہ خوبصورتی اور اتنی بہت مقبولیت اس کا خوف اور اُداسی دوریہ کر سکی۔

پھر ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ چُپ چاپ اکیلا کراچی چلا گیا۔ شاید کوئی اور
بھی جانتا ہو، لیکن مجھے اور ریاض محمود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس کم گو کی آواز سننے کے
لیے ترستا گیا ہے۔ دُنیا کے اتنے گلوکاروں میں سے اس کو صرف ایک وہی آواز پسند آتی تھی جو شاید
رُک رُک کر نکلتی تھی، لیکن ہر فقرے پر پورے سُر لگتے تھے۔

تیسرے دن امانت واپس آگیا، ہم نے اس سے گہرے مقصود کی بابت پوچھا تو کھیا نی سی
ہنسی ہنس کر خاموش ہو گیا۔ ریاض نے کہا اشتقاقِ صاحب یہ بہشت سے نکلنے کا انوس ہے اور
اس میں بات کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔

امانت نے کہا کون سا بہشت اور کیسا بہشت ریاض صاحب! وہاں تو کوئی بھی نہیں کچھ
بھی نہیں۔ اک خواب سا تھا اب اس کی یاد باقی رہ گئی ہے۔

کراچی پہنچ کر میں سیدھا اُس کے بنگلے پر گیا تھا گھنٹی بجائی اندر سے ایک بوڑھا پارسی بخلا میں
میں نے بیگم صاحب کی بابت پوچھا تو اس نے کہا کون سی بیگم صاحب بابا کدھر کی بیگم صاحب! اور
تو کوئی ایسا نہیں۔

میں نے نوٹ بک آگے کر دی، اس نے غور سے نام اور پتہ پڑھا پھر ہنس کر بولا تو یہ بھگچوڑ
گئی یہ تو ہم نے کرائے پر لے لیا ہے۔

”اور وہ کہاں چلی گئی؟“

”اس کا ہم کو کیا معلوم؟ ہم کوئی ہر ایک کا نام اور پتہ تو نوٹ کر کے نہیں رکھتا، جاؤ شاہاش“
میں نوٹ بک جیب میں ڈال کر واپس چلا آیا۔ عتوڑی سی کوشش کی جہاں جہاں سے
ان کا پتہ معلوم کر سکتا تھا کیا، لیکن کوئی اثر آثار ان کا نہ ملا، پتہ نہیں وہ سچ سچ کوئی مخلوق تھی یا مجھے
دھوکا ہوا تھا، جب مجھے مینا کا بیخبرہ یاد آتا ہے تو لگتا ہے کہ خواب تھا کوئی طلسماتی مقام تھا لیکن

جب پیٹی کوٹ اور بلاؤز کے درمیان ریڑھ کی ہڈی گہری نالی بناتی ہے اور ہاتھ اُسے محسوس کر سکتا
ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے حقیقت تھی، پتہ نہیں کیا تھا، جی آپ ہی کچھ اندازہ لگائیں۔
ہم دونوں اس کے ساتھ مل کر اندازہ لگاتے رہے، لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔

پھر امانت کا تارہا اور خوب کا تارہا اور خوب خوش رہا اور ہم سے ملتا رہا اور اس واقعہ پہنستا
رہا اور ہم کو ہنسنا تارہا اور لطیفے سنا تارہا اور بس کنڈیکٹر سے پندرہ پیسے بھی واپس مانگتا رہا، لیکن اس
کے اندر تلاش کا لگ کر کاؤنٹر اتیر ہو گیا مینا والی کی تلاش نہیں صاحب نظر لوگوں کی تلاش نہیں بس۔
تلاش! تلاش! تلاش! جس کا احساس آرٹسٹ کو کبھی نہیں ہوتا، جیسے سائیکل سوار کو کبھی
پتہ نہیں چلتا کہ وہ پاؤں چلا رہا ہے؟ آدمی کو محسوس نہیں ہوتا کہ اس کی رگوں میں خون دوڑ رہا ہے!

جب امانت علی مر گیا اور اس کی موت کی خبر سائے ٹھک میں پھیل گئی تو اجمل ایکٹر شرک کے
کنائے کھڑا تھا، اس نے مجھے ہاتھ دے کر روکا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ عتوڑی دیر بعد
اپنے چہرے کو مخصوص انداز میں ٹوئچ کرنے کے بعد بولا: بھاجی ایہ دوستو کہ امانت مریوں گیا؟
میں نے کہا اجمل صاحب آرٹسٹ مرنے نہیں روٹھ جاتا ہے۔

کنے لگا، اُس جاندا اے! کدھے نال؟

میں نے کہا اپنے ماحول کے ساتھ، اُن ہونیوں کے ساتھ اور اس میں اجمل صاحب معاشرے
کا اور ماحول کا بھی کوئی تصور نہیں ہوتا، معاشرہ بڑا اچھا ہوتا ہے، آرٹسٹ سے بڑی محبت کرتا ہے،
اس کی بڑی خدمتیں پوری کرتا ہے، اس کو مرنے سے شراب پینے سے بوہین ہونے سے، تباہ
ہونے سے نہیں روکتا، لیکن پھر معاشرے کا بھی چند چیزوں پر بس نہیں چلتا۔

”ادھ کس طراں؟“ اجمل نے پوچھا۔

میں نے کہا آرٹسٹ معاشرے سے کتنا ہے مجھے ایک کوزہ لے دو، کچھ مٹی کا کچا کوزہ اور معاشرہ
نور اُسے ایک کوزہ فراہم کر دیتا ہے، پھر آرٹسٹ کتنا ہے مجھے ایک ہاتھی لے دو اور معاشرہ نور
اپنی تمام تر پونجی جمع کر کے اُسے ایک ہاتھی لے دیتا ہے، پھر آرٹسٹ معاشرے سے کتنا ہے اس
ہاتھی کو اس کوزے میں ڈال دو، اس وقت معاشرہ مجبور ہو جاتا ہے اور اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہے،
اس پر آرٹسٹ ناراض ہو جاتا ہے اور روٹھ جاتا ہے اور منٹا نہیں اور چلا جاتا ہے۔

اجل نے حیران ہو کر کہا: بھاجی لیکن ادہاتے آپرین نہیں ہو سکیا وقت سزا پنڈکیں آپرین سی ڈاکٹراں تو جہ نہیں دتی؟

میں نے کہا: نہیں یا زاپنڈکیں خراب نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ایک اور میٹر ہوتا ہے۔ ایک لگو کا ڈسٹروڈ تیز ہو جاتا ہے اس کی فری کوئی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور انسانی جسم اس کی تاب نہیں لاسکتا۔

”ایہ میٹر کی کردار اسے بھاجی، اجل نے پوچھا۔

”اس کو کسی کی تلاش ہوتی ہے کسی شے کی جستجو ہوتی ہے۔

”کہہ دے؟ کیڑی شے دی تلاش؟“

”اس کی مجھے بھی خبر نہیں، خود آرٹسٹ کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا، تم کو بھی پتہ نہیں بھائی اجل یہ تہدق اندک ہوتی ہے نہ دیکھنے والے کو علم ہوتا ہے نہ معلوم کو نہ خود مرعین کو۔ پھر لکشی چوک تک میرے اور اجل کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔

جس طرح اجل میرے پہلو میں خاموش بیٹھا امانت کی موت کے بارے میں سوچ رہا تھا، اسی طرح ہم ایک دوسرے کے پہلو پہلو چل رہے تھے اور خاموش تھے۔ ہم نے اتنا طویل سفر ساتھ ساتھ طے کر لیا تھا کہ اب ہم ایک دوسرے سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔ تھکے ہوئے سے دبے ہوئے سے زبردستی کے بُدباز بنے ہوئے سے اور دوست بنے ہوئے سے۔ جس طرح میاں دیوی ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہ کر ادب جاتے ہیں اور میزاد ہو جاتے ہیں اور پھر ساتھ ہی رہتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور ہمارے اندر نور باہر میں وہی قبولیت تھی جو ہماری بیویوں کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ ہم خوش تھے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ہمارے درمیان محبت اور گنگا نکت کا رشتہ قائم ہے۔

اتنے میں ایک مرد بزرگ ہمارے قریب سے گزرا۔ اس نے سر پر کُلتے والی سفید گڑھی باندھی ہوئی تھی، گلے میں لبا کر رہا تھا۔ نیچے کھلا سا تہ بند تھا اور پاؤں میں چڑے کے سیاہ بوٹ تھے جن کے تسمے کُلتے ہوئے تھے۔ اس بزرگ مرد کی ڈاڑھی سیاہ اور چمک دار تھی۔ اس نے ایک رات بیچ تیل لگا کر ڈبل خضاب کیا تھا۔ جب وہ ہمارے قریب سے گزرا تو مسودا اور کوہستانی نے ایک ساتھ

”السلام علیکم“ کہا، لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح سر جھکا کر قریب سے گزر گیا۔ مسعود نے ذرا رک کر پیچھے مڑ کے دیکھا تو کوہستانی نے کہا:

”دفع کرو صیب۔ دیوث کا بچہ۔ سلام کا جواب دینا نہیں جانتا۔

”بھئی اب پریوں کا علاقہ شروع ہو گیا دوستو! مفتی نے اعلان کیا۔ اب سلام کا جواب نہ ملے تو غصہ نہ کرو خدا خبر کن کیا ہے اور کیا کیا چیز ہے۔“

”بھئی واہ“ اعظمی خوش ہو کر بولا: ”یہ سالی گرامر بھی پریوں کے دیس میں آکر بدل جاتی ہے۔ کیسے کیسے خوبصورت جملے بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ مفتی جیسے بے زبان آدمی سے۔“

”مفتی اور بے زبان؟ عماد نے فتنہ لگا کر کہا۔ اس کی زبان کا چسکا ہی تو ہم کو جھگڑوں اور بیابانوں میں اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے۔“

مسود نے کہا: ”یہ اعظمی بڑا کچھ ہے۔ بد زبان کی جگہ بے زبان کس خوبی سے استعمال کر گیا ہے کہ مفتی کو بُرا نہیں لگا اور ہم سب کو خبر بھی ہو گئی۔ کیوں شاہ جی؟“

میں نے کہا: ”لیکن یہ آدمی جو ابھی ہمارے قریب سے گزرا تھا یہ تو تو ٹنگ تھا، سب اپنی اپنی جگہ پر رگ گئے۔“

میں نے کہا: ”آج سے چالیس برس پہلے جب میں سکول میں پڑھتا تھا تو ایک ایسا ہی لڑکی ہمارے گاؤں کے ایک کھنڈ میں رہتا تھا۔ اس کا نام دو ٹونگ تھا اور وہ بوٹی پیا کرتا تھا۔“

”یہ وہی ہے یا اُس جیسا ہے؟ مفتی جی نے بخندگی سے پوچھا۔

”وہ تو جھبی مر گیا تھا۔“ میں نے آرام سے کہا۔ ”لیکن یہ بھی وہی ہے۔“

”یعنی کیا اس کی شکل اُس سے ملتی ہے؟ مسود نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس کا قد بُت؟“ لیڈر بولا۔

”نہیں۔“

”شاید اس کی ڈاڑھی چلنے کا انداز، بالوں کی رنگت، عماد نے میری مدد کی۔

”نہیں یہ بھی نہیں۔“

تو پھر بھائی اس کا کچھ اور ملتا جلتا ہو گا۔ اعظمی نے کہا: کچھ چیزیں ایسی غیر مرئی بھی ہوتی ہیں جو کسی کسی کو نظر آتی ہیں۔ وہ ملتی ہوں گی۔ کیوں شاہ جی؟

میں نے کہا: نہیں یاد ایسی تو کوئی بات نہیں؛ البتہ مجھے یہ آدمی دہی لگتا ہے۔ گو اس سے سن و سال میں بہت ہی چھوٹا ہے۔ پھر میں نے بچے ڈھلان کی طرف دیکھا۔ پہاڑ کے بل کھاتے ہوئے راستے پر وہ شخص تیزی سے بچے آتا جا رہا تھا اور اس نے اپنے تہرے کے گرد گڑبڑی کا شملہ لپیٹ لیا تھا۔ ایک میں نے ہی نہیں ہم سب نے اس کو باری باری سے دیکھا اور ایک دوسرے کو احساس دلانے بغیر دیکھا کہ ہم اُسے دیکھ رہے ہیں۔

کوہستانی نے زمین پر جھک کر کہا: "ایک پتھر ماروں دیوٹ کے سر پر؟"

اور ہم سب نے ناں ناں! ناں ناں! ناں ناں! کہہ کر اس کو پتھر مارنے سے منع کیا۔

لیڈر نے کہا: "بھئی چلنا ہے تو جلدی جلدی قدم اٹھاؤ اور اگر رکنا ہے تو تھوڑی دیر قیام کرو۔"

یہ درمیان ڈھیل ڈھال درست نہیں؟

ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا: چلنا ہے بابا چلنا ہے۔ راستہ لبا ہے اور وقت کم ہے۔

ہم کو ضرور چلنا ہے۔"

کوہستانی نے کہا: "تا پلار دے۔۔۔" اور پھر ایک پتھر اٹھالیا۔

"ہیں ہیں ہیں۔" "مغنی نے کہا: کیا کرتے ہو خان جانے دو۔ اس کو جانے دو۔"

"کافر ہے صیب۔" کوہستانی نے کہا۔

"ضرور ہو گا۔" اعظمی نے جواب دیا۔

"بد بخت کا بچہ ہے جی۔"

"صاف نظر آتا ہے۔"

"وہ نے کا بچہ ہے۔"

"بالکل۔ وہ تو اس کی چال سے ظاہر ہے۔" اعظمی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"تو پھر اس کو ماریں صیب۔"

"دفع کرو خان۔ ہم کو اس سے کیا۔ سلام کیا۔ کیا کیا کیا۔" "مغنی نے کہا: خدا اس کو حود

مذاب دے گا۔

لیکن یہ بات کوہستانی کے دل نہ لگی۔ وہ ہمارے ساتھ چلنے تو لگا، لیکن برابر جیسے مرکز دیکھتا رہا اور سیاہ بوٹوں والا سفید دھبہ تیزی سے بچے کی طرف بڑھتا رہا۔

"جب میں دسویں میں پڑھتا تھا۔ میں نے کتنا شروع کیا۔ تو میں دو ٹونگ کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ میں اپنے سکول کا ایک اچھا ہونہار طالب علم تھا اور میرے ساتھ میرے سکول کی کئی اُمیدیں وابستہ تھیں اور ہمارا امتحان بہت قریب تھا اور میں دو ٹونگ کے تحیر میں گم ہو گیا تھا۔ دو ٹونگ ہمارے قبضے کی ایک پرانی حویلی میں جو کھنڈ میں تبدیل ہو چکی تھی رہتا تھا۔ اس کو باہر آتے جاتے، مانگتے پھینتے، سوتے جاگتے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہو گا۔ پتہ نہیں وہ کیا کھاتا اور کہاں سے کھاتا تھا؟

اُس کے سائے جسم پر کوئی بال نہ تھا اور اس کی کھال جگہ جگہ سے اچھی ہوئی تھی۔ سالہانہ شہزادہ کتے کی طرح سونو لایا ہوا تھا اور بھری دار تھا ایک سور کے کٹورے میں گیر و تیل اور توڑے کی کانک کا وارنش سا پڑا رہتا ہے وہ تھوڑے تھوڑے وقفے پر اپنے بدن پر طار کرتا۔ ہر وقت سگتے ہوئے اُپلوں کے اندمائی کی ایک ہنڈیا پکا کرتی اور اس ہنڈیا کے پاس ایک چھوٹا سا ٹوٹا ہوا چاقو چھل کے بل زمین میں دھنسا رہتا۔

پہلے تو میں سکول سے تفریح کے پیر بیڈ میں بیٹھا کھا کر دو ٹونگ کے پاس جاتا اور اس کے سامنے بچے جمورے کی طرح بیٹھا رہتا۔ پھر میں دوسرے پیر بیڈوں میں بھی کھسکتے لگا۔

"لیکن تو وہاں جانے کیوں لگا؟ لیڈر نے پوچھا۔"

"ہاں، یعنی کیا دلچسپی تھی تم کو شاہ جی؟" مسعود بولا: "کون سی کشش تھی؟"

"کچھ نہیں۔ میں نے کہا: کوئی دلچسپی نہیں تھی، کوئی کشش نہیں تھی۔ پھر بھی میرا دل اس کے پاس جانے کو چاہتا تھا اور اس کے چمکدار مردار اور رنگے ہوئے چمڑے کو دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ اُپلوں کی آگ کے پاس بیٹھ کر کھن کا ایک گولا سا دھویا کرتا اور کما کرتا، سو مرتبہ جھونے سے کھن زہر بن جاتا ہے۔ میں زہر بنا رہا ہوں۔"

"لیکن آپ کا فنکشن وہاں کیا تھا شاہ جی؟" عمار نے مثبت انداز میں پوچھا۔

”میرا فنکشن کوئی خاص نہیں تھا۔ بس میں اس کا پتہ جو راتھا، سامتی تھا، ملازم تھا، کئی تھا۔ پتہ نہیں میں کیا تھا اور میرا خاص فنکشن کیا تھا، لیکن میں اس سے متاثر تھا اور اس قدر متاثر تھا کہ اس کے بعد پھر کسی سے اس قدر متاثر نہ ہو سکا۔“
 ”لیکن ہوئے کیوں؟“ مفتی نے پوچھا۔

”یہ پتہ نہیں مفتی جی میں نے کھا۔ اس بات پر میں نے کبھی غور نہیں کیا، البتہ اگر آپ مجھے ضعیف الاعتقاد تصور نہ کریں تو میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے دیکھا کہ ایک لٹ ووق صحرا ہے اور اس کے اندر خشک اور مٹییل پہاڑوں کے درمیان ایک دریا بہتا ہے۔ اب پتہ نہیں میں نے یہ خواب دیکھا تھا یا میرا ایسے ہی تصور تھا یا میں نے جاگو مٹی میں ایک فہم دیکھی تھی۔۔۔ میں اس دریا کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہوں اور میرے ہاتھ میں مٹییل پکڑنے کی ڈور کا ٹٹا ہے اور کاٹا اتنا بڑا ہے کہ کبھی میں اسے اس ہاتھ میں پکڑتا ہوں اور کبھی دوسرے میں۔ ایک بڑے سے پتھر کے سامنے دریا کے اندر مجھے بہت سی مٹییل اُچھلتی اور جھاگ اُڑاتی دکھائی دیتی ہیں۔ میں اس کانٹے کی نوکوں پر آنا چڑھائے بیٹھ جاتا ہوں۔ یہ کانٹا دراصل مٹییل پکڑنے کا کانٹا نہیں ہے، بلکہ ترشول کی طرح سے ہے یعنی اس کی تین نوکیں ایک افقی بار پر نکلی ہوئی ہیں اور آگے سے سیدھی لیکن بہت ہی تیز ہیں۔ جب ان تینوں نوکوں پر آنا چڑھا کر میں پتھر پر کھڑا ہو کر کانٹا پانی میں ڈالنے کے لیے رستی گھاتا ہوں تو یہ مجھے سے دو ٹونگ آجاتا ہے اور گھومتا ہوا کانٹا اپنے ہاتھ سے روک کر کستا ہے۔ ناں کا کا جی ناں۔“ مفتی ایس طراں نہیں بھڑی جاتی۔ ایدھر لیاؤ میزوں دیو“

میں ڈور اور کانٹا اس کے ہاتھ میں دے کر خود پتھر سے پیچھے اُتر جاتا ہوں اور دو تو پتھر کے اوپر چڑھ جاتا ہے۔ پھر وہ کچھ اس ترکیب اور اس مہارت سے ڈور گھاتا ہے کہ اصولاً ڈور اس طرح سے گھوم ہی نہیں سکتی۔ کانٹا ایک مرتبہ سطح آب پر ٹپا کھاتا ہے اور پھر ڈور کے سرے پر گھومتا ہوا میرے گریبان سے آکر چمٹ جاتا ہے۔ میں جس قدر اس ترشول کو اپنے گریبان سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی قدر وہ میرے ساتھ اور چمٹتا جاتا ہے۔ دو ٹونگ مکر لٹے جاتا ہے اور ڈور کو اپنی طرف کھینچے جاتا ہے۔

میں قدم قدم اس کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ گو میں اس کے قریب جانا نہیں چاہتا۔ اس

کے پاس آ رہا ہوں۔ گو مجھے اس سے گھن آ رہی ہے۔ اس کے بعد یہ وژن قائم نہیں رہتا اور میں آنکھیں کھول کر نغمائیں گنگنے لگتا ہوں۔ اس واقعے کا یا اس خواب کا یا اس وژن کا مجھ پر کوئی خاص بوجھ نہیں، کیونکہ ہمارا خاندان بہت اُونچے درجے کا تعلیم یافتہ خاندان ہے اور ہم میں سے کوئی بھی ضعیف الاعتقاد نہیں۔

اس وژن کے کوئی تین روز بعد میں نے دو ٹونگ کا چہرہ کچھروں والی حویلی کی اس کھڑکی میں دیکھا جو میری پیدائش سے پہلے کی بندھی تھی۔ اس کی سلاخیں ضرور موجود تھیں، لیکن اس کے چوکھٹے کو گھن کھا گیا تھا۔ میں نے دیکھا دو ٹونے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور پھر کہا ”مچھی پھڑلٹی؟“

”کون سی مچھی؟ میں نے جان بوجھ کر اُردو میں پوچھا۔

”جونسی پکڑن گیا تھا؟“

”میں نے کوئی مچھی نہیں پکڑی، میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

”پھر میں نے ناں پھڑلٹی۔ اس نے ہنس کر کہا۔ آج تیرے کو دو خاواں“

میں کچھ دیر تو بھٹکا تاں اس کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر پتہ نہیں مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ میں سرسٹ بھاگا اور گھر آکر دم لیا۔

”یہ تم اصل واقعہ بیان کر رہے ہو یا کوئی افسانہ منسا ہے؟“ لیڈر نے پوچھا۔

”ہے تو اصل واقعہ، لیکن مجھے بھی افسانہ ہی لگتا ہے۔“ میں نے کہا۔ اور حیرانی کی بات ہے

کہ گزشتہ چالیس سال میں مجھے یہ واقعہ کبھی بھی یاد نہیں آیا۔

عماد نے ہاتھ اُپر اٹھا کر کہا ”مفتی جی جرح کرنے کی اجازت ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ مفتی نے ڈانٹ کر کہا۔

”کھٹ کرنے کی مفتی؟“ مسعود نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ مفتی نے پہلے سے بھی اُونچی آواز میں حکم دیا۔

”تسکیم کرنے کی تو اجازت ہے ناں مفتی جی۔“ اعظمی نے لجاجت سے پوچھا۔

”تسکیم نہیں۔“ مفتی اور نور سے گونجا اور کہستانی حیرانی سے ہم سب کا منہ بکھنے لگا۔

میں نے پھر کتنا شروع کیا کہ سکول میں میرا دل نہ لگتا تھا۔ گھر سے مجھے خوف آتا تھا۔ قصبہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا اور کھجیوں والی جوبلی کے کھنڈر میں ایسی وحشت بھری تھی کہ اس کے ارد گرد منڈلاتے دھنسنے کو دل چاہتا تھا۔ میں خوفزدہ بھی تھا اور عشق میں بھی مبتلا تھا۔ تجسس بھی تھا اور ڈر بھی لگتا تھا جیسے کھیت کنا سے جھانسی پر کالا گھبراہٹ کو ڈالا ہو اور بھیڑوں کا ریوڑ اس راہ سے گزر رہا ہو بھیڑیں خوفزدہ ہو کر کالے گھاگھرے سے کئی بھی کاشتی جائیں گی اور اسے دیکھنے اور جاننے کی آرزو میں گزریں بھی لگھاتی جائیں گی۔ ان کا رخ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ چال بیگی ہو جائے گی اور سارا ریوڑ سیدھا چلنے کے بجائے پہلو کے رخ چلنے لگے گا۔ ایک گھاگھرے کی بدولت۔ ویسے ایک گھاگھرے کی وجہ سے بڑی بڑی فوجوں کے رخ بدل جایا کرتے ہیں۔ یہ تو بیچارے بھیڑیں ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میسر ہوئی تھی۔

ایک روز دل کڑا کر کے میں دو توٹنگ کے کھنڈر میں چلا گیا۔ وہ صحن کے درمیان پڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ کر بوٹی رہا تھا اور زندہ داند بندر سادکھائی دے رہا تھا۔ کھنڈر کی گری ہوئی دیوار کے پیچھے سے مجھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے بڑی بوٹی کا کٹورہ اپنے پیچھے چھپا لیا اور ضال نگلی کے ساتھ جلدی جلدی دانت برش کرنے لگا۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور بڑی ڈیر تک کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنی سخن والی انگلی روک کر زہ پٹی اینٹوں کی طرف اشارہ کیا اور میں چپ چاپ اس خشتی چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک ہم دونوں اس طرح خاموش بیٹھے رہے۔ وہ مکملی باندھ کر آسمان کو دیکھتا رہا اور میں اس کے ماحول اس کے ساز و سامان اور اس کی شکل و صورت کا جائزہ لیتا رہا۔

پھر وہ اٹھا اور اپنے بھٹ کے اندر چلا گیا۔ اس کا یہ بھٹ پُرانی پٹی گیرو والی اینٹوں کا ایک چھوٹا سا ڈربہ تھا جو کئی زمانے میں کھجیوں کی مرغیوں کا گھڑا رہا ہو گا۔ اس کے باہر غلاطت کے انبار تھے اور اس کی چھت ایک طرف سے اندر کو نکلی ہوئی تھی۔ بھٹ میں داخل ہونے کے لیے وہ چو پائیل کی طرح اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر اندر جاتا تھا اور اسی طرح باہر آتا تھا۔ میں بڑی دیر تک اینٹوں کی اس کرسی پر اسی طرح بیٹھا رہا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں بھی ایک بندر ہوں اور دو توٹنگ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ بندر لوگوں سے اپنا ناٹھ توڑنے

کے لیے میں نے اپنی نشست کا انداز بدلا۔ لیکن پھر بندر کا بندر ہی رہا۔ میں نے اپنی ٹانگیں آگے کو پھیلا دیں۔ پھر بھی میری تسلی نہ ہوئی۔ آخر میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر ٹھٹھنے لگا۔

صحن کے اندر جا بجا چولائی، دھتورے، پولی اور بھکڑے کے پودے اُگے ہوئے تھے دیواروں میں ادھر ادھر پتیل کے نوجوان پودے لہلہا رہے تھے اور جوتنا در ہو گئے تھے انہوں نے دیواروں کو گرا دیا تھا اور اب گرے ہوئے بنے کے ڈھیر میں ایسا وہ ہو گئے تھے۔ کوٹھڑیوں اور کمروں کی دیواریں کھڑکی تھیں لیکن سب کی چھتیں گر چکی تھیں۔ ٹوٹے ہوئے دروازوں سے بے چھت والوں کی روشنی نکلتی، دیوانی عورت کی طرح کھڑی تھی۔ نہ ادھر دیکھنے کو کجی چاہتا تھا نہ ادھر سے نظر ہٹانے کو دل کرتا تھا۔

دو توٹنگ لنگور کی طرح اپنے بھٹ سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا اور گھرے سبز رنگ کی ایک بوتل تھی۔ وہ پیک کر پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا اور گالے سے روٹی توڑ توڑ کر باریک اور لمبی لمبی پونیاں بننے لگا پھر اس نے روٹی کا آدھا گالا توڑ کر میری طرف پھینکا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ چل تو بھی بنانا۔ میں نے پہلے ہاتھ سے پونی بنانے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ پھر میں نے قریب پڑی ہوئی ایک سینک اٹھائی اور اس کی مدد سے پونی بننے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے سینک کی مدد دیتے ہوئے دیکھ کر پہلے وہ مکرایا، پھر ہنسا اور آخر میں ایک بہت بڑا قہقارہ مار کر پہلے کی طرح خاموش ہو گیا۔

”کیا سالی خوفناک تنہائی ہے؟“ غٹلی بولا۔ دیکھو اس کو۔
”کس کو؟“ عماد نے پوچھا۔

”اس کو جو یہ قصہ سنا رہا ہے۔“ غٹلی نے کہا۔ کوئی میں زندہ رہنے کے اثر آثار۔ اگر اس کو صبح بھی مان لیا جائے تو بھی اس پر یقین نہیں آئے گا۔
”لیکن شاہ جی۔ مسعود نے کھی کھی کر کے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ سالانہ سے پونیاں کیوں بٹوانے لگا؟“
”شکر کرو پونیاں ہی بڑا تارہا۔“ غٹلی نے ہنس کر کہا۔ ورنہ اس نے اور بہت کچھ بڑا لیتا تھا۔
”مر گیا؟“ غٹلی جی نے اچانک پوچھا۔
”نہیں سمر مر اکھاں تیں نے پھر کتنا شروع کیا۔ وہ تو پاکستان بننے کے آٹھ سال پہلے تک

دیں رہا پھر اس کے بعد اچانک غائب ہو گیا۔

”تہیں بھی بنا کر نہیں گیا۔ لیڈر نے پوچھا۔

”نہیں اس نے مجھے اپنے یہاں آنے جانے کی مناسی کر دی تھی۔

”اس کھنڈ میں آنے کی مناسی کر دی تھی۔ عمارت نے پوچھا۔ اس لنگور نے۔

”ہاں اس نے میری کھتی پر اپنا تیل ہاتھ جاکر زور سے دھکا دیا تھا اور کہا تھا خبردار پھر ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ مجھ سے بڑا کوئی نہ ہو گا۔

”لیکن کیوں؟“ مہنتی جی نے پوچھا۔ کس لیے۔ کیوں وہ اس قدر اگریسو ہو گیا؟

اس کا ایک شوق تھا مہنتی جی اور وہ شوق اس کو دل و جان سے پیارا تھا۔ وہ تازہ دھکی ہوئی روٹی کی پونی منی کے تیل میں تر کر کے اپنی مقعد میں رکھ لیتا تھا۔ تقریباً ایک چوتھائی اندر اد تین چوتھائی باہر۔ پھر آسمان کی طرف نکلا۔ اٹھا کر اور دونوں ہاتھ باندھ کر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا اور اپنے بڑے پھتر کے آس پاس آجاتا۔ وہاں سے ماہس اٹھا کر تیل میں سنی ہوئی کھتی جی کو دیا سلائی دکھاتا اور چینیں مارتا ہوا کھنڈ کے صحن میں چکر لگانے لگتا۔ جوں جوں آگ اُپر کو لپکتی توں توں اس کے لغرے اور چمکائے بلند ہونے لگتے۔ ان لغروں اور لٹکاردوں میں کرب بھی ہوتا اور پکار بھی، لذت بھی اور خوف بھی، خود ستائی اور جرز خوانی بھی، عاجزی اور ینیتی بھی۔ اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا اور وہ ہانپتا ہوا بڑے دالان کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی رانوں کے درمیان سے دھواں بھی نکل رہا ہوتا اور آبلوں کا پانی بھی ٹپک رہا ہوتا۔ اس وقت وہ آسمان کی طرف منہ کر کے اس طرح گڑگڑاتا جیسے جوانی میں قدم رکھنے والا بچہ راگھوڑی کو دیکھ کر پہلی مرتبہ ہنسنا یا ہر۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور پھر آہستہ آہستہ اس کے حلق سے ایسی آواز نکلنے لگتی جیسے کوئی بے چلے ہوئے گنے کی پوری ایک طرف چاقو اور دوسری طرف انگوٹھے کے دباؤ سے گول گول کاٹ رہا ہو۔

جب میں یہ بات کر رہا تھا تو ہم سب نے رستہ چلنا بند کر دیا تھا۔ مہنتی اور مسعود مجھ کو ٹٹکی باندھے دیکھ رہے تھے اور دوسرے تینوں اپنی اپنی سوئیاں سیلنے کے ساتھ لگا کر اپنے آپ کو چھیاں ڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔

کانٹا کیسا بے عمارت نے پوچھا۔

”فوک۔ جس سے کھانا کھاتے ہیں۔ پھری کانٹے والا کانٹا۔

”وہ اس سالے کے پاس کہاں سے آگیا؟“ عظمیٰ نے پوچھا۔

”بس آگیا کہیں سے تم کو اس سے کیا۔ مہنتی نے خٹکی سے کہا اور مجھے بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ تھوڑی دیر تک وہ کانٹا ہاتھ میں پکڑ کر کانٹا رہا۔ پھر کراہنے لگا اور جب اس کے حلق سے چاقو سے گندیری کھٹنے والی آواز آنے لگی تو ایک دم بجلی کی تیزی سے اُچھلا اور وہ کانٹا اس پھل کے پتے میں بھونک دیا۔ کانٹے کی چاروں آہنی انگلیاں پتے میں سے گزر کر زمین میں دھنس گئیں اور اس کا دستہ زمین پر عمود گرانے لگا۔ پھر دو خوشی کے ساتھ اُچھلا اور دائیں چرخ کسی بائیں گندے ہاتھ میں رکھ کر کھڑی ہانڈہ کا گھوٹنا بنا کر گھوڑا ہشیاری کرنے لگا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ وہ اس گھینے ہوئے کانٹے کے گرد چکر کاٹ رہا تھا اور میں خوف کے ساتھ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس دن جیسا خوف مجھے پھر کبھی نہیں آیا۔

اگلی صبح قہقہے کے لوگوں نے دیکھا بابا کریم اپنے کیمت میں اُوندھا گرا ہوا ہے اور دھڑانے والی ترانگی اس کی کمر اور پسلیوں میں سے گزر کر زمین میں دھنسی ہوئی ہے۔

ترانگی کیا۔ عظمیٰ نے پوچھا۔

”ریک نہیں ہوتی آزادے کے ای۔ ریک۔ میں نے کہا۔ کڑی کی وہ لالھی جس کے آگے فولاد کی فٹ فٹ ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کی تیز فوکیں لگی ہوتی ہیں۔

”اٹے جس سے کسان لوگ گڈ پر سے پرانی چھاپے لانا کا وغیرہ آتے ہیں جس سے دھواڑا اڑا کر جھوسہ اور دانہ الگ کرتے ہیں۔ مسعود نے بتایا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ لیڈر نے کہا۔ بڑا سا کانٹا ہوتا ہے لمبا ڈنڈا اور آگے تیز تیز فولادی انگلیاں۔

”بس بس وہی۔ میں نے کہا۔ اس ترانگی کی پانچ تیز تیز فولادی انگلیاں بالے کریمے کے

پنجر میں سے گزر کر چھ چھ پنچ تک زمین میں دھنس گئی تھیں خون مٹی میں جذب ہو گیا تھا۔ بالے

کی ایک جوتی اتری ہوئی تھی اور دوسری بدستور پیر پر موجود تھی۔

پولیس نے آکر نقشہ بنایا اور گاگر تھائی جس نے بالے کریمے سے سو روپے ادھار مانگے تھے

ایک شام بابے کریے نے دو ٹنگ کو اپنے کھیت کے قریب سے گزرتے دیکھ کر اس پر سنا ہوا ایک کر دواؤ تھا پھینکا۔ مٹا اس کے گھون مومن تیل چڑھے سر پر لگا اور چھٹ گیا۔ دو ٹنگ نے اپنے سر پر ہاتھ پیر کر چکھا تو تڑپ کر ٹھوکر دی۔ اس کے تھوڑے اجتناج پر سب مزارع کھلکھلا کر ہنس پڑے اور اپنی دائیں کہنیوں کے نیچے بائیں ہتھیلیاں رکھ کر کھڑے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے فحش طریقے پر ہلانے لگے۔ کل پانچ مزارع تھے اور پانچوں کے پانچوں قطار میں کھڑے اس طرح گھوڑا ہشیا کر رہے تھے۔ بابا کریمان کی کا کردگی دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ گواد پر اوپر سے کہہ رہا تھا: نہ کرواؤئے مُنڈی نہ کرو۔ بس جان دیو!

تھوڑی دیر تو دو ٹنگ کھڑا ان کی طرز کا نشانہ بناتا رہا۔ پھر منہ پر ہاتھ پیر کر آگے کر دوانہ ہو گیا۔ مجھے یاد ہے اس دن ہم میٹرک کے داخلے کے فارم بھر کر گھر آئے تھے اور ہوشیار پور سے ماموں نذر ہمارے لیے اور اپنی بہن کے لیے بہت ساری سوغاتیں لے کر آئے تھے۔ میرے ایک ہی ماموں تھے اور جب یہ ہمارے گھر آ جاتے تو سکول جانا، دوستوں سے ملنا کھیل میں شامل ہونا، آوارہ گردی کرنا سب موقوف ہو جاتا، لیکن اس شام ماموں مذکر کی آمد کے باوصف میں دو ٹنگ کے کھنڈر میں پہنچ چکا تھا۔ اس وقت وہ تیسری مرتبہ غلیظ لگا کر اپنی اسے نس کو برمی طرح ٹھلس چکا تھا اور کرہنہ کے بجائے مسکرا رہا تھا۔

جب میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے مسکرا کر پہلی مرتبہ مجھے دعا دی: جیتا رہے بیٹے جیتا رہے اور اگر اپنی پتھر والی نشست کے قریب زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے دو اینٹوں کے درمیان سے ٹپل کا ایک پڑمڑہ پٹا نکالا اور اس کو اپنے سامنے زمین پر رکھ کر گھونے لگا۔ پھر مجھے سلور کا کنورہ دے کر سر کے اشارے سے پانی لانے کے لیے کہا۔ میں اس کی ٹوٹی ہوئی ٹھلیا سے پانی لایا تو وہ پتے کے دونوں جانب پاؤں رکھ کر بوں بیٹھ گیا جیسے تہچے پر بیٹھتے ہیں۔ پھر اس نے گورے کا پانی اپنے سر پر ڈالنا شروع کیا جو بائیک سی تلتیوں کی شکل میں اس کی پیٹھ اور پہلوؤں سے بہہ گیا۔ گویا وہ اس پتے پر بیٹھ کر نہا گیا۔

جب یہ عمل ختم ہو گیا تو اس نے مجھے کھڑے ہونے کے لیے کہا۔ میں چپ چاپ کھڑا ہوا۔ اس نے تھراؤ نہنگا ہوں سے میری طرف دیکھا اور اپنے پتھر کے نیچے سے ایک کانٹا نکال لیا۔

اور نہ ملنے پر سواد چکھانے کی دھکی دی تھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد میں بھاگا بھاگا دو ٹنگ کے اڈے پر پہنچا تو اس نے اپنا تیلیا ہاتھ میری کھتی پر جاکر زور سے دھکا دیا اور کسا خبردار پھر ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ مجھ سے بُرا اور کوئی نہ ہوگا۔

اور یہ جو آدمی ابھی ہمارے قریب سے گزر کر گیا ہے اور جس نے ہمارے سلام کا جواب نہیں دیا مجھے دو ٹنگ لگتا ہے، حالانکہ اس کی عمر اس سے کم ہے۔ اس کی جلد اس سے ملائم ہے اس کے سر اور چہرے پر گنے بال ہیں۔ پھر بھی یہ مجھے وہی لگتا ہے۔

مسعود، د، اعظمی، عمر اور مفتی گزریں لمبی کر کے نیچے جاتے ہوئے نقطے کو غور سے دیکھنے لگے کہ شاید اس کی رانوں کے درمیان سے مثیلا دھواں اُٹھ رہا ہو۔

دو ٹنگ کے واقعے نے ہم سب کو تھوڑی دیر کے لیے خاموش کر دیا۔ اصل میں واقعہ بیان نہ بھی ہوتا تو بھی ہمیں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ضرور ہو جانا تھا۔ لنگٹو کے بعد خاموشی آپ ہی در آتی ہے۔ جنگوں میں بھی جب دونوں طرف سے شدید گولہ باری ہوا کرتی ہے، تو ایک وقفہ خاموشی کا آ جاتا ہے۔ کہ سن کر یا کسی وقت مقررہ پر نہیں، بس یوں ہی، بغیر سوچے سمجھے، بغیر جھنڈی ملائے کسی کاشن یا آرڈر کے بغیر، بنا سوچے سمجھے، طوائف اور تماش بین کے درمیان بھی خاموشی کا ایک طویل لمحہ آ جاتا ہے۔ بستی ہوئے پُرتھوڑا پانیوں میں بھی اچانک سکوت آ جاتا ہے۔ شاید آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ایک ساتھ جلتی ہوئی بہت سی شینیں بھی ایک وقت خاموش ہو جاتی ہیں، حالانکہ وہ چل ہی ہوتی ہیں، لیکن آپ کو ان کا شعور نہیں ہوتا۔

ہم چلے جا رہے تھے اور خاموش تھے، جیسے نوجوان گایوں کے گھنے میں اُدچی کوہان اور مضبوط پتھے والا سا نڈچکا کرتا ہے اور اس کے گھٹے کی جھال میں آدھے پونے جھنور سے پڑا کرتے ہیں۔

اچانک ایک مضبوط، دل دار، سرسبز اور وزنی پتہ لیڈر کی گردن پر لگا رہا۔ وہ تڑپ کر اُچھا اور اُس کے مُنہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔

ہمارا لیڈر بھی دوسرے لیڈروں کی طرح بزدل اور عالم ہے۔ وہ اندر سے مسلسل رزنا رہتا ہے اور باہر سے ہر ایک کی سرزنش کیا کرتا ہے۔ اس کا قد چھوٹا، بدن مضبوط اور آنکھیں تیز ہیں۔

دستی اور ڈسپلن کا قائل ہے اور اس کے ہاتھ کی چھڑی کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ہم نے مشقہ رائے سے اس کو اپنا لیڈر بننا ہے اور اگر ہم اسے اتفاق رائے سے ذمہ بھی پھینتے تو بھی وہ ہمارا لیڈر ہوتا، کیونکہ اس میں ایک اچھے لیڈر کے سبب خصائص موجود ہیں اور ایسے خصائص والا آدمی لیڈر بنے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مسعود نے گھر کر پوچھا:

”کیا ہوا لیڈر، کیا ہوا؟“

تولید نے اپنی گڈی پر ہاتھ رکھے رکھے اسے یوں گور کر دیکھا جیسے لیڈر غصے کے وقت دیکھا کرتے ہیں۔

”کچھ تھا، بہت وزنی، اس نے آہستہ سے کہا۔“ جیسے کوئی پنجہ ہو۔“

”لوجناب! یہ پنجہ ملاحظہ فرماؤ،“ اعظمی نے جھپک کر زمین سے وہ پتا اٹھالیا اور ہم سب کی نظروں کے سامنے گھما دیا: ”دیکھا آپ نے یہ فولادی پنجہ۔ گریباں گیر، جو ہماری قیادت کی گردن سے چپٹ گیا“

”اور قیادت یوں اچھلی تھی جیسے سانپ کی دم پر پیرا گیا ہو۔“ مسعود نے ہنس کر کہا۔

عماد نے وہ پتا اعظمی کے ہاتھ سے لے کر بغور دیکھا اور پھر مفتی کو دیتے ہوئے بولا: ”ہو سکتا ہے مفتی جی، یہ ویسا ہی پتا ہو تو ملنگ والا“

”کیوں نہیں کیوں نہیں“ مفتی بولا۔ ”ہر پتے کی ایک اپنی ملنگ فیلڈ ہوتی ہے۔“

عماد نے ہنس کر کہا:

”آپ کے خیال میں یہ پتا ریڈیو ایکٹو ہے۔“

”جی جناب!“ اعظمی سنجیدگی سے بولا۔ ”اگر یہ پتا چارجڈ نہ ہوتا، تولید اس طرح سے کیوں اچھلتا بھلتا۔“

نباآت کی زندگی کے کچھ پہلو حیوانی زندگی سے بھی کڑے ہوتے ہیں۔“

”ہاں جی، مسعود نے کہا۔“ اس کو معلوم ہے اچھی طرح سے۔ یہ خود برسیم کی سنڈی رہ چکا ہے، ریڈیو میں آنے سے پہلے۔“

کوہستانی نے حیرانی سے اعظمی کی طرف دیکھا۔ سارے سفر کے دوران میں اس کا یہی خیال تھا کہ اعظمی بھی ہماری طرح کا انسان ہے، لیکن مسعود کی بات سے وہ تذبذب میں پڑ گیا اور آہستہ سے پوچھنے لگا:

”کون؟ یہ صیب؟ عینک والے؟“

”بالکل خان! یہی۔“ مسعود نے جواب دیا۔ ”یہ پہلے سنڈی ہوتا تھا۔ پنیر کی دغا سے آدمی بن گیا۔“

”سبحان اللہ جی!“ کوہستانی نے اپنا ہاتھ چوم کر ماتھے پر رکھا اور سر ہلا کر کہا: ”وہ تو اللہ کے فضل سے جو چاہے کر سکتا ہے۔“

”یہ تو خیر کو کس کرتے ہیں خان!“ اعظمی نے پتا سونگھ کر کہا۔ ”لیکن درختوں میں اور پتوں میں اور ٹوٹوں میں بھی ہماری طرح سے جان ہوتی ہے۔“

”پہلے نہیں ہوتی تھی صوب!“ کوہستانی نے کہا۔ ”پر جب حضرت زکریا علیہ السلام نے بھاگ کر درخت میں پناہ پکڑی اور ظالم کافروں نے تنے کے ساتھ ان کو بھی چیر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے کہا صبر کرو۔۔۔ صبر کرو زکریا۔ اب نہیں بولنا۔ شور نہیں مچانا اور حضرت زکریا نے صبر کیا جی، تو پھر سارے درختوں میں جان پڑ گئی۔ ان کا روح ہے جی، پیغمبر علیہ السلام کا ان میں۔“

”شاباش!“ اعظمی نے کہا۔ ”تم تو پیغمبروں کے راز سے بھی واقف ہو اور ان گھروں کو دیکھو سب پڑھ لکھ کر بڑا دکھ دیا۔“

مفتی نے کہا:

”دیکھو یار! اس علاقے کی اکو لوجی کس قدر مختلف ہے۔ کوہستانی بھی ایسے بول رہا

ہے جیسے ڈاکٹر یونگ بات کر رہا ہو۔ ہے ناں پریوں کا اور طلسم کا راج اس علاقے میں!

ہم چل تو رہے تھے، لیکن لیڈر بار بار اپنا ہاتھ گڈی پر لے جاتا تھا، حالانکہ پتا ابھی تک اعظمی کے ہاتھ میں تھا۔

”اس پتے پر“ اعظمی نے کہا۔ ”بڑی ضد ہے، ڈنڈی سے پکڑ کر مروٹی دو، تو ایک آدھ بھیری سے زیادہ نہیں کھومتا۔ واپس مڑتا ہے، بلا ہٹ دھرم ہے۔“

”پھر؟“ عماد نے پوچھا۔

”پھر کیا!“ اعظمی بولا۔ ”دوسرے جانداروں کی طرح اپنی انفرادیت رکھتا ہے اور ابھی تک اس میں زندگی کی ثبوت باقی ہے۔“

”ساتھ جذبہ خودی بھی رکھتا ہے“ میں نے کہا۔ ”زنا دہری برکاس نہیں ہے۔“

”اب تم لوگوں کو تو مذاق مٹھو رہا ہے۔“ اعظمی نے خشکی کے ساتھ کہا۔ ”یہ مسکوس کرنے والی چیز ہے، تمہارے جیسی گھماڑ نہیں ہے۔“

منفی نے کہا:

”اس معاملے میں اعظمی کے ساتھ بھڑنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ اس کی فیصلہ

ہے....“

”اور اس میں یہ جب چاہے باؤنس پھینک سکتا ہے۔“ مسعود نے بات کاٹی اور سب ہنسنے لگے۔

پتا ابھی تک اعظمی کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کو مروٹیاں دے رہا تھا:

”یہ دیکھو منفی... یہ دیکھو“ اس نے منفی کو پتے کی سربانی دکھائی اور منفی یونی اس کا

دل رکھنے کو ”باں ہاں! کیوں نہیں، کیوں نہیں“ کرنے لگا۔

ہم چلے جا رہے تھے اور اعظمی کہہ رہا تھا:

”یہ دووں کی بھی اپنی پسند اور ناپسند ہوتی ہے۔ اس وقت اسے میں سخت ناپسند ہوں اور میرے جوہر حیات کی لہروں سے یہ پتا گھبرا یا اور بھٹایا ہوا ہے اور ابھی کوئی ہاتھ اسے متھام لے، تو شاید اس کی بے چینی اور سرکشی دُور ہو جائے۔“

”وہ ہاتھ نیچے رہ گیا۔ بہت نیچے۔ آبادی میں۔ ہمارے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں جس سے اس کا دل مل جائے۔ فی الحال یہ تمہارے پاس ہی ٹھیک ہے۔“

عماد نے کہا:

”منفی صاحب! اسے آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ آپ ہم سب میں زیادہ بزرگ

اور حاجی ہیں۔“

”ناں ناں منفی ناں!“ لہڈ چنیا۔ ”تم اس کے نزدیک نہ جانا۔ چند مارے گا۔“

منفی نے ہنس کر کہا:

”مجھے معلوم ہے۔ میں زندگی میں ہر پھول اور ہر پتے سے چندیں کھا چکا ہوں۔ میں اس کے

نزدیک جاتا ہوں مہل!“

اعظمی نے کہا:

”کپاس چننے والیاں ہمیشہ عورتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں، ولایت میں، امریکہ میں

کوئی مرد یہ کام نہیں کر سکتا۔ کپاس کا پھول مرد کا ہاتھ پسند نہیں کرتا۔“

منفی رگ گیا۔

”وجہ یہ ہے منفی کہ مرد کے ہاتھ کی ویو اور کپاس کے پھول کا جوہر حیات ایک دوسرے

کے بالکل الٹ ہیں۔ چھٹی کوکھے سے باہر نہیں نکلتی۔ زور لگاؤ، تو آدمی کوئے میں جھٹی رہ جاتی ہے۔

کچھ زمین پر گر جاتی ہے۔ نکل آئے، تو سوکھی شاخوں میں چنسن جاتی ہے۔ میں نے ملتان اور

نواب شاہ کے کسانوں سے پوچھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رُردنی کو خراب کرنا ہو تو مردوں کو چھٹی

چننے کے لیے کھیت میں داخل کر دو۔“

”وہ تو اس لیے ہوتا ہے میرے بھائی کہ عہد امانے کہا۔“ ایک تو عورتوں کے ہاتھ جھوٹے اور انگلیاں باریک ہوتی ہیں۔ دوسرے انہیں اجرت کم دینی پڑتی ہے۔ تیسرے ملتان اور نواب شاہ کے مرد ویسے بھی سست ہیں“
منفی نے کہا:

”یہ سب کچھ اسی لوگ ہیں اعظمی۔ تو مجھے بتا“
”اور اس میں ذرا انصاف تو کچھ لگا دینا۔ مسعود نے منہس کر کہا۔ ”کچھ ذرا ٹیڈ کی تھیوری بھی لگا دینا کسی پودے کے ساتھ۔ بد نظری اور بد فعل کی“
”بالکل! اس میں کیا جھوٹ ہے؟“ اعظمی نے کہا۔ ”گہٹے اس بات کا ثبوت بہم کرنا، تو ختم ہو گیا بیچارہ“

”گوٹے“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ ہمارا جرمنی والا۔ فاؤسٹ کا مصطفیٰ!“
”جناب!“ اعظمی نے چیخ کر کہا اور اس کی چیخ خاموشی میں خوف بن کر گونجی۔ ”وہی۔ شاعر، ناول نگار، فلسفی، آپ کی جرمنی والا۔ آپ ہی کے اٹلی میں جا کر دو سال رہا اور وہیں اس نے اعلان کیا کہ پودوں میں بھی زراعت ہے اور ان میں بھی جھوگ ہوتا ہے۔ لمبی ایستادہ ڈنڈی نہ ہوتی ہے اور گھومتی بل کھاتی ڈنڈی مادہ ہوتی ہے۔ پودا ہماری دنیا میں زندگی کا واحد ترجمان ہے، جس کی مادہ اندھیرے میں بڑھتی بھاتی اور بھولتی ہے اور کوشش ثقل کے خلاف چلتی ہے اور اس کا زہری آپ کی اور دوسرے جانداروں کی طرح روشنی میں پلتا ہے اور کوشش ثقل کے مطابق چلتا ہے“

اعظمی کی یہ بات سن کر ہم سنجیدہ ہو گئے۔ کہنے لگا:
”گوٹے کو نیوٹن سے تو یہی شکایت ہے کہ اس نے گریویشن کی بات تو کی، لیکن لیوینش کی بات نہ کر سکا“

”لیوینش کیا!“ ہم سب نے ایک ساتھ پوچھا۔
”کوشش ثقل کے خلاف اٹھنا“ منفی نے کہا۔ ”جیسے یوگی بنیر کسی مادی مدد کے زمین سے اُپر اٹھ جاتے ہیں، جیسے اولیاء اللہ ہوا میں اُڑ کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ

جاتے ہیں“

اعظمی نے کہا:

نیوٹن نے یہ تو دیکھ لیا کہ سیب اُپر سے نیچے گر کر، لیکن یہ نہ معلوم کر سکا کہ اُپر کیسے چلا گیا، درخت پر“

”ہے کہ نہیں گدھا“ لیڈر نے کچھ کر کہا۔ ”سیب درخت کو زلگتا، تو اور تیرے باپ کو لگتا“

منفی نے کہا:

”تم آگے بات کرو اعظمی! یہ بے وقوف لوگ ہیں، ایسی باریک بات کو نہیں سمجھیں گے“

”دیکھیں منفی جی!“ اعظمی نے کہا۔ ”جس طرح کوشش ثقل کی فیلڈ سے دُور ہونے پر آہستہ آہستہ اس کی کینچ کم ہونے لگتی ہے اور وہ کمزور ہونے لگتی ہے، اسی طرح لیوینش کی فیلڈ سے نکلنے پر اس کی اُٹھانے کی طاقت کم ہونے لگتی ہے کوشش کا مرکز اندر ہے، لیوینش کا باہر ہی وجہ ہے کوشش کی وجہ سے چیزیں گرتی ہیں اور لیوینش کی وجہ سے اُٹھتی ہیں“

”کیسے کیسے کیسے“ عہد امانے پوچھا۔

”گویا گریویتی کا مرکز زمین میں ہے“ منفی نے کہا۔ ”اور لیوینش کا کاسمک ورلڈ میں“
”شاباش!“ اعظمی کا چہرہ فرط مسرت سے ہلکھلا اُٹھا۔ اس نے منفی کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”دیکھو، منفی جی! طوفان، بادل، باراں، سیلاب، گریویتی کی وجہ سے زمین کی طرف کھینچتے ہیں اور آتش فشاں مادہ لیوینش کے زور پر اُدھڑا آسمان کی طرف پلکتا ہے“
پتہ نہیں اعظمی کی بات کہاں تک درست تھی اور اس نے بھول جمع کرتے کرتے یہ علم کدھر سے سیکھ لیا تھا۔ ہم خاموش ہو گئے۔

عہد امانے تک اس مسئلے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی چھڑی اعظمی کے کندھے پر ماری اور کہا:

”تمہارا مطلب ہے یسوی کا مرکز ایتھر ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا، اعلیٰ نے کہا۔“ لیکن اس قدر ضرور کہوں گا کہ جہاں گریوٹی کی پُل (PULL) کم ہونے لگتی ہے، وہیں سے یسوی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔“

”یہ بھی آیا مفتی کی لائن پر!“ مسعود نے منہس کر کہا۔ ”پتہ نہیں لوگ آخری عمر میں مفتی کی نقل کیوں آتا رہنے لگ جاتے ہیں، حالانکہ ساری زندگی اس کا سارا زور جنس پر رہا ہے۔“

”اپنا نہیں!“ اعلیٰ نے شرارت سے کہا۔ ”اس کے علم کا“

مفتی نے ایک لمبی سانس لی اور رک کر بولا:

”اب میں تم جیسے جاہل لوگوں کو کس طرح سے سمجھاؤں کہ یہ جنس، محبت، معرفت، عبادت ایک ہی حقیقت کی مخصوص کر دہیں ہیں۔ کبھی ان کے درمیان خط کھینچ جاتا ہے۔ کبھی نہیں کھینچتا۔ کبھی کسی حصے سے ایک مخصوص خوشبو آنے لگتی ہے، کبھی نہیں آتی۔ لیکن زیادہ کیفیت گھٹی ملی سی رہتی ہے، جیسے گلاس کے اندر برف کی ذلی۔ الگ بھی ہوتی ہے اور پانی کا ایک حصہ بھی — الگ سے دیکھو تو کنارہ رہتی ہے، لیکن پانی میں جھوڑ دو، تو کنارہ نظر نہیں آتا۔ جو گھل رہا ہو وہ پانی ہے۔ جو نظر آ رہا ہے وہ ذلی ہے۔ کچھ لوگ ذلی کو جنس کہتے ہیں، عبادت کو پانی سمجھتے ہیں اور جہاں کو معرفت تصور کرتے ہیں، لیکن ہے ایک ہی بات۔ سب شانیں سرکاری ہیں!“

”کچھ ڈی ایچ لارنس کا سا فلسفہ ہے یہ۔“

”اوئے لارنس کے باپ کا ہے گدھے“ مفتی چکر کر بولا۔ ”اس سے بہت پہلے دنیا کے مختلف حصوں میں جنس کی اور فیلس کی پڑ جا ہوتی رہی ہے۔ آج بھی سارا یورپ تختہ تراکی طرف لوٹ رہا ہے۔“

”تنتر!“ عماد نے حیرت سے پوچھا، تو لیڈر کو غصہ آگیا۔ اس نے جھڑک کر کہا۔ ”جنتر منتر تنتر نہیں سنا؟ ہم نے ایک پروگرام نہیں کیا تھا اس پر!“

”یہ وہ تنتر نہیں کھوتے!“ مسعود نے کہا۔ ”یہ دوسرا تنتر ہے مفتی والا۔“

”بھائی جی!“ مفتی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”اگر جنسی اتصال کو پاکیزگی کے ساتھ

اور تمام لوازمات تقدس کو ملحوظ رکھ کر عمل میں لایا جائے، تو اس سے ایک روحانی برقی قوت پیدا ہوتی ہے۔“

”کس میں؟“ لیڈر نے بے چینی سے پوچھا۔

”کسی شخص میں نہیں، مفتی نے کہا۔“ ماحول میں گرد و پیش میں۔ تمام اجسام موجود ہیں۔ اس سے وہ الغاریز مرض وجود میں آتی ہیں جو روح کی بالیدگی کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اگر انسان پورے تیس منٹ اسی حالت میں پرسکون، خاموش، چپ چاپ اور بے حس و حرکت رہے تو اٹھائیسویں منٹ پر ایک زروانی ٹھک ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے لازم شرط پاکیزگی کی ہے اور فریقین کا مظہر زوج ہونا ضروری ہے۔ خدا جانے کہاں تک درست ہے، لیکن میں نے پبلک لائبریری کی ایک کتاب میں دیکھا تھا، سن سنائیس میں۔ مجھے اس کی تفصیلات اچھی طرح سے یاد تھیں، لیکن ان دنوں لاسور میں بہت سے ٹامی لوگ تانگوں میں گھوما کرتے تھے۔ جن میں سے ایک کے ساتھ میری جھڑپ ہو گئی تھی اور اس نے میری ٹھوڈی پر زور کا مگما مارا تھا۔“

”اور تو نے کچھ نہیں کیا۔“ لیڈر نے غصے سے کہا۔

”آئریز کا زمانہ تھا۔ جنگ نئی نئی ختم ہوئی تھی اور بھڑیں ان سے کڑورتھا۔“

یہ اس زمانے کی بات ہوگی جب مفتی قصور میں اسکول ماسٹر تھا اور اس پر کئی مقتلات بنے ہوئے تھے اور اس کا اس بھری پڑی دنیا میں کوئی بھی دوست نہ تھا۔

اعلیٰ نے کہا:

”مفتی! پورے دوں میں یہ اتصال بڑی پاکیزگی سے ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے پھولوں اور پھلوں کی کثرت اور ان کے دالوں کا شمار دوسری ساری مخلوقات سے زیادہ ہے اور ہر طرح سے مفید ہے۔ پاکیزگی اپنے لیے بھی نعمت ہے اور ماحول کے لیے بھی خیر کشیدہ کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان اور حیوان اس نعمت سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شریعتوں میں بعض جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے اور بعض کو نجس۔“

عماد کو یہ بات درست معلوم ہوئی اور وہ بڑی حد تک خاموشی کے ساتھ انہات میں سر

ہلاتا رہا۔ اچانک کو سب تاتی ہماری ٹکڑی سے یوں رہتا جیسے اس کو بارود دھگ گئی ہو۔ اس نے سامنے کے دو تین بڑے پتھروں پر اپنے قدم جمائے اور پہاڑ پر پندرہ بیس فٹ اونچا چڑھ گیا۔ ایک چھوٹے سے نشان پر پانی رسنے کی وجہ سے کائی پیدا ہو چکی تھی اور وہاں لگوڑے کی شکل کی نباتاتی جھڑیاں ہی کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک پھول تھا جسے کوہستانی نے پہلے اونچی آواز میں السلام علیکم کہا، پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر کچھ دعا مانگی اور وہ پھول توڑ لیا۔ جس تیزی کے ساتھ وہ اونچائی پر چڑھا تھا اسی سرعت سے واپس آگیا اور اپنی محبت اور عقیدت کا یہ ٹکڑا غلٹی کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ عجیب سا پھول تھا۔ لمبا ڈنٹھل، عام پنسل کے گھیر کا۔ لگے ایک بیضوی سرسبز گانٹھ کسی قدر ملائم، اس کے بعد سبزی نال پیلے رنگ کی پٹیوں کی ابتدا جو درمیان میں جاکر نیشی ہو گئی تھی اور آخر میں ان کی نوکوں میں ایک سیاہ گول کنارے کے ساتھ مل گئی تھیں۔ یہ سیاہ کنارہ کیسٹ کے ٹیپ جتنا چوڑا تھا اور کافی مضبوط نظر آتا تھا۔ اندر سندھوری رنگ کا ایک چھوٹا سا انگشتانہ تھا، جس میں چھوٹے چھوٹے بے شمار سوراخ تھے۔ اعظمی نے اس پھول کو غور سے دیکھ کر کہا:

”نینا فلور ہبرٹیم اس ہے“

میرا مطلب ہے اس نے کچھ اس قسم کا نباتاتی نام لیا تھا اور ہم اس کے علم نباتات کے آگے خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے۔

کوہستانی نے کہا:

”اس کو لبم اللہ کر کے نور سے سوکھو صیب!“

جب اعظمی سونگھنے لگا، تو کوہستانی نے اس کا ہاتھ روک لیا اور پھر بولا:

”سونگھتے وقت قل ہو اللہ شریف پڑھنی ہے اور ایک ہی سانس میں“

”اس کا کیا فائدہ؟“ اعظمی نے زحج ہو کر پوچھا۔

”بس ہو گاناں یاد کرنی!“ مفتی نے کہا۔ ”جو وہ کہتا ہے کو، اپنا علم ہر جگہ نہ اپلائی کیا کرو؟“

اعظمی نے وہ پھول مطابق ترکیب استعمال سونگھا اور پھول مسودہ کو دے کر بولا: ”کچھ بھی

نہیں۔ سالے میں کوئی خوشبو ہی نہیں!“

مسعود نے سونگھا۔ تو اس نے بھی بے خوشبوئی کا اعلان کیا، پھر ہم سب نے باری باری اس کو سونگھا اور مفتی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے پھول ہاتھ میں لیے بغیر بڑی متانت سے کہا:

”اب میرے سونگھنے کی کیا ضرورت رہ گئی ہے۔ ٹھیک ہے۔ نہیں خوشبو تو نہ سہی۔“

پہلے اعظمی زمین پر بیٹھا، اس کے بعد مسعود اور پھر ہم سب۔ کوئی چکر لڑی مار کر، کوئی ٹانگیں آگے پھیلا کر، کوئی پتھر سے ٹیک لگا کر۔ صرف مفتی اور کوہستانی کھڑے تھے اور ہمارے سامنے نیچے کی وادی ڈھانی تین ہزار فٹ نیچے، چھوٹے چھوٹے درختوں اور نچے نچے پہاڑی ٹیلوں والی، آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہی تھی، جیسے کھار کا گھومتا ہوا چاک آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگے۔

وہ اوپر کچھ چڑھ رہی تھی اور جہاں ہم بیٹھے تھے وہ زمین نیچے کو جا رہی تھی جیسے اوپر کی منزل سے لفٹ نیچے کو جایا کرتی ہے، لیکن ان دونوں مخالف حرکات کے باوجود سارا منظر جوں کا توں ہمارے سامنے موجود تھا۔

اعظمی نے کہا:

”بارش آ رہی ہے“

”ہاں آ رہی ہے“ لیڈر نے جواب دیا۔

”کہاں؟“ مسعود نے پوچھا۔

”وہ... وہ... نیچے“ اعظمی نے جواب دیا۔

عماد ہنسنا اور سر جھٹک کر بولا:

”بیوقوفو! بارش کبھی نیچے سے اوپر کبھی ہوتی ہے“

لیڈر نے کہا:

”دیکھو تمہارے سامنے ہے۔ کس قدر زبردست پھوارا اٹھ رہی ہے اوپر کو؟“

اعظمی نے کہا:

میں۔

اور اس وقت میرے سامنے کرنل دیال کے لان کے سارے تنکے اپنی اصل حالت میں موجود تھے۔ سارے مہمانوں کے چہرے میرے سامنے تھے۔ مہجر آفندی کی پنی کیپ کرسی کی بیک سے گر گئی تھی، تو مہجر نے اسے اٹھا کر جھاڑا تھا۔ تین مرتبہ زور سے چٹونک ماری تھی اور پھر اس کو وہیں ٹانگ دیا تھا جہاں سے گری تھی۔ ایک ہیرے کے پاس فینے کا جگ تھا اور دوسرے کے پاس تام چینی کا تام چینی کے جگ سے ایک چھوٹی سی چتر اتری ہوئی تھی اور اس نشان کی شکل چنگبرے خرگوش کے منہ سے ملتی تھی۔ ایک افسر کی بیوی بہت کالی اور بہت موٹی تھی اور اس نے بیگنی رنگ کی ساڑی باندھی ہوئی تھی اور اس کے بلاؤز پر جا بجا پسینے کی ہاؤ لیاں تھیں۔

کوٹھی کے برآمدے میں کچھریل کی چھت کے نیچے ایک چھپکلی دیوار پر کپڑے کوڑے پھیر بھگے پڑ رہی تھی اور اس کی دم گئی ہوئی تھی۔ کرنل محی الدین بید والی لمبی آرام کرسی میں لیٹے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی ایک ٹانگ کرسی کے چپے اُم پر رکھی ہوئی تھی۔ ان کے فل بوٹ کا چڑو بہت سخت نظر آتا تھا اور ان کی اونی جرابیں نئی اور فریش تھیں۔ کرنل محی الدین کی خاکی پتلون کی گدہری بہت تنگ تھی اور وہ گول لیٹے ہوئے تھے جیسے ان کی پتلون کی جیب کے آخری کونے میں صابن کی ایک ٹمکے ہو۔

اتنے سالوں کے بعد آج، اس وقت، سیف الملوک کے راستے میں زمین پر بیٹھے ہوئے مجھے کرنل دیال کی لڑکی اس ڈنر پارٹی میں ہر چیز سے حسین دکھائی دی۔ اس کی ماتا مرچلی تھی اور آج کے ڈنر کا سارا انتظام پر میلانے کیا تھا۔ پر میلانے نیلی زمین پر سفید ٹمکوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور اس کی آستین اس کے بازوؤں میں گہبی ہوئی تھیں۔ ہائیں آستین کے باہر ڈیڑھ دان چھپک کے ٹیوں کا نظر آتا تھا۔ باقی کا ڈیڑھ آستین کے اندر تھا۔ پر میلانے کا رنگ اپنے والد کی طرح صاف تھا کیونکہ وہ ایک کشمیری پنڈتانی کے بیٹے تھے۔ پر میلانے کے دونوں اُبرو مہربوں کی طرح تھے، کیونکہ وہ کہاٹ میں پیدا ہوئی تھیں اور اُن کا گھر مسجد کے بہت قریب تھا۔ اس کی کلائی برسوں کی ایک چھوٹی سی گھڑی تھی، کیونکہ وہ ایم بی بی ایس کے آخری سال میں

”اولے بھی اچیل رہے ہیں کیس کیس“

عماد نے غور سے دیکھا، تو کھسینا ہو کر بولا:

”واقعی یار! یہ عجیب فنونہ ہے۔ ہم اس کو جلد پکڑ لیں گے راستے میں۔“

”لیکن ہم تو اوپر جا رہے ہیں“ مسعود نے کہا۔

”اوپر!“ اعلیٰ حیرت سے بولا: ”اوپر تو ہمیں جانا تھا۔ تمہیں بھی تو جانا تھا عماد“

”میں کب کتا ہوں کہ نہیں جانا تھا“ عماد نے کہا۔ ”لیکن اب ہم تھک کر خود ہی نیچے

جا رہے ہیں۔ آپ سے آپ“

لیڈر اپنی دونوں ٹانگیں راستے میں پکڑ کر بیٹھا تھا اور اپنے بوٹ کی ٹو پریاں

مار رہا تھا۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم سب راستے میں بیٹھے تھے اور مفتی اور اس کا کوہستانی ہمارے سامنے کھڑے ہم کو دیکھ رہے تھے۔ مفتی کچھ حیران اور کچھ متردد تھا اور کچھ خوش بھی تھا اور کوہستانی ہنس ہنس کر اسے کچھ بتا رہا تھا۔

مجھے صرف اس قدر یاد تھا کہ میں وہاں راستے میں بیٹھا تھا اور میرے ساتھ میری پارٹی کے دوسرے دوست بھی بیٹھے تھے، لیکن اس کے آگے پیچھے اور کچھ نہیں تھا۔ صرف بارہ مئی سن اکتالیس کی جالندھر چھاؤنی تھی اور اُس کے اندر اٹھارہ بیس کنل کی ایک کوٹھی تھی اور اس کوٹھی کے سامنے والے لان پر ایک ڈنر تھا جو کرنل دیال نے اپنے ساتھی افسروں کو دیا تھا۔ ان افسروں میں میرا ڈاکٹر مہنوئی بھی تھا جو کرنل صاحب کے پُزور دار اصرار پر مجھے بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اس سے پہلے کی کوئی زندگی نہ تھی۔ اس کے بعد کی کوئی زندگی نہ تھی۔ اُس پاس کچھ نہیں تھا۔ بس جالندھر چھاؤنی تھی اور وہ شام تھی اور میرے سامنے دو آدمی کھڑے تھے ایک مفتی اور دوسرا کوہستانی جس کو ہم نے مفتی جی کے اٹھانے پر بائیر کیا تھا۔

مجھے اپنی ساری زندگی یہ واقعہ کبھی یاد ہی نہ آیا تھا۔ جالندھر چھاؤنی تو ایک طرف میرے ذہن سے سارا ہندوستان نکل چکا تھا اور اب وہاں ماضی کی کوئی چیز بھی محفوظ نہ تھی۔ نہ شور میں، نہ لاشعور میں، نہ تحت الشعور میں، نہ بے شعور میں، نہ وقوف میں اور نہ بے وقوف

پڑھتی تھی۔ اس کی آواز کے سارے سر کو مل تھے، کیونکہ وہ چھوٹی ہوتی زرداد خان کی بچیوں کے ساتھ مل کر لڑتیں پڑھا کرتی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی اور میرے اس کی آنکھ کا براہ راست سمجھ رہے تھے۔ اس کے پاؤں میں جبرے کے بہت ہی پتلے تلے والی چپیلیاں تھیں اور اس کے دونوں ٹخنوں پر دو چھوٹے چھوٹے پورے چاند طلوع ہو رہے تھے۔

اس وقت پورے پتیس برس بعد مجھے اس کا نام بھی یاد آ گیا تھا۔ اس کا اندازِ نشست بھی سامنے تھا۔ اس کے فقرے بھی سُنانے دے رہے تھے (کانوں میں گونج نہیں رہے تھے) سامنے سے سُنانے دیتے تھے) اس کی کرسی کی پشت پر تیل کی ایک چھوٹی سی اُبھری ہوئی کیل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس ٹیبل کلاتھ کا کلف بھی محسوس ہو رہا ہے جہاں میں نے پانی پنی کر اپنا گلاس رکھا تھا۔

داوی ابھی تک اسی رفتار سے اُوپر کو اٹھ رہی تھی، لیکن ہم تک نہ پہنچ پائی تھی۔ ہم اسی تیزی سے لفٹ کے ذریعے نیچے کو اتر رہے تھے، لیکن اتر نہ پائے تھے۔ دونوں شخص ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں ایک مفتی تھا اور دوسرا کوہستانی جو ہم نے مفتی کو اُٹھانے کے لیے ہائیر کیا تھا۔ لیڈر کی پسری ہوئی ناگئیں پہلے سے لمبی ہو گئی تھیں، لیکن اس کی سوئی اتنی ہی تھی اور اب وہ اپنے گھٹنوں پر سڑیاں مار رہا تھا۔

میں باہر لان سے اُٹھ کر کوٹھی کے برآمدے میں گیا، جس کے ایک کونے میں غسل خانہ تھا۔ تینوں کو ڈول کے دھکنے بند تھے اور بس پاٹ لبالب بھرا ہوا تھا۔ میں اسی طرح واپس آ گیا اور برآمدے کے دوسرے کونے سے کوٹھی کے پیچھے نکل گیا۔

پیچھے سرونٹ کو اترنے کی ایک لمبی قطار تھی جن کی جتیں گر چکی تھیں اور دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں مرمت شدہ کچن تھا جس کے اندر بٹی بل رہی تھی۔ اس کے پہلو میں سرونٹ کو اترنے کے کھنڈرات کے پیچھے ایک ویران سا میدان تھا جس میں رہٹ کی ایک بڑی آہنی جرنی پڑی تھی۔ اس کے قریب رنگ آلودہ ٹنڈوں کی مال کا ڈھیر تھا جس کے اندر سے ہو کر لمبی لمبی گھاس اُپر نکل آئی تھی۔ قریب ہی ایک ٹوٹی گڈ پڑی تھی جس کا ایک ہی ہسیہ باقی تھا۔ کچھ کپکپائندوں کے چٹے تھے جن کے ارد گرد سرکنڈے کے جھاڑ تھے۔ باوجود اس کے کہ

چاند اپنی پوری تابانی سے چمک رہا تھا، لیکن اس سے بہتر ضلوت ساری چھاؤنی میں اور کہیں نہیں تھی۔ میں ابھی مناسب جگہ کا انتخاب کر ہی رہا تھا کہ مجھے پیچھے سے نبل نبل قدموں کی چاپ سُنانی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پر میلا اپنے چھوٹے سے رُومال سے ماتھا پونچھتی میری مڑ چلی آ رہی تھی۔

”یہاں گھاس بہت ہے“ اس نے ٹک کر کہا۔ ”اور جگہ بھی ڈزرنڈ ہے۔“
”جی!“ میں نے ادب سے جواب دیا۔ کیونکہ میں عمر میں چھوٹا تھا اور تھوڑا سا طالب علم تھا۔

”ہم میں سے ادھر کوئی بھی نہیں آتا۔“
”جی!“ میں نے اسی سعادت مندی سے پھر کہا اور پر میلا کی ذاتی خوشبو کا ایک ہلکا سا جھونکا میرے چہرے سے لپٹ گیا، جیسے شیشم اور شرنیہ کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو ہو۔

وہ ایک قدم اٹھا کر میرے اور قریب آ گئی اور اپنی کنپٹیوں کا پسینہ رُومال میں جذب کرنے لگی۔ اس کی اٹھی ہوئی گھاس کے نیچے سے ایک اور جھونکا آیا، جیسے شیشم اور شرنیہ کے جھنڈ میں سے کارگزی ہو۔

میں نے پوری آنکھیں کھول کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کوہاٹ کے محرابی حُسن پر نور ہی نور تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ ناف پر باندھ لیے اور میرا دل چاہا کہ میں بھی ایم بی بی میں داخل ہو جاؤں یا مندر میں پوجا کرنے لگوں یا پھر میری جی ماں مر جائے یا میں اپنی باقی زندگی کوہاٹ میں گزار دوں یا میں ابھی نماز پڑھنے لگوں یا ابھی لیٹ جاؤں۔ میں نے دیکھا سامنے ایک ٹوٹے ہوئے سرونٹ کو اترنے کے فرش پر پالی کچی تھی۔

اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور اس کے چہرے پر گہرے سینہ جوری رنگ کے شعلے بڑھنے لگے۔ پر میلا میں کچھ عجیب طرح کی شفقت پیدا ہو گئی تھی۔ کا منا سے بھری ہوئی بھر دی۔ شہوت سے لبریز پاکیزہ محبت میں ڈوبی ہوئی وہ ایک پاکدامن اور محبوط الحواس طوائف نظر آ رہی تھی جو ساری عمر شخص کو دل و جان سے اپنا بھائی سمجھتی رہی ہو۔ پر میلا کی آنکھوں میں جیانتی ہنڈوں

پرجبک تھی اور چہرہ لاج میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ محبت، ہمدردی، تپاک اور انس کے کنارے پر کھڑی تھی اور اس کا ایک قدم اٹھنا ہوا تھا۔

پر میلہ اپنے ہونے کی آگ میں سدھانے ہوئے سمندر کی طرح بیٹی تھی اور پرسکون تھی اور اس کے ارد گرد پوتر تھی۔ میں گلاس میں پڑا ہوا برف کا ٹکڑا تھا جس کے پگھلتے کنارے کو یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں کنارہ ہوں یا پانی!

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کہا:

”مجھ پر دیا کرو“

وہ ذرا سا مسکرائی اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں ”اچھا“ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

اعظمی ایک زور کی چیخ مار کر زمین سے اٹھا اور سیاست دانوں کی طرح ہاتھ لہرا کر کہا: اُٹھو یارو! مشرم کرو! کیا راستے میں غورتوں کی طرح بیٹھ گئے ہو؟

مسعود نے سر اٹھا کر اس کی طرف غور سے دیکھا، پھر ہم پر نظر کی۔ اس کے بعد اپنا جائزہ لیا اور ہنسا، پھر کہنے لگا:

”چلو یار جلدی کرو۔ جمیل پر بھی پہنچنا ہے اور پھر واپس بھی آنا ہے۔“

”کیوں صیب!“ کوہستانی نے ہنس کر مفتی سے کہا۔ ”میں بولا نہیں تھا آپ کو پورے پندرہ منٹ! چاہے گھڑی رکھ کر دیکھ لو چاہے کلاک رکھ کر دیکھ لو۔ پورا ٹیم مقرر رہے اس پھول کا۔ نہ ایک منٹ زیادہ نہ ایک منٹ کم۔“

”اور اگر کوئی کمزور صحت والا ہو۔ بڑی ٹمکا۔ میرے جیسا۔ پھر؟“

”چاہے سو سال کا پُرانا آدمی ہو صیب۔ چاہے پچیس سال کا جوان ہو۔ بدھا ہو۔ کمزور ہو چاہے ٹمکا ہو، سب کو پندرہ منٹ کے بعد ہوش آجاتا ہے۔ بالکل پہلے کا مافک ہو جاتا ہے۔ ایک دم! اب ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ پھر چلنے لگے تھے۔

اب سورج گھوم کر ایک ایسے رخ پر آگیا تھا جس کا جغرافیہ کی دنیا میں کوئی نام نہیں۔

اعظمی نے کافی آنسو سے سورج کی طرف دیکھا اور کستانی سے پوچھا۔

”سورج پہلے اُدھر نہیں تھا؟“

”جی صیب!“

”اب اُدھر کس طرح سے آگیا؟“

”پہاڑ گھوم گیا ناں صیب۔“

”پہاڑ گھوم گیا!“

”تم گھوم گیا ناں صیب، گھم گھمینی کے ساتھ، کستانی زور سے ہنسا“ اور پھر سب کچھ گھوم گیا۔ گھومتے کا مطلب سمجھتا ہے صیب!“

”پہلے سمجھتا تھا، مسعود نے کہا۔“ چھوٹا مٹا۔ اب نہیں سمجھتا۔“

”پہلے بھی نہیں سمجھتا تھا۔ عطا د بولا۔“ ”یہ نیک آدمی ہے اس کو راہِ راست کے سوا اور کچھ معلوم نہیں۔“

”اوئے تو نے بچپن میں بھی کوئی الٹ بازی نہیں لگائی، مفتی نے پوچھا۔

”مدد ہوگئی یار۔ عطا۔ دیکھو دیکھو۔ اُدھر تو نہیں تھا سورج جب ہم نے موڑ کاٹا تھا۔“ اعظمی نے رک کر کہا اور اس کے ساتھ ہم سب رک گئے۔

لیڈر اس نکتے پر غم، غصے، خوف اور سرزنش سے بھر گیا۔ کشکا کر بولا:

”اب اگر تم جمیل کے پانی کو صرف ہاتھ لگا کر بھی ٹوٹ سکے، تو عشاء سے پہلے نارائن واپس نہیں پہنچ سکو گے۔“

صرف میں نے لیڈر کی اس بات کا وزن محسوس کیا، باقی سب سورج کے زاویے کا حساب لگاتے رہے اور عطا دانیں اپنی سانس کے زور پر سمجھاتا رہا کہ سورج اپنی جگہ پر قائم ہے۔ پہاڑ بڑی آہستگی کے ساتھ گھوم رہا ہے اور ہم تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان تینوں حوالوں نے ہمارے اندر اس تباہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے، ورنہ سورج اپنی جگہ پر قائم ہے اور ساکت ہے۔“

ساکت نہیں ہے جی، ساکت نہیں ہے صیب! ”کستانی تڑپ کر بولا: ”سورج بالکل ساکت جا نہیں ہے۔ بالکل بے جان نہیں ہے۔ یہ حرکت کرتا ہے صیب، ہوتا ہے ہر شے اللہ کے حضور میں حرکت کرتی ہے۔ ہر شے اس کے حکم سے چل رہی ہے۔ ہر چیز خدا کے سامنے

فانی ہے۔ حکم کے مطابق ہے۔“

لیڈر نے کہا:

”چلو — خدا کے لیے!“

مفتی بولا:

”چلو“

عثمان نے کہا:

”اگر میرے پاس کاغذ ہوتا، تو میں نقشہ بنا کر سمجھاتا کہ ان ریشیوں کو سن ہماری کیا پوزیشن

ہے؟“

لیڈر نے اس کے کندھے پر سوٹی ماری اور خوفزدہ ہو کر کہا:

”پلیس!“

اور ہم سب بچر اسی رفتار سے چلنے لگے، پھر اچانک میں نے لیڈر کا چہرہ دیکھ کر محسوس کیا کہ منزل قریب آرہی ہے اور جب ہم اگلا موڑ کاٹ کر سامنے کے بل کی طرف جائیں گے اور وہ بل کھلے گا تو سامنے جمیل ہوگی اور جمیل کے گرد دھڑے قدم کے پہاڑ ہوں گے اور ان پہاڑوں پر سے کئی قسم کی ہوائیں گزر چکی ہوں گی۔ منتقل اور ٹیڑھے منتقل ہوائیں اور تجارتی ہوائیں اور بھر ہواؤں کے مختلف منطقے اور ان کے چکر، پہلو بہ پہلو، ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے افقی چکر، عمودی چکر، کٹے ہوئے جھونکے، بڑے بڑے ہوائی میدان، ہوائوں کے ریگستان، باد کے بڑے اعظم، چوڑائی کے رُخ، لمبائی کے رُخ اور اونچائی کی جانب، آسمانوں کی سمت اور زمینوں کی طرف!

مجھے یاد ہے گرمیوں کی ایک صبح، دوپہر سے ذرا سا پہلے کوئی گیارہ بجے کے قریب میں نے گلبرگ میں ہوا کا ایک جھونکا دیکھا تھا۔ ہوم آئنا مگس کالج کے سامنے۔ گلبرگ ڈاکخانے کی جانب جہاں بس سٹاپ ہے۔ جدھر ڈھاک کی قسم کے ولایتی بیڑے لگے ہیں، وہاں تین لڑکیاں بس کا انتظار کر رہی تھیں اور ان میں لیے قد کی درمیانی لڑکی سے ہوا کا یہ جھونکا گلے ملا تھا اور پھر واپس اوپر کو چڑھ گیا تھا۔ دراصل یہ جھونکا اس لڑکی کا خاندانی جھونکا تھا اور کئی صدیوں سے

گرہ ارض کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ اُس دن ہیلتھ اینڈ نیوریشن کی پروفیسر کا ہاتھ دروازے میں آگیا۔ جلد کٹ گئی ماس باہر آگیا۔ خون کا فوارہ بہ نکلا۔ اُنہوں نے خود ایک ہاتھ اور دانتوں کی مدد سے کلانی پر زوال باندھا اور زخم کے گرد و بی پیسٹ کر ایک ہاتھ سے موٹر چلاتی ہوئی ہسپتال پہنچ گئیں۔ زخم کو نوپڑے تین ٹانگے لگے۔ سرجن نے انہیں ٹیکہ دے کر چند گھنٹوں کے لیے سلا دیا اور خود اُن کے کالج فون کر دیا کہ پروفیسر بلیٹن آج کالج انہیں آسکیں گی۔ یہ تینوں لڑکیاں جو بس اسٹینڈ پر کھڑی تھیں، پروفیسر بلیٹن کی شاگرد تھیں اور اُن کا پیر ڈھالی ہونے کی وجہ سے وقت سے ایک پیڑ ڈھیلے گھر واپس جا رہی تھیں۔

چونکہ یہ تینوں لڑکیاں وقت سے پہلے بس اسٹاپ پر آگئی تھیں اس لیے ہوا کا جھونکا درمیانی لڑکی سے گلے مل کر اوپر کو چڑھ گیا تھا۔ اگر پروفیسر بلیٹن کا ہاتھ دروازے میں نہ آتا اور اُنہوں نے کلاس لی ہوتی، تو اُس وقت یہ تینوں لڑکیاں کلاس کے اندر بڑی تیزی سے نوٹس لے رہی ہوتیں اور ہوا کا جھونکا وقت مقررہ پر چلے مقررہ سے ہموک نہیں گئے بلکہ اوپر چڑھ گیا ہوتا، پھر کوئی ضروری نہیں تھا کہ کبھی واپس لاہور آتا یا کسی صدی میں گلبرگ کے جغرافیے سے گزرتا یا قرون بعد عین سیدھ میں آسکتا، جہاں آج آگیا تھا۔

لبے قد کی یہ درمیانی لڑکی یونانی لڑکی تھی۔ اس کی ناک یونانی نہیں رہی تھی، لیکن اس کی آنکھوں کے نیچے اس کی گالوں کی ہڈیوں کی بٹھان ابھی بھی یونانی مجسموں جیسی تھی، حالانکہ نہ اس کو اس بات کی خبر تھی نہ اس کے والدین کو اور نہ ہی اس کے منگیتر کو۔ اس کا والد گورنمنٹ کو کوراکھڑا سہلائی کرنے کا ٹھیکیدار تھا اور اس کا منگیتر رسول ایوہن ایشن میں درمیانے درجے کا آفیسر تھا جس کی مرقی کے آگے چل کر بڑے چانس تھے۔

سکندر اعظم کے سامیواں سے زخم کھا کر واپس چلے جانے کے بعد اس علاقے کو سیکس کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ سیکس سکندر اعظم کا بہت ہی قابل بے حد وفادار نہایت خوبصورت اور بڑا پیارا لکھنڈ تھا۔ اس نے اس علاقے کے لوگوں پر محبت اور شفقت کے ساتھ حکمرانی کی اور بہت سے یونانی مجسمے ساز، پہلوان، نے نواز خوش نرس

بازی گراور تاجر یہاں آکر آباد ہو گئے۔ یونانی نوجوانوں، یونانی دیوتاؤں نے یہاں کی عورتوں کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنا سیکھ لیا اور وہ ان کی اس حرکت کو پسند کر کے ہنسنے لگیں اور ہنسی ہنسی میں کئی ایسی شادیاں ہو گئیں جن میں مرمر کے مجسمے صندل کی موتیوں کے جڑوں میں بیٹھ کر موتی موتی ہو گئے۔ کئی مورکھ لڑکیوں نے پاؤں میں گنگنہرو باندھ کر اور سروں پر مکت سجا کر یونانی لڑکیوں کو ہاتھ اٹھا کر اس طرح سلام کرنا سیکھ لیا جس طرح سکندر اعظم اپنی فوج کے دستوں کو کیا کرتا تھا۔ جب وہ راہ چلتی کسی یونانی دوشیزہ کو ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے تو ان ٹکٹ ٹکٹ لڑکوں کی کلائیوں سے سونے کے گنگن لڑھک کر ہاتھی دانت کے بازو بندوں پر آڑ سکتے۔

گریک لڑکیاں ان سے بار بار سلام کرتیں اور اس گارڈ آف آنر کے نیچے کئی ایسی شادیاں ہو گئیں جن کے نیچے باہوں سے زیادہ ماؤں پر چلے گئے اور پھر چلتے ہی گئے۔ یہ جو درمیان میں لمبے قد کی لڑکی بس سناپ پر کھڑی تھی، انہی بچوں میں سے ایک تھی جہاں کے مہاندروں کی انگلی تمام کمر چلتی چلتی ہوم آگیا کس کالج میں آگئی تھی اور اپنی ذہانت کی وجہ سے کالج بھر میں مشہور تھی۔

جب سکندر اعظم کو ایک پرانے آن گھڑت بھالے کے زنگ آؤدھیل کا گہرا زخم لگا تھا اور یہ زخم اُس کو ساہیوال کے ایک بانگلی بٹی کے وار سے ملتا تھا، تو سکندر اعظم اپنی کمان ایسی جھالدار کلنی سمیت زمین پر گر گیا تھا اور جب یہ کس نے آگے بڑھ کر فاتح عالم کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا تھا تو ہوا کا ایک جھونکا ان کے درمیان سے ہو کر ملتان کی طرف نکل گیا تھا اور پھر بے تاب ہو کر سمندروں کی جانب چلا گیا تھا اور وہاں سے دوسری زوئیا اور ہواؤں کا دباؤ برداشت نہ کر کے پہاڑوں کی طرف بھٹک گیا تھا۔ یہی جھونکا کئی سال تک قرقم اور ہندوستان کے سلسلوں کے درمیان چکر لگاتا رہا۔ پھر پیری نیٹی اور الیپس کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ کئی صدیاں بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس کے جنگلوں میں گزار دیں۔ ساٹھ پینسٹھ سال تک یہ جھونکا اسیکیموؤں کی بستیوں کے گرد منڈلاتا رہا۔ اسیکیموؤں کی پوری ایک نسل اس کے سامنے پیدا ہو کر جوان ہوئی اور اُس نے ان کے درمیان سوائے محبت، صلح اور بوس و کنار کے اور کچھ نہ دیکھا۔

کوئی ایک صدی تک یہی جھونکا صحرائے عرب میں چلنے والی ڈاچیوں کی تھوٹھنیوں کے اوپر بڑھتا سمٹتا رہا۔ اس نے یہاں عجیب قوموں کو دیکھا جو عورتوں سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اور سخاوت کے معاملے میں ان کے دل دریاؤں سے بھی بڑے تھے۔ وہ بڑی محنت سے پتے پتے ہوئے صحرائوں میں کانٹے دار جھاڑیوں سے ریزہ ریزہ کر کے خوراک حاصل کرتے تھے اور شام کے وقت گلی کوچوں میں فقیرانہ صدائیں دیتے پھرتے تھے۔

”اے مائی باوا ہے کوئی اللہ کے نام پر میرے ساتھ مل کر کمانے والا۔۔۔ میرے ساتھ ٹیئر کرنے والا۔۔۔ مجھے میرا بانی کا شرف عطا کرنے والا۔۔۔ ہے بابا۔۔۔ ہے سنیہا۔۔۔ ہے مہربانا!۔۔۔ راہبیا!۔۔۔ مجھ غریب نمٹانے۔۔۔ بے آسرا۔۔۔ بے گھر۔۔۔ بے درکی بھی عزت فرما۔۔۔ میرے دسترخوان پر آکر کھا۔۔۔ میرا مان بڑھا۔۔۔ ہے سنی بابو!۔۔۔ سہنے مسافرو!۔۔۔ عزت دار قیمو!۔۔۔ قیمر!۔۔۔ سردارو!۔۔۔ ابا جوا!۔۔۔ محبوبو!۔۔۔ نگارو!۔۔۔ کرم فرماؤ!۔۔۔ میرے ساتھ روٹی کھاؤ۔۔۔ اور بڑے درجے، بڑے رتبے پاؤ!“

پھر اسی جھونکے نے مدینے کے شہر میں کئی مدنی، قرشی، اُقی کے عاشقوں کو دیکھا اور اُن پر ایک حکم نازل ہوتے ہی سنا:

”اے ایمان والو! آگے نہ بڑھو اللہ سے اور اُس کے رسول سے اور ڈرتے رہو اللہ سے کہ وہ سُنتا ہے اور جانتا ہے اور اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے تڑخ کر بولتے ہو، اس طرح سے اُن کے رُوبرُو نہ بولا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ اللہ کے رسول کے سامنے دینی آواز سے بولتے ہیں، خدا نے ان کے دل تقویٰ کے لیے آزمایے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے بخشش اور اجر عظیم ہے۔“

اور پھر اسی جھونکے نے عرفات کے میدان میں اسی شرفِ دو جہاں اور دُشگیرِ آفاکوں کو دیکھا کہ اپنی ادنیٰ پر سوار واپس تشریف لے رہا ہے تھے۔

جب شہنشاہِ ہندوستان شاہجہان حضرت میاں میر صاحب کی خدمت میں حاضر

ہوا اور دارا شکوہ اس کے ساتھ دہانے ہاتھ کھڑا تھا اور حضرت میاں بخو صاحب کی باتیں عقیدت کے کان سے سُن کر محبت کے دل میں جمع کر رہا تھا، اس وقت ہوا کا یہ جھوکا اتنا نیچے اُتر آیا تھا کہ حضرت میاں میر صاحب کے مُنہ سے پھینکے ہوئے لوہنگ زمین پر پڑنے لگے تھے۔

اور آج جب مسر سبیلین اپنا ہاتھ دروازے میں آجانے کی وجہ سے کالج پہنچ سکی تھیں اور اُن کے خالی اور آخری پیر ڈیں لڑکیاں گھر مل کوروانہ ہو گئی تھیں تو بس سٹاپ پر یہ جھونکا لیے تدکی لڑکی سے گلے مل کر اُوپر کو چڑھ گیا تھا۔ یہ لڑکی سیلوکس کے خاندان سے تھی اور اس کے ننھیال اور دوھیال دونوں اُوپر جا کر سکندر اعظم کے نامور سپہ سالار سیلوکس سے جاملتے تھے۔ حال ہی میں اس لڑکی کا باپ سوتر منڈی والا پُرانا گھر چھوڑ کر میو مسلم ٹاؤن میں آباد ہوا تھا اور خوش تھا کہ اس کی ٹھیکیداری ٹھکانا ٹھک پل رہی ہے اور اس کو کسی طرف سے کسی قسم کے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں۔

لیڈر نے رُک کر کستانی سے کہا:

”دیکھو! اس کو پھر اُٹھا لو۔ صاحب کو“

”ہرگز نہیں!“ مفتی نے چیخ کر کہا۔ ”اب نہیں ٹھیک ہوں اور چل سکتا ہوں“

”اُگے پھر چڑھائی اُڑی ہے مفتی!“ مسعود نے کہا اور پتہ نہیں کس کو ایک ہلکی سی گالی

دی۔

”نہیں یار! میں ایسا بھی گیا گزرا نہیں ہوں۔ اب بالکل فٹ ہوں۔ نو برنو۔ میں اس

کے کاندھوں پر نہیں چڑھوں گا“

کستانی نے دبی زبان سے کہا:

”اگر ضرورت ہے صیب تو بھڑک جاؤ“

لیکن اُس کا من حرامی ہو چکا تھا اور وہ کافی جینس کی طرح ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ عماد

نے انگریزی میں لیڈر کو سمجھایا:

”کسی پر اتنا بوجھ ڈالنا بھی ٹھیک نہیں اور جب مفتی صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ چل سکتے

ہیں تو انہیں چلنے دو“

”اور اگر نہیں بھی چل سکتے تو بھی ان کو چلنے دو“ اعظمی نے کہا۔ کیونکہ چلنا نہ چلنے سے

ہر حال میں بہتر ہوتا ہے ورنہ ان کا حال بیماری ملازمہ صفوی کی طرح ہو جانے کا جو کہ ہمار

مارکیٹ سے گرم مصالحہ لے کر دو گھنٹے بعد گھر واپس پہنچی تھی اور میری بیوی نے پُرانے گرم مٹھا

کے زور پر ہی پلاؤ پکا دیا تھا“

مفتی نے رُک کر کہا:

”ٹھہر دیا رو! میں صفوی کی بات سُننے بغیر آگے نہیں چل سکتا، کیونکہ میں نے اُسے

بڑے غور سے دیکھا ہوا ہے“

مسعود نے کہا:

”دیکھا تو ہم نے بھی تھا مفتی جی! لیکن اتنے زور سے نہیں دیکھا تھا“

اعظمی نے کہا:

”جب صفوی پورے دو گھنٹے بعد گرم مصالحہ لے کر ہمارے گھر پہنچی، تو میری بیوی نے

جل کر کہا۔

”اتنی دیر تک کہاں مری رہی بدبخت!“

تو صفوی نے رو بھی آواز میں جواب دیا:

”کیا کروں بی بی جی! واپسی پر ایک نوجوان میرے پیچھے چلنے لگ گیا تھا۔ نیل پٹکون اور

پیلے سویٹر والا“

میری بیوی نے کڑک کر کہا:

”تُو فوج کرتی اُس مردود کو، تیرا اُس سے کیا کام تھا بھلا۔ ناک کی سیدھ گھرائی۔ جلدی

جلدی، پیچھے دیکھے بغیر“

تو صفوی نے غم ناک ہو کر کہا:

”میں تو جلدی جلدی جیتی تھی جی! لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ چلتا تھا مرنے لگا تھا! کتا کے

تھاں کا“

منفقتی نے اس ناخوشگوار حادثے کے درمیان بڑی محبت بھری آواز میں اعلیٰ سے

پوچھا :

”اچھا بچہ کیا ہوا؟“

”بچہ کیا ہوا کیا؟“ اعلیٰ نے تعجب سے پوچھا تو منفقتی نے کہا :

”یار اس صغریٰ کا“

ہم سب زور سے ہنسنے لگے، تو لیڈر نے ایک زوردار تہمت ماری اور ہم سب سے چھ سات قدم آگے چلنے لگا۔

”اس کا کیا ہونا تھا منفقتی جی!“ اعلیٰ نے کہا۔ ”وہ چلی گئی۔ رفغان اُٹل کا ڈبہ لینے گئی تھی پھر واپس نہیں آئی۔“

”اُسی کے ساتھ! عمار نے پوچھا۔“ نیل پتلون اور پٹی جڑی والے کے ساتھ!“

”اب میں کیا عرض کر سکتا ہوں!“ اعلیٰ نے کہا۔

”عرض کرو صیب! کیوں نہیں کرو؟“ کستانی نے کہا۔ ”اُسی کے ساتھ گئی ہوگی وہ

حرامزادی“

”تو ہماری باتیں سمجھتا ہے۔“ عمار نے چیخ کر پوچھا۔ اور ہم سب رگ گئے۔

”سمجھتا ہے صیب! سمجھتا کیوں نہیں۔ یہ کون سی مشکل بات ہے سمجھنے کے لیے عورت

کی بات ہر کوئی سمجھتا ہے، لیکن ہم ڈبے کی بات نہیں سمجھتا۔“

ہم سب حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگے، تو منفقتی نے کہا:

”یہ رفغان اُٹل کے ڈبے کو پوچھ رہا ہے گدھو! منہ اُٹھا کر کیا کھڑے ہو گئے ہو۔ چلو!

آگے چلو“

ہم سب چلنے لگے تو منفقتی جی نے کہا:

”اس دُنیا میں جہاں کہیں کوئی قتل ہوتا ہے تو اس کا ایک سزاغ ایک کٹوا ایک اشارہ

ضرور ہوتا ہے اور جب کبھی کوئی عورت بھاگتی ہے تو اس کے ساتھ ایک رمز ضرور ہوتی ہے

جو اس کے اُدھالے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے“

میں نے بیوی سے کہا:

”اچھا ہی ہو گیا۔ یہ گھر تو پہنچ گئی خواہ دیر سے پہنچی، تو بجائیہ! منفقتی جی کو چلنے دو، خواہ وہ

آہستہ آہستہ ہی کیوں نہ چلیں۔“

”اور شام تک جمیل پر نہ پہنچ سکیں۔“ لیڈر نے تقریباً رو کر کہا۔

عمار دھڑک کر بولا:

”ایک تو اس کی یہ جمیل ہم سب کو لے ڈوبے گی۔ نہیں پہنچ سکے تو نہ سہی، کوئی کتاب میں

لکھا ہے کہ جمیل تک پہنچنا ضروری ہے۔“

اس نان کو پریٹو سپرٹ کے بھونڈے اعلان کا جملہ لیڈر کو گو لے کی طرح لگا۔ وہ کبلی کی سی

تیزی سے واپس بھاگ گیا، تو ہم بھی اُس کے پیچھے دوڑے، لیکن ہماری دوڑ کمزور تھی۔ کچھ اس

وجہ سے کہ ہم آگے لے جانے والی انڑی کو اس طرح سے ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کستانی

بھبھو کے کی طرح لیڈر کے پیچھے بھاگا اور چشم زدن میں جا کر اس کو چٹھا ڈال لیا۔ لیڈر کستانی

کے کلابنگ میں بند آہستہ آہستہ اس کو سونیاں مار رہا تھا اور کستانی انکی جاگھول میں

سر دے کر اس کو کندھوں پر اُٹھا رہا تھا۔ ہم سب نے پھاڑ کے کنارے پر بھجک کر زور زور

سے تائیاں بجا کر گانا شروع کر دیا۔

اوتے جٹا چاک لے واگھر وکر کے

باہنی گلاس درگی۔

کوہستانی لیڈر کو کامیاب لیڈر کی طرح کندھوں پر اٹھائے واپس آ رہا تھا اور مگر کامیاب

لیڈروں کی طرح کندھے پر بیٹھا اس کو سونیاں مار رہا تھا۔

جب اس نے لیڈر کو واپس لاکر ہمارے قریب اتارا، تو مسود نے عمر کو انگریزی میں

سخت مسست کہا اور لیڈر نے غصے میں بھرے ہوئے ناکام لیڈر کی طرح انگریزی ہی میں

اس کو ٹرکی بڑی جواب دیا، لیکن غصے کی زیادتی اور انگریزی کی کمی کی وجہ سے عمر کی گلگھی بندھ

گئی اور چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ ”موراور“ کے انداز میں ہم سب کو گندی گالیاں دینے لگا اور

رومال سے اپنا تمنا یا ہوا چہرہ صاف کرنے لگا۔

اعظمی کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ صغریٰ کے بھاگنے میں اعظمی کے رخ جان کا ڈبہ بھی کھڑکھڑاتا ہوا ساتھ جا رہا تھا۔

اس وقت جہاں ہم چل رہے تھے پہاڑ کی اونچائی زیادہ نہیں رہی تھی۔ ارد گرد کے سلسلے کوہ البتہ بلند ہو گئے تھے اور ان پر سفید برف جسنے لگی تھی۔ پہاڑ دُور تھے، مگر ان کی برف نزدیک دکائی دیتی تھی۔ برف نزدیک تھی مگر اس کی ٹھنڈک کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ چمک دُور تھی، مگر اس کی چمک اور آنکھوں کے قریب پہنچ کر پریشان کر دیتی تھی۔ لیڈر نے پتھروں کی جیب سے سیاہ چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگا لیا اور پیچھے مڑ کر ہم سب کو نعرین بھرے انداز میں دیکھا، کیونکہ ہماری پاس سیاہ چشمے نہیں تھے۔ ہم اپنے اُدنی جاتی کے برہن لیڈر کے پیچھے پیچھے آدمی باسیوں کی طرح چل رہے تھے اور ہم کو تھوڑی تھوڑی سردی لگنے لگی تھی۔

مفتی نے بڑے دکھ بھرے انداز میں عماد سے کہا:

”ذرا ہمارے لیڈر کو دیکھو، ساتھ چلنے کو بھی تیار نہیں“

”بس ایسے ہی ہوتا ہے مفتی!“ مسعود نے سر جھکا کر کہا: ”اس پر زیادہ غصہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ زیادہ غصہ کرو گے تو خود ہی ٹوٹنے لگو گے۔“

”وہ بھی ٹوٹ سکتا ہے، مثلاً لیڈر!“ اعظمی بولا۔

”ٹوٹ تو سکتا ہے اور ٹوٹ بھی جاتا ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، مسعود نے کہا۔“ میرا مطلب ہے ان ہمک ٹوٹ پھوٹ سے کسی کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا۔“

”یہ سالا ملامتی ہے“ اعظمی نے کہا۔ اس کی کوئی بات نہ سنو، ورنہ یہ ہم کو بھی اپنے جیسا بنالے گا۔“

”لامتی اس جیسے نہیں ہوتے۔“ عماد نے کہا۔ ”ان کی کمریں سیدھی اور گفتگو صاف ہوتی ہے۔ یہ تو کُڑا بھی ہے اور ہکلا بھی ہے۔ یہ کیسے لامتی بن سکتا ہے؟“

مفتی نے بے اولاد بولنے کی طرح عماد کی طرف دیکھا اور اپنا دکھ اندر ہی پی گیا۔ وہ سانس کے خلاف ہونے کی وجہ سے عماد سے اتنی محبت نہیں کر سکتا تھا جتنی وہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی ہر بات کی کھل کر داد بھی نہیں دیا کرتا تھا، کیونکہ عماد کی ہر بات کی بنیاد سانس

اور منطق پر ہوتی تھی اور مفتی کو سانس اور منطق سے خدا واسطے کا پیر تھا۔ مفتی اپنی شفقت کے اس حصے کا اظہار بھی نہیں کر پاتا تھا جو خدا نے اُسے صرف عماد کے لیے دیا تھا۔ نہ اس پیار کی جب تک دکھا سکتا تھا جو ازل حکم کے تحت خاص عماد کے لیے الاٹ ہوا تھا۔ مفتی کی حالت اس باپ جیسی تھی جو اپنے آسودہ حال، تابع فرمان، نیک نام اور باادب بیٹے کے مقابلے میں بد لحاظ، بے روزگار اور بے ادب بیٹے سے زیادہ محبت کرتا ہوا اور ہر وقت اسی کے غم میں گھٹکتا رہتا ہو۔ اسی کی فکر میں رہتا ہوا اور اسی کے لیے کوشش کیا کرتا ہوا اور ایسے ہی کبھی کبھی اُسے اپنے تابع فرمان اور نیک نام بیٹے کا خیال بھی آجاتا ہو کہ محبت کے معاملے میں اس سے زیادتی ہو رہی ہے اور اُسے اُس کا حصہ نہیں مل رہا۔ اپنی بے انصافی پر اور سعادت مند بیٹے کی حق تلفی پر ایسے باپ کو دکھ ضرور ہوتا ہے، لیکن اُس دکھ کی معیاد لمبی نہیں ہوتی اور اس دکھ سے عمل کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

عماد نے کہا:

”مفتی جی! ملامتی فرقتے کے لوگوں کا ایمان ہے کہ نفس ہمیشہ دھوکا دہی کی طرف مائل رہتا ہے۔ نفس چاہے آگے آگے چل کر زہری کر رہا ہو چاہے پیچھے چل کر پیروی کر رہا ہو۔ چاہے باادب، تابع اور فرماں بردار بن جائے، چاہے باغی اور سرکش ہو جائے اس کا کوئی اعتبار نہیں... کبھی بھی اعتبار نہیں... ہرگز اعتبار نہیں“

مفتی نے جبر کر کہا:

”اوئے جا! آیا بڑا صوفیوں کا دل ٹٹولنے والا۔ تو کدھی کہہ مار کی تجھے رام سے کام۔ رہنا مشینوں میں، سونا ٹیکنالوجی میں، سوچنا فزکس میں اور بات کرنی ملا متیوں کی!“

عماد نے منہ کر کہا:

”یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں بادشاہو! فزکس اور تعمیر ہی جب اپنے اپنے معراج کو پہنچتے ہیں، تو ایک ہی شے بن جاتی ہیں۔ دونوں جب تعمیر میں ڈوبتے ہیں، تو ان کی ہیئت کدائی ایک سی ہو جاتی ہے۔“

”اب یہ محض علمی کھواس کے زور پر مفتی کا دل جیت رہا ہے۔“ اعظمی چیخ کر بولا۔ ”جیتنے

نزدینا مفتی! ہرگز نہیں جیتنے دینا اپنے دل کو۔

”تمہیں یاد ہے مسعود! عماد نے لائقیت سے کہا۔ سن چھیا سٹھ میں ہمارے پاس ایک ڈبلا پتلا، بڑی عمر کا ایکٹر دنک انجینیئر آیا تھا۔

”موسیو دیانش۔ سنہری عینک والا۔ مسعود نے یاد کیے بغیر کہا۔ نیولا۔ جیہی آواز والا۔

”وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ دنیائے سانس کا مانا ہونا نام۔ عماد نے کہا۔ اس نے نیولا بھر کے ساتھ کام کیا تھا پورے تین سال۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ پاکستان آیا اور پورے چھ مہینے تک ہمارے ساتھ رہا۔

”اپنے ساتھ کو ہمارے ساتھ کیوں کر رہا ہے بے! غلطی نے شرارت سے کہا تو عماد نے اس کی سنی اُن سنی کرتے ہوئے سانس روک لی اور پھر ایک دھماکے کے ساتھ بولا،

”وہ ملائیہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ موسیو دیانش!“

مفتی ایک دم رگ گیا اور اس کے ساتھ ہم بھی ٹھہر گئے۔ عماد کے چہرے پر پینہ سا آگیا، جیسے کسی ناخوش گوار یاد پر چہرہ ہلکا سا ٹنکا ہو جایا کرتا ہے۔ عماد کی آنکھیں پیلے سے بھی خوبصورت ہو گئیں اور اس نے بتایا کہ موسیو دیانش کے پاس ایک پُرانا فرانسیسی مغلوط تھا جس پر فرقہ ملاستیہ کے سینا تیس خصوصیات درج تھے اور جسے ایک ایک کر کے اُس نے عماد کے لیے انگریزی میں منتقل کیا تھا اور اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ یہ قاعدہ کسی اور کو ہرگز نہیں دکھائے گا۔

”سوائے ہمارے!“ غلطی نے بلند آواز میں کہا۔

”نہیں تمہیں بھی نہیں۔ آئی ایم سوری۔۔۔ یہ ایک عہد ہے۔“ عماد نے کہا۔

”لیکن یار سانس دان!“ اب مفتی کے تیور ڈھیلے پڑ رہے تھے اور وہ ہارے ہوئے انسان کی طرح گھرواپس جا رہا تھا۔ اس نے عماد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر محبت بھرے انداز سے پوچھا۔

”اس کو کیا ہو گیا تھا۔ اس فرانسیسی کو۔ جس کا نام تم لوگ لے رہو!“

عماد نے کہا:

”مفتی جی، وہ عجیب آدمی تھا۔ فزسٹ تھا۔ ساتھ ہی سائر کا ہم خیال تھا۔ الجزائریں

اپنے ہم وطن فرانسیسیوں کے خلاف لڑتا رہا تھا۔ وہاں ایک شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر ست سال کسی زاویے میں بھی رہا تھا۔ چاک پر مٹی کے برتن بنالیا تھا۔ گھگی جیسی آوازیں دے دیتا تھا۔ اور سب سے اُونچے ٹرانسمیٹر پر بلا خوف و خطر چڑھ جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سانس کے باریک مسائل کو مکالمے اور مباحثے کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ نہ ہی ایسے مناظروں پر فخر کرنا چاہیے۔ اور نہ ہی کسی بے حقیقتے اور بے ہدایتی کے سامنے خدا کے مجیدوں کا انکار کرنا چاہیے۔ دیانش کہتا تھا کہ غلامی اور تالبداری کی رُوح صرف دو سہاروں کی بنیاد پر قائم ہے: خدا کی ضرورت کو باطنی ماننا اور اُس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش قدم کے قریب تر رہنا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ دم بخود کھڑے تھے اور لیڈر اپنے سیاہ چخشے سمیت دوڑا ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔

عماد نے کہا۔ دیانش کے شیخ فرمایا کرتے تھے کہ سُن ایک خوبی ہے اور عشق ایک جوہر، بشرطیکہ دونوں راز ہو کر رہیں اور سولے خدا کے اور کسی کو ان کا علم نہ ہو۔ اپنے عشق کا انکار کرنا گویا ایمان والوں کا ساتھ چھوڑ کر جبک منگوں کے ساتھ ملنا ہے اور جبک منگے تو لاکھوں نہاروں قدم قدم پر ہاتھ پھیلائے نظر آتے ہیں۔ ان کے درمیان فقیروں کا کیا کام!

اگر آپ کبھی لاہور آئیں اور یہاں کی مال روڈ سے گزریں اور جس سواری میں آپ سفر کر رہے ہوں وہ وائی ایم سی اے والے چور ہے کی مرنج بٹی پر رُک جائے، تو ایک منٹ کے لیے ضرور سوچیں کہ ارد گرد بہت سے بنکوں کے درمیان ایک بنک ہے جس میں ایک صاحب دل میخجر کام کر رہا ہے جو اب رینا رمنٹ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ میں اس کو اکثر برسن بادوں سے جانتا ہوں جب میں نے دیال سنگھ کالج کی نوکری کے دوران اس کے پاس اپنا اکاؤنٹ کھولا تھا۔ اس وقت وہ اکاؤنٹس کلرک تھا اور سیلینڈر پمپ کے سگریٹ پیکر تاج تھا۔ بنک کے سب ملازم اور افسر اس کو باؤسراج کہتے تھے کہ وہ ہر وقت تھری بیس سوٹ میں ملبوس رہتا اور کوئی سینٹ اور کوئی میئر اُٹل استعمال کیا کرتا۔ اس کو شہر راگ، خوشبودار چائے اور قیمتی

فائزین پن سے شش تھا۔ اُردو افسانے کا مارا ہوا اور نیو تھیٹریز کی فلموں کا ڈراما ہوا۔ بابو سراج خود سارا دن اکاؤنٹس رجسٹر پر کھڑا رہتا، لیکن اس کی روح محبت کے چروں میں بیٹھی، لمحوں کی آرقی اُتارتی رہتی۔ بابو سراج اندر سے خوبصورت اور باہر سے بڑا نکلیں انسان تھا۔

بیس کالج سے کوٹے وقت تقریباً ہر روز بابو سراج سے ملتا اور مجھے اس سے مل کر دینی خوشی ہوتی جیسے تیج بیک کو اپنی محبوبہ سے مل کر ہوا کرتی ہوگی۔ خفت، ندامت، احساس کمتری اور اس کے ساتھ بے پناہ خوشی! وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر بنک کے شاف روم میں اپنے ہاتھ سے چائے بناتا۔ قرینے سے برتن لگاتا اور بھر بڑی محبت سے پرچ اور پیالی کو نشوونما سے سکھا کر چائے کی پیالی پیش کرتا۔ مجھ کو اس ذہین، خوبصورت، بڑھے نکھے اور سادہ کارن نوجوان کے ساتھ بابو کا لفظ بہت ہی بُرا لگتا تھا، لیکن اس کو پسند تھا کہ یہ نام اُسے بنک کے ہیڈ چیئر پرانے دیا تھا جو اس کے محلے میں رہتا تھا اور اس کے والد کا دوست تھا۔

ہم دونوں کے درمیان ایک مشترکہ دوست بھی پیدا ہو گیا تھا۔ رضی بی۔ اے۔ اس کے پاس نورن موٹر سائیکل تھی اور وہ چوٹی بجر کی غزلیں لکھتا تھا۔ رات کے وقت رضی کا ڈیرا اکثر کامران کی بارہ دری میں لگتا اور وہ راوی کے بستے ہوئے پانیوں کو دیکھ دیکھ کر صبح کر دیتا تھا۔ اس قدر رومانوی طبیعت رکھنے کے با وصف رضی کی غزلیں بابو سراج کو پسند نہ تھیں کہ ان میں دُکھ کے بجائے شکوے کا عنصر زیادہ تھا اور وہ حالاتِ زمانہ سے اور عمومی واقعات سے جنگ کرتا رہتا تھا مجھے اس کی شاعری بہت پسند تھی، کیونکہ اس کے ہر شعر میں کسی نہ کسی پر ایک آدھ چوٹ ضرور ہوتی تھی۔ کسی کسی شعر میں تو وہ دو دو تین تین چوٹیں بھی کر جاتا تھا اور ان مرکب چوٹوں میں بڑا ہی لطف آتا تھا تھا۔ رضی آسودہ حال رومانوی نوجوان تھا اور زلزلے کا شکی تھا۔ بابو سراج اکاؤنٹس کا اونگرز کا آدمی تھا اور ہر وقت پسیمار رہتا تھا۔ عربوں، تفریقین سے لڑ لڑ کر اس کے اندر بڑی عاجزی اور طائست پیدا ہو گئی تھی۔ ہم اس کی غیر موجودگی میں اس کو حلوائے پنجاب کھا کرتے تھے اور اس کے بارے میں متفکر رہتے تھے کہ اس کا کیا بنے گا۔

گرمیوں کے موسم میں پورے دو ہفتے کی رخصت لے کر بابو سراج کوہ مری ضرور جاتا۔ اپنے پسندیدہ افسانوں کے مجرم، چائے کا سامان، فلیٹ بوٹ، چیری کی چھڑی اور تہ ہونے والی

چھتری اس کے مخصوص شریک سفر تھے۔ اس کی دوبہت ہی پیاری اور مٹی سی بلبلیں بھی تھیں۔ ایک تین سال کی اور دوسری پانچ سال کی۔ دونوں اپنے آپ کے انتظار میں دلیز پر پھٹی رہتیں اور جب بابو سراج بنک سے واپسی پر گلی میں داخل ہوتا، تو دونوں ایک ساتھ بازو پھیلا کر اس کی طرف بھاگتیں اور اسے دونوں کو ایک ساتھ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ مری سے واپسی پر بابو سراج ان کے لیے گرم ٹوپیاں، گرم دستاں، مٹی گولیاں اور ایک ایک گڑ یا مزور لاتا۔ ان کی ماں کے لیے ایک شال اور اپنی والدہ کے لیے کبھی مندو، کبھی دھتا اور کبھی جانماز۔ لیکن ایک مرتبہ جوہ مری گیا، تو کسی کے لیے کچھ بھی نہ لاسکا اور سب کے چہرے اُداسی کی دھول سے اٹ گئے جیسے قبر کے اندر پہلی رات کے بعد مردے کا چہرہ ہو جاتا ہے۔

تیرہ تاریخ کو ہم سب سے مل کر وہ مری کے لیے روانہ ہوا اور پندرہ تاریخ کو جب میں ایک پبلک کیشن کرانے بنک گیا تو وہ کاؤنٹر پر کھڑا رجسٹر میں ڈسبٹ کر ڈیٹ اندراج کر رہا تھا۔ اس کو یوں کھڑے دیکھ کر میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور میرا یقین متزلزل ہو گیا۔ وہ دس منٹ کے لیے اپنے ساتھی کو چارج دے کر پن بند کرتا ہوا میرے ساتھ بنک سے باہر گیا ہم دونوں بنک کے سامنے مال روڈ کے ایک تناور درخت کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑے ہو گئے۔

اُس نے کہا: "اشفاق جی! میں کیا بتاؤں کہ مجھ پر کیا حادثہ گزرا اور مجھے کس لیے اتنی جلدی لاہور واپس آنا پڑا۔ کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتا، کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔ میری ساری پھٹیاں برباد ہو گئیں۔ سارا پروگرام تباہ ہو گیا، لیکن میں اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مجبور تھا۔" کہنے لگا: "میں تیرہ تاریخ کو بعد دوپہر مری پہنچ گیا۔ سامان میں نے ایجنسی پر رکھا اور ذرا نظارہ لینے کے لیے بجلی سڑک پر چلتا ہوا پنڈی پوائنٹ پہنچ گیا۔ اس دن بڑی مزیدار دھوپ تھی، لیکن اس میں اتنی نمی نہیں تھی جتنی پہاڑوں کی دھوپ میں ہوا کرتی ہے۔ کچھ دیر نہیں پنڈی کی طرف مُنہ کر کے پہنچ بیٹھا رہا، پھر اُٹھا۔ سویر کو کمر پڑا۔ اس کی لمبی آستینوں کو گردن کے گرد موٹی سی گرہ دی اور اپنی چھڑی لٹکاتا ہوا ڈاکنیانے کی طرف چل دیا۔ اس مرتبہ بے شمار لوگ آئے تھے اور سیرن بہت بھر کے لگا تھا، لیکن اتنے سارے لمبے راستے پر مجھے کوئی بھی واقف صورت

نظر نہ آئی اور میں اپنے اکیلے پن کی خوشی میں لکتا لکتا مال روڈ پر غراں غراں چلتا رہا ابھی مجھے کسی ہوٹل میں بھی اپنا بندوبست کرنا تھا اور شام کے وقت لمبی سیر کے لیے پھر نکلتا تھا، لیکن اس بات کا میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا اور میں غراں غراں چل رہا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک کپ گرم گرم خوشبو دار خاکسترنگ چائے کا پیاجا بنے۔

میں لن ٹائٹس میں بید کی ٹکڑی پر جا کر بیٹھ گیا اور اپنی چھڑی کا سر گود میں رکھ لیا۔ میرے نے ایک جھجھاتا ہوا پیٹری سینڈ میسرے سامنے لا کر رکھ دیا اور خود چائے لینے چلا گیا۔ میں نے پیٹری میں سے وہی میٹھی روٹی پان کا پتہ اٹھالیا جو میں شوق سے کھا یا کرتا تھا۔ ابھی میں نے اس میٹھے پتے کے دو ہی دانت کاٹے تھے کہ میرا چائے لے کر گیا۔ میں نے جلدی سے چائے سڑکی گیلی بیالی کو چھڑکا۔ جب سے نشوونما کر پرش اور پیالی دونوں کو سکھایا اور ادھی چھپی بیٹی کی ڈال کر چائے پور کی۔ بڑا فٹ کلاس گرم گرم دودھ تھا اور بہت ہی اچھی چائے تھی۔ دونوں ایک سی عمارت کی وجہ سے فوراً گھل گئے اور مجھے چچک بک ملانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

میرے دائیں ہاتھ میں میٹھا لکڑا تھا اور بائیں ہاتھ میں چائے کی پیالی۔ ابھی میں نے پہلا ہی گھونٹ بھرا تھا اشتقاق صاحب اور پیالی میرے ہاتھ ہی میں تھی کہ لن ٹائٹس کی پیٹریوں پر ایک ماں بیٹی نمودار ہوئیں اور میری قریبی ٹیبل کی طرف آکر بیٹھنے کی تیاری کرنے لگیں۔ وہ لڑکی اشتقاق جی، اتنی خوبصورت تھی، اتنی خوبصورت تھی کہ اُسے دیکھ کر میرا رونا نکل گیا۔ میں نے پیالی پر نوح میں رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ادھکا یا میٹھا کڑا چھوڑا اور کھڑکھڑا ہو گیا۔ اندر کاؤنٹر کی طرف جلتے ہوئے میں نے لٹو پیپر سے اپنی آنکھیں پونچیں اور بیرے کو وہیں ہلکا کر پلے منٹ کر دی۔ ریسٹوران سے باہر نکلتے ہوئے میں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بڑی بے عزتی کی بات تھی اشتقاق جی! دو پچول کا باپ، بنک ملازم، تعلیم یافتہ، مرد ذات، اس طرح سے چھپھماتا ہوا اچھا لگتا۔ میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، لیکن میرے دل میں ایک بہت بڑی گندمی جنس گئی تھی۔ تین نوکروں والی جیسے لنگر نہیں ہوتا پانی میں بھیکنے والا، ویسی! اور وہ لڑکی بھی اتنی خوبصورت تھی اشتقاق جی کہ بندے کا رونا نکل جائے اس کو دیکھ کر۔ اس کی آمد پر سب لوگ چائے پینے والے، سارے مرد عورتیں دم سادھ کر خاموش ہو گئے تھے اور کوئی اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔

اس لڑکی نے اپنے سر پر سرخی مچھلی کے چانے اگلی فرک ٹوپی رکھی ہوئی تھی اور وہ ٹوپی کافی ٹیڑھی تھی۔ اس کا ناک نقشہ تو مجھے یاد نہیں، لیکن اس کا چہرہ اب بھی نظروں کے سامنے گوم رہا ہے۔ میں جلدی جلدی لمبے لمبے قدم اٹھاتا واپس آئینسی پر پہنچ گیا۔ وہاں سے اپنا سامان اٹھایا اور سامنے کھڑی ہوئی لاری میں سوار ہو کر پندرہی پہنچ گیا۔ ایک رات پندرہی ہوٹل میں بسر کی اگلے دن لاہور آگیا اور میاں اگر اپنی چھٹی کینسل کر واوی۔ اس عمر میں کون روز روز رہتا پھرے اور لوگوں کے سامنے ذلیل ہوتا رہے۔ دیکھو ناں جی! پندرہ دن تک تو اس نے نظراتے ہی رہنا تھا بار بار ایک ہی تو سڑک ہے ساری مری میں۔ تو میں نے کہا جاکو بجائی۔ توجی جھاگ آیا۔ دیکھو ناں! اشتقاق جی! اپنی دل بیٹی کا انہار کرنا گویا ایمان والوں کا ساتھ چھوڑ کر بجک منگوں کے ساتھ ملنا ہے اور بجک منگے تو لاکھوں ہزاروں قدم قدم پر ہاتھ پھیلائے نظر آتے ہیں!

اب جمیل نزدیک آرہی تھی اور ہم لوگوں کو احساس ہونے لگا تھا کہ اس وقت ہم منزل کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔ مسعود عمار کا بازو پکڑے اُس کے ساتھ ساتھ سر دھنکا رہا تھا کہ واہ! اپنے عشق کا انہار کرنا گویا ایمان والوں کا ساتھ چھوڑ کر بجک منگوں کے ساتھ ملنا ہے اور بجک منگے تو لاکھوں ہزاروں قدم قدم پر بازو پھیلائے نظر آتے ہیں۔ ان کے درمیان فقیروں کا کیا کام! اور جب وہ ان کے درمیان فقیروں کا کیا کام! کتنا تو لفظ فقیر سپیلیے پورج کتا تا جیسے پرانے زمانے کی لمبی گت والی لڑکی پیٹنگ میں اپنی رانوں کی طاقت سے ہلا رہی ہو، فقیروں کا کیا کام! فقیروں کا کیا کام! میں منشی! فقیروں کا کیا کام... جس نے ظاہر ہی کر دیا وہ فقیر کہاں رہا۔ کیوں اغظی! وہ آدمی تو تنکے سے بھی بولا ہو گیا۔ منصور نے انہار کر کے ہی تو مار کھائی۔ سولی پر چڑھ گیا۔ یار کا بھید کھول دیا۔ اور بھید کھولنے کی یہی سزا ہے۔ کیوں عمار! جسے کہ نہیں سزا؟ بولو یا رو!

عمار نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سوچنے لگا... کہ جب لوگ درخت سے آنے والے اِنَّا آتَاۤہُ الذَّکْرَ کی صدا کو جواز قرار دیتے ہیں، تو منصور علاج کے حزمہ سے نکل جانے والے "آتَاۤہُ الذَّکْرَ" پر گرفت کیوں کرتے ہیں۔ لیکن جو منصور کو کلمہ سحر اور زندگی کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں اور جو اس کو عالم ربانی سمجھتے ہیں وہ بھی اپنی جگہ پر درست ہیں۔

جس روز منصور علاج کو پچاسی دی جانی تھی، اُس روز صبح سے ہی لوگ منسل کی طرف روانہ

ہونے لگے تھے اور دو پہر تک سارا بغداد اُٹھ کر مقتل گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ سہ پہر کے قریب بیڑیاں اور بھگڑیاں پہنا کر منصور کو مقتل کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں لوگ آٹھ آٹھ اور آٹھ آٹھ وَحْدَہ کا شَرِیک کے نعروں لگا رہے تھے اور مزہ پر پتھر ڈھیلے، کنکریاں مار رہے تھے منصور کے دونوں طرف دو سپاہی اس کی زنجیروں کو اپنی کلائیوں کے گرد لپیٹے چل رہے تھے اور میرے سپاہی نے اس کے بالوں کو پیچھے اپنے جھگل میں جکڑ کر اس کا منہ آسمان کی طرف اُٹھایا ہوا تھا۔ راستے میں مٹاٹھیں مارتے ہوئے انسانی سمندر کی وجہ سے مزہم اور اُس کے نگران بڑی آہستگی سے چل رہے تھے اور اُن کوڑک کوڑک کر آگے سے راستہ صاف کرنا پڑتا تھا۔

کہتے ہیں کہ جس روز حسین منصور علاج کو قید میں ڈالا گیا، اُس روز لوگوں نے دیکھا کہ رات کے وقت منصور وہاں موجود نہیں تھے۔ دوسری شب نہ منصور موجود تھے نہ بندی خانہ اور تیسری شب میں بڑے آرام کے ساتھ بیڑیاں پہنے ہوئے اپنی کوٹھڑی میں موجود تھے۔ جب لوگوں نے وجہ پوچھی، تو فرمایا کہ پہلی شب تو میں حضور کی خدمت میں حاضر تھا اور دوسری شب حضور خود یہاں تشریف فرما تھے۔ لوگوں نے پوچھا پھر آج یہ واقعہ کیوں نہیں گزرا۔ فرمانے لگے، اب مجھے شریعت کے تحفظ کے لیے واپس بھیج دیا گیا ہے کہ میں قرار واقعی سزا پاؤں اور شریعت میں کوئی رخصت پیدا نہ ہو۔

قید خانے میں آپ کے علاوہ تین سوا در قیدی بھی موجود تھے۔ منصور نے کہا: کیا چاہتے ہو کہ تم کو اس جیل سے رہا کر دوں اور تمہارے مقتدریں آزادی لکھ دوں؟ تو قیدیوں میں سے چند ایک نے ایک ساتھ آواز ملا کر کہا: ”ہم بندھیوں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی؟“ آپ نے ایک اشارہ کیا تو سب قیدیوں کی بیڑیاں کٹ کر گر گئیں، پھر اشارہ کیا تو تمام قتل ٹوٹ گئے۔ پھر آپ نے قیدیوں سے فرمایا: ”جاؤ ہم نے تمہیں رہا کیا“ اور جب قیدیوں نے آپ سے التبا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، تو اُنہوں نے مسکاکر فرمایا: ”میرے اور میرے آقا کے درمیان ایک راز و ابستہ ہے جو سولی پر چڑھے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ گو میں اپنے آقا کا قیدی ہوں، لیکن شریعت کی پابندی بھی نہایت ضروری ہے اور میں شریعت پر کسی قسم کی آبرخ اُتے نہیں دیکھ سکتا، اس لیے مجبور ہوں۔ ہمارے آقا کا ہم پر عتاب نازل ہے اس لیے میں غمگین“

جس وقت منصور بغداد اور اس کے گمراہوں کا طائفہ سولی سے تھوڑی دُور رہ گیا تو شمال کی جانب سے گرمی سُنْج اُٹھی اور اُس نے بغداد کے آسمان پر بھجھو کر اپنی نگاہیں نیچے خلعت پر مرکوز کر دیں۔ اب تیسرے سپاہی نے ان کے بالوں سے اپنا ہاتھ نکال لیا تھا اور ان کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ منصور اپنی گردن گھما کر اس جہم غمگین کو دیکھنے لگے اور ہرست نگاہیں بکیر کر حَقِّ حَقِّ، اَنَا الْحَقِّ کہنے لگے۔

ایک شخص نے آگے بڑھ کر پوچھا: ”منصور! عشق کسے کہتے ہیں؟“

منصور نے ہنس کر کہا: ”آج کل اور پیروں میں تجھے معلوم ہو جائے گا۔“

جب سولی کا چہرہ قریب آگیا، تو آپ کے خادم نے روتے ہوئے وصیت کے متعلق عرض کیا، تو فرمایا: ”اپنے نفس کو تمام علاقہ دنیا سے خالی کر لے، ورنہ نفس تم کو ایسی چیزوں میں پھانس دے گا جو تیرے بس کی نہ ہوں گی۔“

جب آپ کے صاحب زادے نے آگے بڑھ کر وصیت کی درخواست کی، تو فرمایا: ”ساری دنیا ایک جہنم اور اعمال صالحہ کی کوشش کرتی ہے، لیکن تجھے علم حقیقت حاصل کرنا چاہیے، کیونکہ علم حقیقی کا ایک کتبہ بھی تمام اعمال صالحہ پر بجاری ہوتا ہے۔“

اس کے بعد آپ شاداں اور فرماں گنگنا تے اور لپکتے ہوئے سولی کی طرف بڑھے، تو قریب کھڑے لوگوں نے پوچھا: ”اس قدر سُور کیوں ہو؟“

کہنے لگے: ”اس سے زیادہ مسرت کا وقت اور کون ہو سکتا ہے جب میں اپنی منزل پر پہنچ رہا ہوں اور محبوب کے سامنے جا رہا ہوں۔“

سولی کے چہرے کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے آپ نے ذرا ہچک کر اپنی عبا کے کنارے سے سیڑھیوں پر جھاڑ دی، پھر چہرے پر آئے اور لگے بڑھ کر اس چوکنے کو بوسہ دیا جس میں چند لٹک رہا تھا۔ لوگوں نے اونچی آواز میں پوچھا: ”اپنے منافقوں اور منافقوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

فرمایا: ”میرے منافقوں کو کم از کم ایک اجر تو ضرور ہوگا کہ وہ مجھ سے سُنْج ظن رکھتے تھے، لیکن میرے منافقوں کو دو ثواب حاصل ہوں گے کہ وہ توبہ توحید میں اور شریعت پاک میں سستی

سے خائف رہتے ہیں۔ اور اس شہر کے لوگو! کان کھول کر سن لو کہ شریعت میں اصل شے توحید ہے اور جو وحدانیت سے سُرُواً انحراف کرتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں؛

اس وقت حضرت بلالؓ نے بڑی عاجزی سے پوچھا: "تصوف کس کو کہتے ہیں؟"

"فرمایا: "یہ جو تم دیکھ رہے ہو، یہ تصوف کا ادنیٰ ترین درجہ ہے، کیونکہ اعلیٰ ترین درجے سے تو کوئی واقف ہی نہیں۔ ہماری تو یہاں تک پہنچ کر رُوح فنا ہو جاتی ہے۔ پھر فرمایا: خدا کی یاد میں دنیا و آخرت کو فراموش کر دینے والا ہی واصل الی اللہ ہوتا ہے اور خدا کے سوا ہر شے سے مستغنی ہو کر عبادت کرنا فقر ہے اور خودی اپنی ذات میں اسی لیے واحد ہوتا ہے کہ نہ تو وہ کسی کو بناتا ہے اور نہ اس سے کوئی واقف ہوتا ہے۔"

پھر فرمایا: "حکمت ایک تیر ہے اور خدا تعالیٰ تیر انداز ہے اور مخلوق اس کا نشانہ ہے۔"

جب لوگوں نے پوچھا کہ سب سے بڑا اخلاق کیا ہے؟

تو آپؐ نے فرمایا: "سب سے بڑا اخلاق جنائے مخلوق پر صبر کرنا اور اللہ کو بچا کر لینا ہے۔ جس طرح بادشاہ ہر لمحہ ہوس ملک گیر میں مبتلا رہتے ہیں، اسی طرح ہر لمحہ ہم مصائب کے طالب رہتے ہیں۔"

پھر زمین کی طرف نظر سے جھکا کر کہنے لگے: "ذاتِ خداوندی جس پر مشکشف ہونا چاہی ہے، تو ادنیٰ سی شے سے لے کر اس پر مشکشف ہو جاتی ہے، ورنہ اعمالِ صالحہ کو بھی قبول نہیں کرتی؛ البتہ ایک بات ضرور ہے کہ جب تک صبر نہ کیا جائے غایت حاصل نہیں ہوتی اور صبر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے مولیٰ پر چڑھا دیا جائے تب بھی اُس کے مُنہ سے اف تک نہ نکلے؛

اس کے بعد جلاوٹ کے کہنے پر لوگوں نے آپؐ کو سنگسار کرن شروع کر دیا جس کو آپؐ نہایت خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ جب جلاوٹ کے اشارے پر لوگ سنگساری سے رُکے اور اُس نے آگے بڑھ کر مشیرِ آبِ دار سے ان کے دونوں ہاتھ کاٹنے، تو خون کو قوارہ اُبل پڑا۔ لوگوں نے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ تو آپؐ نے نگہ میں آسمان کی طرف اُٹھا کر سرگوشی میں مگوئی ادا کیا، پھر خن بہا کی کلائیوں کو چہرے پر پیر کر نظریں اُونچی کیں اور کہا: "میری سُرُخرونی چنپی طرح سے مشابہہ کرو۔ کیونکہ خونِ جگر اُن مردوں کا اُٹھن ہوتا ہے۔"

اس کے بعد خونِ آسمان کلائیوں کو کلائیوں تک پھیرتے ہوئے فرمایا کہ میں نمازِ عشق کے لیے وضو کر رہا ہوں، کیونکہ نمازِ عشق کے لیے خون سے ہی وضو کیا جاتا ہے۔

پھر جلاوٹ نے آنکھیں نکال کر زبان کاٹنے کا قصد کیا، تو علاج نے فرمایا: "مٹھو! مجھے ایک بات کہہ لینے دو۔"

پھر اونچی آواز میں بولے: "اے اللہ! میرے اتھیری راہ میں قطع کر دیے گئے۔ آنکھیں نکال دی گئیں اور اب سر بھی کاٹ دیا جائے گا، لیکن میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے ثابت قدم رکھا۔ اب میں تیرے حضور ایک التجا کرتا ہوں کہ ان سب لوگوں کو بھی وہی دولت عطا فرما جو مجھے عطا فرمائی ہے، کیونکہ یہ سب شریعت کی حفاظت کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں اور شریعت کی حفاظت ہر حال میں بے ضروری ہے۔"

پھر جب دوبارہ سنگساری شروع ہوئی، تو آپؐ کی زبان پر یہ کلمات تھے: "واہ وا۔۔۔ سبحان اللہ! کیا تکلیف دہ سستی تھی کیا کر دیتی ہے۔"

کسی بزرگ نے مشائخین سے فرمایا کہ جس رات منظور کو دار پر چڑھایا گیا تو میں صبح تک مولیٰ کے نیچے مشغول عبادت رہا، جس وقت دن نمودار ہوا، تو ہاتھ نے یہ ندا دی: "ہم نے اپنے رازوں میں سے ایک راز کا کھس پر مطلع کر دیا تھا، جس کو اس نے ظاہر کر کے یسر پائی۔ اور یہ درست ہوا کیونکہ شہر ہی راز کو افشا کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

اور مسعود پوچھا رہا تھا: "کیوں یارو!... بولو!... بتاؤ!... بھید کھولنے کی سزا ہوتی ہے یا نہیں... کیوں عطا دے... کیوں مفتی!... مٹا ہی!۔"

لیکن ہم اس کی بات کا جواب دینے بغیر سر تھکاتے چل رہے تھے، کیونکہ ہمارے پاس ننگی راز تھانہ افشا تھانہ سزا تھی۔

آسمان کے اُوپر پُر مری بادلوں کی گہری تہمتی اور اس کے نیچے دھند کا طوفان سا آیا ہوا تھا۔ عطا ابھی تک غصے میں تھا اور اس سے اچھی طرح سے بات نہیں ہو رہی تھی، مسعود بھی بڑبڑا رہا تھا اور اعلیٰ بھی شکایت کر رہا تھا میرے دل پر بھی بڑا بھاری بوجھ تھا، لیکن میں خاموش تھا۔ مفتی ہم سب کو تسلی دینا چاہتا تھا، لیکن اس کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ کوہستانی ہم سب کو اس حالت میں

دیکھ کر اندر سے خوشی کا اظہار کر رہا تھا اور اس کی باچیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے سامنے نہیں دیکھ رہا تھا، بلکہ ٹوٹ گھٹا تھا جیسے اس کی گردن اس کے بائیں کندھے پر لگی ہو اور اس کا چہرہ ہماری طرف پھن بن کر اٹھا ہوا ہو۔

عماد نے ایک مرتبہ پھر تڑپ کر کہا: کیا تھا! مر جاتے! ڈوب جاتے! غرق ہو جاتے!“
 ”دیر بہر ہی تھی۔ لیڈر نے کہا۔“ اور اندر میرے میں راستہ بھول جانے کا اندیشہ تھا۔ مجبوری تھی عماد!“

”راستہ بھول جاتے تو کیا قیامت! باقی راستہ بھول کر“ مسعود نے غراتے ہوئے کہا: اب نہیں راستہ بھول سکتے!“

”ابھی تو روشنی ہے اور واپس ہو مل تک پہنچتے پہنچتے کم و بیش اسی طرح رہے گی۔ لیڈر نے جواب دیا۔“ اور ہم گرم پانی کی بالٹوں میں نمک ڈال کر کچھ دیر اپنی نچھان دوڑ کر سکیں گے۔ وہاں بیٹھے تو بہت دیر ہو جاتی مسود!“

”اور میں جو کہ رہا تھا کہ رات میں گزار لیتے ہیں، عماد نے کہا۔“
 ”اور میں نے جو وہ کموڈو منزل تھی جس کے اندر اخبار پکے تھے، غلطی نے کہا۔“

”تو پھر اس نے روک دیا ناں سہائیو!“ مفتی نے اپنی سواری کی طرف اشارہ کر کے کہا
 ”اس نے، تمہارے اس کو بہستانی نے“

”بالکل ٹھیک روکا صیب! ادھر رات کے وقت نہیں ٹھہر کر تے صیب! یہ پری لوگ اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں۔ نہ پوچھیں، تو بالکل نہ پوچھیں۔ سالوں سال گزر جائیں۔ اگر غار بند کریں اور کھوکھے آگے کھڑا کلام پڑھ دیں... تو... بس... پھر کچھ نہیں ہو سکتا!“

”اوتے چھوڑو!... پر مایاں! عماد نے بل کر کہا۔“ دیکھیں ہوتی ہیں میری... یہ پر مایاں!“
 ”میرا اندازہ ہے مسود بولا۔ ہم سینٹرل ڈیڑھ گھنٹہ تک اور وہاں رک سکتے تھے اور ایک پون

گھنٹے میں بڑی آسانی سے واپس اپنی منزل تک پہنچ سکتے تھے۔ اب تو ڈھلان ہی ڈھلان ہے۔“
 مفتی نے کہا: ”میرے لیے تو ہر دو گھنٹہ ہے۔ اس وقت واپس نیچے کو جاتے ہوئے میری

دونوں جاگھول کے اندر ان خوابیدہ پنچوں کو کھینچ پٹنے لگی ہے جن پر گزشتہ تیس سال سے کسی قسم

کا بوجھ نہیں پڑا تھا۔“

مسود نے کہا: ”کیا خوبصورت نیلا لکڑی کا ٹھنڈے پانیوں کا“

”نہیں صیب نیلا نہیں تھا، کو بہستانی نے کہا۔“ بجلی سیٹی تھا۔ پریوں کے ملک کا پانی ہمیشہ بجلی سیٹی ہوتا ہے۔“

”اچھا جیلا ایک ریٹ ہاؤس بھی تھا وہاں۔“ عماد نے غصے اور غم کے بلے میں تقریباً رو کر کہا۔

”وہ ہے صیب پر اس کا دروازہ نہیں گھٹتا۔“
 ”کیوں؟ دروازہ کیوں نہیں گھٹتا اس کا؟“ غلطی نے پوچھا۔

”بس جی! نہیں گھٹتا صیب! کوئی اللہ کی حکمت ہے۔“
 ”تو اس میں کوئی نہیں ٹھہرنا؟“ غلطی نے پوچھا۔

”ٹھہرنا ہے صیب! ٹھہرنا کیوں نہیں... جب بنایا ہے تو ہر ایک ٹھہرنا ہے۔“
 ”اس کو چھوڑو! رار!“ مفتی نے اپنی کپٹی پر اٹھ کر کہا۔ ”ہی انٹنس“

”تم پہلے بھی یہاں آئے ہو غمان؟“ عماد نے پوچھا۔
 ”ہاں جی صیب! سارے لوگ آتے ہیں۔“

”سارے لوگ کی بات چھوڑو!“ مسود نے کہا۔ ”اپنی بتاؤ۔ تم اس سے پہلے بھی یہاں آئے؟“ بجلی سیٹی پانی دیکھنے کہ آج ہمارے ساتھ ہی آئے۔“

”ہاں جی!“
 ”اوتے ہاں جی کوئی جواب ہے بہ نیت! لیڈر نے بل کر کہا۔ یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے بھی

کبھی یہاں آئے ہو کہ نہیں!“
 ”آتے ہی رہتے ہیں صیب!“

”تم آئے تھے کہ نہیں؟“
 ”بس کے ساتھ صیب؟“

”کسی کے ساتھ ضروری نہیں۔“ ادھر آئے تھے کہ نہیں؟ کسی کے ساتھ یا کیلے!“

”ادھر تو سب ٹولی ٹولی میں آتا ہے صیب!“

”تم بھی ٹولی میں آیا تھا؟“

”ہاں جی!“

”یا اکیلا آیا تھا؟“

”اجتا جی!“

”اعظمیٰ نے کہا: ”یار کیوں اپنا دماغ خراب کرنا ہے اور ساتھ ہمارا بھی۔ اس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ تم کیا پوچھ رہے ہیں!“

”اور میں اس بات پر حیران ہوں کہ پوچھ کیوں رہے ہیں؟“ مفتی نے جھلا کر کہا۔

”عماد نے کہا: ”ابھی تھوڑی دیر اور وہاں بیٹھ لیتے، تو کیا ہو جاتا۔ چاندنی رات تھی، اگر تم دس گیارہ بجے کے بعد بھی چلتے تو بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس پہنچ جاتے، لیکن اس بلاصل لیڈر نے ہمیں کچھ دیکھنے بھی نہ دیا۔“

”مسعود نے کہا: ”اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ وہاں کیا تھا اور کون کس طرف تھا اور کون سی جگہ، کہاں تھی، تو میں کچھ بھی نہ بتا سکوں گا۔“

”اتنے قریب پہنچ کر بھی قُربت کا احساس نہ ہو مفتی، تو کتنا بڑا غلطیہ جاتا ہے!“ اعظمیٰ نے کہا۔ ”یہ ہم سب کو ہر کیا گیا تھا بھلا۔“

”کچھ نہیں بُلا تھا۔ بس اس لیڈر نے تباہ کیا۔“ عماد بولا۔ ”میں تم لوگوں سے کہہ رہا تھا، کہ رہا تھا کہ ابھی نہ جاؤ، ابھی نہ جاؤ، لیکن تم نے میری سنی ہی نہیں۔ مفتی جی بھی لیڈر کے پیچھے لگ گئے چھوٹے بچے کی طرح۔“

”میری کون سنتا ہے بھائی، مفتی نے کہا۔ ”مجھے کون پوچھتا ہے؟“

”پتہ نہیں۔“ مسعود نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ”مجھے تو یقین نہیں آ رہا... اور اب تو کچھ بھی دکھائی نہیں

دے رہا... پھر وہ تھوڑی دیر تک کہہ بولا۔ ”تم کہو وہ اخبار کہاں دکھائی دیے تھے؟“

”کون سے اخبار؟“ اعظمیٰ نے پوچھا۔

”وہی جو تم نے کھوہ میں پکے دیکھے تھے؟“

”کون سی کھوہ؟“ اعظمیٰ نے پوچھا۔

”وہی جس کا تم ابھی ذکر کر رہے تھے۔“

”میں نے تو کوئی ذکر نہیں کیا۔“ اعظمیٰ سنجیدگی سے بولا۔

”کیوں شہابی! مسعود نے میری طرف گھوم کر کہا۔“ اس نے ابھی کہا نہیں تھا کہ ایک کھوہ کے اندر اخبار بچھے تھے۔“

میرے جواب دینے سے پہلے کوہستانی بول اٹھا:

”اس صیب نے کیا تھا ذکر! لیکن جی میں نے نہیں دیکھا کچھ اخبار مخابر... مجھے تو مالوم بھی نہیں کھوہ کدھر تھا؟“

”تم ہمارے ساتھ نہیں تھے؟“ عماد نے پوچھا۔

”میں تو ہر وقت ساتھ ہوتا ہوں صیب!“ کوہستانی نے کہا۔ ”تم تو موزوں درجے جی... خیرت کرنے والا... ہم تو صیب لوگوں کے پیچھے پیچھے رہتا ہے ہر وقت۔“

”لیکن اس وقت تو تم نہیں تھے جب ہم ریسٹ ہاؤس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔“ اعظمیٰ نے کہا۔

”ہم تو دیکھ رہا تھا ناں صیب!“ کوہستانی نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم تو نہیں تھے ہمارے ساتھ جب ہم چابیاں لٹائی کر کے دیکھ رہے تھے۔“ مسعود ڈرا تلخ لہجے میں بولا۔

”نہیں صیب! ہم دیکھ رہا تھا، بالکل دیکھ رہا تھا صیب! اس صیب کی چابی سب سے اچھی لگی تھی۔“ اس نے عماد کی طرف اشارہ کیا۔ ”تھوڑا کسرہ گیا تھا گلنے میں۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہے؟“ عماد نے چرنگ کر پوچھا۔

”ہم تو کاڈی ہے صیب، عزمت کرنا ہمارا کام ہے۔“

”لیکن تم وہاں موجود تو نہیں تھے خان!“ عماد نے مزید حیران ہو کر کہا۔ ”ہم نے تو تم کو ارد گرد نہیں دیکھا تھا۔“

”آپ کیسے بتائیں کرتا ہے صیب! ہم تو آپ لوگوں کا فراموشی ہے... ہم کدھر جا لے گا جی!“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ حضورؐ کا جُنتِ مبارک اور گودڑی لے کر حضرت اویس قرفی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُن سے عرض کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہم یہ مہربوس مُطہر لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ اپنے آقا و مولا کا حکم بجالانے کو ہم یہاں پہنچے اور مقامِ فخر ہے کہ ہم نے اپنی اُنکھوں سے اور اتنا قریب سے آپ کی زیارت کی۔

ستارِ عاشقان حضرت اویس قرفی اس وقت اُونٹ کے بالوں کا ایک لمبا سا کرتہ پہنے تھے۔ وہ اپنی بھیڑیوں کا گلہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کی جھاڑی میں چھوڑ کر ان خوش بخت سفیروں کی پذیرائی کو اُٹے تھے۔ انہوں نے سرمایہٴ عظیم کو کلاس کی بہاساری کائنات میں کہیں بھی نہ تھی، پہلے اپنے ماتھے سے لگایا، پھر اپنی آنکھوں سے اور پھر دیر تک اسے چومتے اور اس پر اپنی پیشانی نلتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ مبارک گودڑی اُنسوؤں سے تراریز ہو گئی۔

پھر آپ نے اس ستارِ گواں بہا کو اپنی کنیوں سے سینے سے چٹالیا۔ ایک مرتبہ پھر اس صاحبِ برکت گدھے نے اپنے دونوں ہاتھ لگے بڑھا کر دستِ نبیؐ شکن ان میں لے لیا اور اپنے کپکپاتے ہونٹوں سے اُسے بوسے دیتا رہا، پھر اسی طرح اُنہوں نے حضرت عمرؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اپنا ماتھا اس پر رکھ دیا۔

کافی دیر تک یہ تینوں عاشق ایک مثلث کے نقطوں پر اُنسے اس طرح ساکت اور جامد کھڑے رہے اور صحرا کی باریک بھوری اور شفاف ریت اُن کے درمیان سے گزرتی رہی۔ پھر یمن کے عاشق نے سر اُپر اٹھایا اور مدینے کے سفیروں سے پوچھا:

”آپ تو محبوبؐ کے قریب رہے ہیں اور بہت ہی قریب رہے ہیں اور دن رات قریب رہے ہیں سبھی یہ فرمائیے کہ حضورؐ کے اُبرو و مبارک کس انداز کے تھے؟“

جاں نثارانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ادب سے خاموش رہے۔

پھر ستارِ عاشقان نے حضورؐ کے حیرت انگیز انداز کی تفصیلات بیان کرنا شروع کیں اور رفیقانِ رسولؐ وہیں کھڑے کھڑے شہیدِ مبارک ملاحظہ فرماتے رہے۔

جب آپ خاموش ہو گئے، تو حضرت عمرؓ نے جُرات کر کے پوچھا:

”ستیدنا! آپ تو حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں تشریف نہیں لائے۔ اور آپ نے تو انہیں ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا، پھر آپ کس طرح ان کے رُخِ مبارک کے ندوئال کی تفصیلات بیان فرما رہے ہیں؟“

حضرت اویس نے اپنی سفید لمبی داڑھی جُنتِ مبارک سے نلتے ہوئے کہا:

”آپ حضرات نے حضورؐ کو نہ ہونے کے مقام پر دیکھا۔ ہم اور میں نے نہ ہونے کے مقام پر محبوب کی خدمت میں اپنی رُوح کو حاضر کیا ہے۔ آپ خوش نصیب تھے کہ نعمت ہر وقت آپ کے رُوبرو تھی۔ ہم دُور تھے اور قُرب کی دید سے محروم تھے اور خوش نصیب اور محروم میں یہی فرق ہوتا ہے کہ محروم ہر وقت نعمت کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور اس کے لیے حوصلے رہتا ہے۔ نہ ہونے کے مقام پر دیکھنے والے کی صرف آنکھیں ہی نہیں کچھیں اس کا سارا وجود طلب بن جاتا ہے۔“

مفتی کمرہا تھا:

”یار اتم لوگوں نے کیا کھیل ڈالا ہوا ہے... کیوں تجوں کی طرح لڑ رہے ہو کسی نے تمہارا امتحان تو نہیں لیتا کہ کیا دیکھا اور کیا نہیں دیکھا۔ کسی نے انٹرویو تو نہیں کرنا!“

”انٹرویو تو نہیں کرنا مفتی جی، لیکن کم از کم وہاں بیٹھے تو سہی، قریب ہو کر۔“ عماد نے کہا۔
”تمہارا خیال ہے قریب ہو جانے سے گیان حاصل ہو جاتا ہے۔ دید ہو جاتی ہے، مفتی نے سڑک کہا۔ اگلی مل جاتی ہے۔“

”اور ایسے ہی ٹوٹ آنے سے بھینچنا مل جاتا ہے۔“ مسعود نے کہا۔ ”فوٹو پرنٹ مل جاتا ہے!“
”تم لوگوں کی دوڑ فوٹو پرنٹ سے آگے جا ہی نہیں سکتی، مفتی نے جھلکا کر کہا۔“ تم لوگوں کے ذہنوں پر فوٹو سٹیٹ کا قبضہ ہو گیا ہے اور فوٹو سٹیٹ مشین نے ہم سب پر سٹف کے دولہے بند کر دیے ہیں۔ اس نے ہمیں حقیقی یقین کی نعمت سے محروم کر دیا ہے۔ جتنی جتنی ایک شہر میں فوٹو سٹیٹ مشینیں بڑھتی ہیں اُسی قدر وہاں مس ٹرسٹ بڑھتا ہے۔ بے اعتمادی بے تیرا اور بے اعتمادی بڑھتی ہے۔ لوگوں کے اندر شک پیدا ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کی مصدقہ نقل مانگتے

ہیں اور جہاں شک پیدا ہو جائے وہاں خوف کے پنچے اور گھرے گڑ جاتے ہیں۔ کیوں تم ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر تسلی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ کیوں یہ سمجھتے ہو کہ... اگر کسی وجہ سے... مسعود نے مفتی کی بات سنی ہی میں کاٹ دی۔ اس کو بھی غصہ آگیا اور غصے کے ساتھ اس کی زبان بھی گھل گئی۔ اس نے لڑک کر کہا:

”اس لیے کہ امپیریکل میتھز کا تعلق غائبی ہی ہے۔ سائنٹیفک طریق ہے ہی یہی۔ آنکھوں سے دیکھ بھنا اور قریب سے دیکھ بھنا اور غور سے دیکھ بھنا کوئی کس طرح سے مان سکتا ہے کہ یوں بھی ہو سکتا ہے؟“

”اؤئے گدھو! کتو! اؤئے بے حیاؤ!!! شرم کرو! مفتی نے کہا۔ جب تم کوئی چیز آنکھ سے دکھاتے ہیں، تو کئے نگتے ہو، یہ تو نظر کا دھوکا ہے۔ اشتباہ نظر ہے۔ یہ چوبیس ساکن فریم فی سیکنڈ گزر رہے ہیں، تو پردہ سب سے پر تصویر متحرک دکھائی دیتی ہے، نہیں تو کس ہے۔ یہ جوئی وی سکرین پر رنگ دار لڑکی بیٹھی ہے، لڑکی تو نہیں، چھ سو پچیس لائیں ہیں، بہت سے نقطے ہیں، چھوٹے چھوٹے لڑکی تو نہیں۔ آسمان میں دن کے وقت تار کے نظر نہیں آتے، تو تارے ہیں ہی نہیں... لعنت ہو تم پر... گویا جس چیز کا تمہیں مشاہدہ نہیں وہ ہے ہی نہیں۔“

مفتی کے منہ سے جھگ نکل رہا تھا اور وہ بڑھے بیل کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کے غصے اور کرب کو دیکھ کر کوہستانی مفتی کے قریب آگیا اور انکلی اٹھا کر کہنے لگا:

”بالکل ٹھیک صیب! شا باش... آپ بالکل ٹھیک کہتا ہے، سولہ آنے...“

شا باش!

مفتی نے چڑا کر کہا:

”اچھا اچھا خان! ٹھیک ہے، مہرانی، شکریہ“

لیڈر نے سوئی اُپر اٹھا کر کہا:

”والیسی پر ہر ممبر کو سالو بل اسپرین کی ایک ایک گولی، مٹی وٹامن کا ایک کیپسول اور

وٹامن سی کی ایک ایک گولی کھانی ہوگی۔ یہ ڈرل ابھی سے سن لو کھانا ا کھانے کے بعد بتائی گئی گولیاں۔ گولیوں کے بعد نمک اور سرکٹے گرم پانی میں پنڈلیوں تک ٹانگیں ڈبو کر بیٹھنا اور اس

کے آدھ گھنٹہ بعد رضائی پلیٹ کر اور منہ باہر نکال کر سو جانا۔ اور صبح جب تک نہیں نہ اٹھاؤں لیے رہنا۔“

ہمیں سے ہر ایک نے لیڈر کی ہدایات کو بغور سنا، لیکن اُسے ہی امپیریشن دیا کہ کسی نے اس کی بات نہیں سنی اور کسی نے اس کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا۔

مسعود عمار کی کبھی پکڑے اس کے ساتھ کھسکھس کر تاجا رہا تھا اور اُسے سمجھا رہا تھا: ”جو شخص بغیر کسی ایڈ کے یا آلے کے یافتی سہارے کے لوگوں کے دلوں کا حال معلوم کرے، اور اُس کو کئے والے واقعات کا پہلے سے علم ہو جائے کہ وہ صاحب حال ہوتا ہے۔ وہی زلزلے کی آنکھ کا تار بن کر چمکتا ہے اور اسی کو اقبال نے رموزِ بے خودی میں کہا ہے... کہ... اگر...“

لیکن اس بے چارے کا فقرہ پہنچ میں رہ گیا جب مفتی نے لڑک کر کہا: ”کیا ایک رہا ہے، کیا سمجھا رہا ہے اور کس کو سمجھا رہا ہے اور کیوں غلط سمجھا رہا ہے؟“ ”میں صاحب حال کی بابت بتا رہا ہوں مفتی!“ مسعود نے خفت ٹالتے ہوئے کہا۔ ”وہی جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے...“

لیکن مفتی نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ دی اور گرج کر کہا: ”تجھے کیا پتہ صاحب حال کیا ہوتا ہے۔ تجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بیر کا پینڈا کدھر ہوتا ہے اور چلا ہے صاحب حال کی بابت سمجھنے“

”شاباش!“ انٹلمی نے چمک کر کہا۔ ”سالا لوگ کو یہ بھی پتہ نہیں کہ ایک صاحب حال ساتھ جا رہا ہے اور اس کی وجہ سے راستہ روشن ہے۔ مگر یہ خواہ مخواہ میں جھگڑ رہا ہے بد بخت لوگ... دیکھو تو! اس نے مفتی کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”دیکھو کون جا رہا ہے ہمارے ساتھ۔ ذرا غلط تو کرو۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب“

”تم بھی کبواس بند کرو اپنی“ مفتی نے جھڑک کر کہا: ”اور اس میراث گیری سے ہم کو نجات دو۔ بہت کچھ سن لیا ہم نے تم سے۔ ناؤشٹ اپ!“

لیڈر بوزنے کی طرح سوئی سے اپنی کمر باریاں اٹھا اور بے چین تھا۔ اس نے حوصلہ کر کے

قدرے بلند آواز سے کہا:

”تم بتاؤ شاہ جی! تم تو بزرگانِ دین کے پاس اٹھنے بیٹھنے کے دعوے کرتے رہے ہو۔ تم سمجھاؤ“

”اس کو کیا پتہ دست بستہ ملا کہ“ مفتی نے کہا۔ ”یہ تو بیٹھ چال کا ایک لہلا ہے جو چینی گلوانے کے لیے اپنی پشیم پال رہا ہے اور بزرگوں سے گیسٹ پاس لے کر انٹروں کے بعد جنت میں جانے کے پلان بنا رہا ہے“

”سنو“ مفتی کو دک کر بولا۔ ”صاحبِ حال کوئی بزرگ نہیں ہوتا۔ کوئی پہنچا ہوا ولی یا کوئی صاحبِ کرامت پیر نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ کسی خاص مقام پر ہوتا ہے۔ ٹیک لگا کر اور آس جاکر۔ بلکہ وہ ہونے اور نہ ہونے کے مقام سے یکساں طور پر گزر رہا ہوتا ہے۔ صاحبِ حال میرے ساتھ اور صاحبِ مشاہدہ نہیں ہوتا کہ تم اسے بزرگ سمجھنے لگو۔ نہ ہی اس پر کوئی واردات گذر رہی ہوتی ہے۔ اور نہ ہی وہ کسی خاص تجربے کا نمونہ ہوتا ہے“

مفتی کی یہ بات سن کر ہم سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور ہم اسے غور سے دیکھنے لگے۔ وہ کہہ رہا تھا:

”صاحبِ حال کوئی مٹی کا مادہ نہیں ہوتا۔ جذبات سے ماری بے ضرر یا بے آزار، لائیو سائن انسان! وہ ایک بیدار شخص ہوتا ہے! چوکس، خبردار، ہر وقت موجود، ہر آن حاضر! اس کی راہ میں نام و نمود، عزت و شہرت، حیثیت و منصب۔ کچھ بھی حائل نہیں ہوتا، کیونکہ یہ سب چیزیں تو اس کے رستے کی دھول ہوتی ہیں جن پر چل کر وہ حال تک پہنچا ہوتا ہے۔ وہ تو بڑا گرم مزاج، تندخو اور کٹیلا ہوتا ہے۔ پنجہ مار کر دھکیلنے یا لپٹنے والا نیروبی کا شیر۔ تیسری آنکھ سے دیکھنے والا اینٹا صفت زرافہ! یہی تو وجہ ہے کہ صاحبِ حال پہنچے ہوئے لوگوں اور صاحبِ کرامت بزرگوں کو ہمیشہ ناگوار گزرتا ہے“

ہم اپنی اپنی جگہ ساکت و صامت ہو گئے اور ہمیں یاد بھی نہ رہا کہ ہم کون سی جگہ پر کھڑے تھے! اس وقت کیسا سماں تھا۔

مفتی کہہ رہا تھا:

”صاحبِ حال صرف اُن لوگوں کو نظر آتا ہے جو سمجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جنہوں نے گل سمجھ لی ہوتی ہے اور جن کے اندر کارولامٹ چمکا ہوتا ہے۔ صاحبِ حال کسی دوسرے آدمی سے مختلف نہیں ہوتا اور وہ بھی کیوں اور بھی کیسے سکتا ہے کہ دوسروں سے مختلف نظر آنے کے لیے کچھ نمایاں خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی خصوصیات جن پر کھٹ سے نظر پڑے۔ رجسٹر سے چرنکائیں اور اپنی طرف متوجہ کریں، لیکن صاحبِ حال میں نظر آنے والی کوئی خوبی ہوتی ہی نہیں اور چونکہ اس میں کوئی خوبی نہیں ہوتی، اسی لیے وہ صاحبِ حال ہوتا ہے“

ہم سب نے نظریں گھا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو مفتی نے کہا:

”وہ تو ایسے دکھائی دیتا ہے جیسے اس نے زندگی سے کچھ سیکھا ہی نہ ہو۔ اس سے ہر طرح کی حماقت سرزد ہو سکتی ہے۔ وہ ہر طرح کی نا تجربہ کاری کا، نادانی کا متحمل ہو۔ بے شعور سادہ لوح اور سادہ خاطر ہو۔ ہر کی اور ہر کوتاہی کا شکار نظر آتا ہوا اور معمولی بے معنی اور لالینی کا صمیم ادراک رکھتا ہو۔ اصل بات اس کی سمجھ میں آگئی ہو کہ معمولی، ادنیٰ، لاشے اور لامکان ہی حقیقت ہے اور بے حقیقتی ہی اصل اور حیرت واقعہ ہے۔ جس چیز کا تذکرہ نکالو گے اور جس قدر گہرے جاؤ گے، آخر میں اُس کے معمولی، ادنیٰ اور حادث ہونے کا یقین ہی حاصل ہوگا۔ جس قدر گہمیر آوازیں اعلان کرو گے، اُسی قدر ناپائیدار، سرسراہٹ، آبی جانی اور مٹی کی آوازیں ہی جوب ملے گا۔ اور میرے پیارے دوستو! حقیقتیں کوئی آسمان کے تارے نہیں ہیں وہ بھی معمولی اور حادث کی حاصل ضرب ہی ہیں۔ بے حقیقتی کی جمع تفریقیں ہی ہیں۔ مفتی بتا رہا تھا حقیقت کا کوئی خصوصی منصب نہیں ہوتا۔ کوئی سندرکٹ نہیں سجا ہوتا اس کے سر پر۔ سچ کے آگے کسی قسم کا ”باادب“ یا ملاحظہ ہوشیار! نہیں ہوتا۔ سچ تو بس معمولی اور لالینی اور آبی جانی کی آگئی ہوتا ہے اور میری آگئی رکھنے والا شخص صاحبِ حال ہوتا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ صاحبِ حال کی تپا شش مثل ہے۔ یہ کیسے ملتا نہیں اور سب پر مٹا نہیں تو اس کے ہاتھ پر ہیبت کس طرف سے کی جا سکتی ہے۔ اس کے نقش قدم پر چلائیے جا سکتا ہے اور اس کی آگس سے استفادہ کیونکر کیا جا سکتا ہے“

ہم سب نے جو نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور یہی پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ ہمارے درمیان کوئی صاحبِ حال موجود ہے جس کا علم ہر شکل ہے۔ میرے دل کے قلوب نے اپنی سوئی عابد زائد نمازی، تہجد گزار عبادت کی طرف پھیر دی اور مجھے وہاں سے سگنل کی ایک 'نوٹس' ملی بھی، لیکن مفتی نے پھر کتنا شروع کر دیا:

”مسنو بے نصیبو! صاحبِ حال کوئی رُو حانی آدمی نہیں ہوتا۔ نیک، نمازی، پرہیزگار۔ کوئی مذہبی پیشوایا جید پرورش۔ نہ وہ فلسفی ہو سکتا ہے نہ مستطیع اخلاق۔ نہ تو نازک نمک چڑھا مرشد ہوتا ہے۔ نہ اصول، قانون اور ضابطے کا پابند مولانا! اس کے ہاں کوئی نئے طے شدہ نہیں ہوتی۔ وہ کسی ایک محور پر قائم نہیں ہوتا۔ اس کی سوئی کسی جگہ اٹکی ہوئی نہیں ہوتی۔ کبھی تو وہ اس بات کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے جسے اُس نے دھونس دھاندلی سے ہر ایک کو منایا ہوتا ہے اور کبھی اس بات کو ماننا شروع کر دیتا ہے جس سے وہ عجز و خوف رہتا ہے۔ صاحبِ حال ہماری تمہاری طرح سے کوئی مفید اور کارآمد شخص نہیں ہوتا۔ بس ایک شخص ہوتا ہے جو ہونے کے ناطے سے ہوتا چلا جاتا ہے“

عماد اور مسعود دونوں شک کی نظروں سے غلطی کی طرف دیکھ رہے تھے اور مفتی کہہ رہا تھا:

”صاحبِ حال کی تعلیم میں ہر طرح کا کوڑا کرکٹ اور گندڑ پھوس بھرا ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم میں وہ دانش ہوتی ہے جو حادث ہونے پر ہوگی ہو۔ ہر فانی اور بے بنیاد اور گزراں شے ہی اس کی دانش ہوتی ہے اور چونکہ وہ سچ کی نمائندگی نہیں کرتا۔ حق بات نہیں کہتا سچ کی تعلیم نہیں بخٹھو نسا، اس لیے اُس کا وجود ہر شخص کو آگے سے ہٹنا کر دیتا ہے۔ اس کو گل سمجھنے پر لگاتا ہے، اس کے اندر کارو لا مٹاتا ہے۔ اس کا وجود ہر اُس راستے کو جھٹلاتا ہے جس پر لوگ حق، حقیقت، اصول، آدش اور نظریات کے جھنڈے لے کر چل رہے ہوتے ہیں“

پھر مفتی نے سر سے پاؤں تک لیڈر کو دیکھا اور بخٹھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ ہم سب نے بھی اسی طرح لیڈر کو دیکھا اور ہمارے اندر ایک نئی دریافت نے جنم لیا۔ مفتی بڑے بامعنی انداز میں ہنسا اور کہنے لگا:

”صاحبِ حال ایک راہزن ہوتا ہے، ایک لٹیرا، ایک ورغلاؤ چھلیا، مجذوب، دغا باز، باصفا مرد حق آگاہ، سادھو، بھوندو، بدھو، تجربات کا پنوڑ، راست قدم ڈاکو، رحم دل قاتل، نو عشر شزدہ، پنگھوڑے کالال، ایک عابد، زاہد، جوگی، راہب، بھوکا، یا تری، بخارا، دیوتا رُوپ، دیوتا سمان، ایسا دیوتا جو ہر گھڑی، ہر شے کی بے اختیاری لاپاری اور بے اثری اور بے مقدوری کا اکھ جگاتا ہے اور تمہاری نا اہمی پر دوتا ہے کہ تم گل کیوں نہیں سمجھتے۔ آگے کیوں نہیں حاصل کرتے۔ تم نے اس قدر دیکھا، اس قدر بھالا۔ ایسے ایسے مشاہدے کیے پھر بھی کورے کورے رہے۔ پھر بھی آگے حاصل نہ کر سکے۔۔۔۔۔ افسوس۔۔۔ صد افسوس۔۔۔ ہائے۔۔۔ ہائے۔۔۔ ہائے“

اس وقت میرے ساتھیوں اپنی سوالیہ نظروں سے مجھے گھیر لیا اور میرے اُد پر ایک ریزہ پھینکنے لگے۔

مفتی نے ان کے گل کو پہچان کر کہا:

”صاحبِ حال ہر کسی کا دل بھاتا ہے۔ ہر ایک کے خمرے اٹھاتا ہے، ہر ایک کا رانجھا راضی کرتا ہے، لیکن پکڑائی نہیں دیتا۔ کسی کو ڈا ہی نہیں دیتا۔ اور جو کسی کو پکڑائی نہ دے، ڈا ہی نہ دے، وہی محبوب ہوتا ہے اور چونکہ صرف اس کو آگے ہوتی ہے، اس لیے اس سے بڑا محبوب اور کون ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ وہ بہت ہی بڑا محبوب ہوتا ہے اس لیے کسی کو اس کے دیکھنے کی جرات ہی نہیں ہوتی اور چونکہ ذات کا سارا معاملہ خبر کا ہے اس لیے اس کے مشورہ ہو جانے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ خلق کا سارا معاملہ راحت کا ہے، اس لیے وہ نظروں سے اوجھل ہی رہتا ہے، لیکن دوستو! ”مفتی نے انگلی اُد پر اٹھا کر اونچی آواز میں کہا۔“ صاحبِ حال جب بھی تمہارے سامنے آئے گا، سلام کرنے سے پہلے مسکرائے گا ضرور! تم زندگی میں پہلی مرتبہ اس مسکراہٹ کا نوٹس لو گے۔ تمہیں یوں لگے گا۔ جیسے پہلے کی سب چیزیں فنا ہو چکی ہیں۔ ہر شے سمار ہو گئی ہے اور ایک نئی دُنیا جنم لے رہی ہے۔ ایک دوسری دُنیا۔ نئی خوشبو اور نئے رنگ کی دُنیا۔ ایسی دُنیا جسے سمجھنے کے لیے ایک گرو، ایک ہادی، ایک صاحبِ مال کی ضرورت ہے۔ اس قدر ضرورت۔۔۔ اور چونکہ سارے معاملات ضرورت بندھے ہیں

اوسچ !
 جگواوسچ !
 ہے جی اوسچ !
 نامک ہونی جی اوسچ !

اس لیے ہڑاہ تار یک ہے۔ جہاں ضرورت ہے وہاں اندھیرا ہے۔ جہاں احتیاج ہے وہاں اندھیرا ہے اور جہاں تاریکی ہے وہاں اگنی نہیں اور جب اگنی نہیں، تو صورتِ مالِ افح نہیں اور جب کوئی صورت نہیں تو مال کیا ہونا ہے اور جب مال نہیں، تو صاحبِ مال کہاں سے ہو۔ صاحبِ مال نہ ہو تو اس سے ملاقات کس طرح سے ہو؟

پھر منقے نے بڑے تلخ لہجے میں کہا:

”خبردار! جو تم میں سے کسی نے صاحبِ مال کو بزدل کہا یا صاحبِ کرامت، صاحبِ نظر، پیر، اولیا کہا... خبردار!“

پھر بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی اور ہم سب کو اپنے درمیان کی صاحبِ مال کی موجودگی کا یقین ہو گیا۔ ایک دوسرے کے چہروں کو جانچ کر اور اُس کے اندر کی گہرائیوں کو دیکھ کر ہم کو ایک اندازہ سا ہونے لگا تھا کہ ”وہ“ ہم میں سے کون ہے۔ ایک عجیب طرح کا کرب ہمارے درمیان پھیلا ہوا تھا جیسے دروازہ شروع ہونے سے پہلے خوفزدہ لڑکی آڑی چار پائی پر لیٹ گئی ہو اور اُس کی پتیلیاں پھیل گئی ہوں۔

ہم سب بے حس و حرکت خالی خالی زمین پر بیٹھے تھے اور ہمارے سامنے چھ سات قدم کے فاصلے پر کوہستانی ایک پتھر سے ٹیک لگائے جنگلی جھاڑیوں کے پتوں سے پٹانے چلا رہا تھا۔ وہ جھاڑی سے ایک پتہ نوجا، اُس کو اپنے بائیں ہاتھ کی کھڑی موٹھ پر کھ کراؤ پر سے زور سے دوسرے ہاتھ کا دھپا مارتا۔ پٹانے سے پتہ ٹوٹتا اور کھڑی ٹٹھی کے پاس سے لگ کی چھوٹی سی آواز نکلتی۔ کوہستانی خوش ہوتا اور پھر ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ ہماری طرف دیکھتا۔

ہم سب ایک دوسرے کے اندر بہت گہرے اتر کر ایک دوسرے کے اندھیروں میں یہ تلاش کر رہے تھے کہ ہم میں سے صاحبِ حال ہے کون؟ ہے ضرور لیکن پتہ نہیں چلتا۔ اور ہے بھی موجود، لیکن پکڑائی نہیں دے رہا... ڈا ہی نہیں دے رہا... گرفت میں نہیں آ رہا...

لیکن ہے ضرور....

labour pair

بانو قدسیہ

ناول ○ ایک دن ○ پروکس ○ شر بے مثال ○ موم کی گلیاں ○ راجہ گدھ
 افسانے ○ دوسرا دروازہ ○ ناقابل ذکر ○ بازگشت ○ امر میل
 ○ کچھ اور نہیں ○ آتش زیر پا
 ڈرامے ○ آدھی بات ○ دوسرا قدم ○ حوا کے نام ○ سورج مکھی ○ تماثل
 ○ فٹ پاتھ کی گھاس ○ سدرائ
 تاثرات ○ مرد ابریشم (قدرت اللہ شہاب)

اشفاق احمد

افسانے ○ صحنائے افسانے ○ پھلکاری ○ ایک محبت سوانح ○ اچلے پھول ○ سفرینا
 ڈرامے ○ بندگی ○ طوطا کہانی ○ ایک محبت سوڈان ○ اور ڈرامے ○ حیرت کدہ
 ○ ننگے پاؤں ○ ناہلی تھلے ○ اُچے بروج لہوردے
 سفر نامہ ○ سفر و سفر

RS: 225.00

www.sang-e-meel.com

ISBN: 969-35-0823-8

